ات
مال

935
LIBRARY

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

938
LIBRARY

938
LIBRARY

LIBRARY
939
LIBRARY CLERK

DATE LABEL

If the book is not returned by the date last stamped, a fine of 25 paise per day will be charged.

Due Date	Due Date	Due Date	Due Date

938

سات سال

"آہ! وہ میرا بچپن، وہ عظیم شاہراہ جو ہر موسم میں رواں دواں
رہتی ہے، غیر محسوس طور پر سنجیدہ و بہترین جوگیوں سے زیادہ بے نیاز
اور بے پایاں، وہ بے دیار ہونے پر نازاں — کیسا بھولا پن تھا
اور میں اسے سمجھ سکتا ہوں تو اب!"

— ریمبو

سات سال

(ایک ہندوستانی کے بچپن کی کہانی)

ملک راج آنند

ترجمہ

رضیہ سجاد ظہیر

938
COLLEGE

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اُردو بازار

دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنس بلڈنگ

بمبئی ۳

اکتوبر ۱۹۶۲ء

پہلی بار ۱۱۰۰

قیمت

JAMIA ... LTD
Revised Price
Rs. 6/-

(کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی)

938

اپنی ماں کی یاد کے نام۔

MILLI ... COLLEGE

وہ سڑک

"مجھے سڑکوں سے عشق ہے، گلی کوچوں سے پیار ہے، مجھے پیدل چلنے کا بے حد شوق ہے کیونکہ پیدل چلتے ہوئے قدموں کے ساتھ ساتھ خیالات صاف ہوتے جاتے ہیں، انسان اپنے آپ کو زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتا ہے ۔۔۔ پیدل چلنا صرف جسمانی ورزش ہی نہیں جس سے جسم بنتا ہے، یہ ایک روحانی تربیت بھی ہے جس سے ہم اپنے وجود کو قائم رکھ سکتے ہیں۔"

— نامعلوم

سڑک کی روشنی مٹی سنہری دھول کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ ہوا میں ایک جھنجھناہٹ ہے گویا ستار کا تار ٹھنک کر ادھر ادھر اُڑا دیا جاتا ہے۔ آج کے ہرے بھرے درخت یاد ۔۔۔ کی شفقت بھری والی روح کو اپنے سامنے دیکھتے ہی ہرے ہو گئے ہیں۔ اس بستی میں میاں ۔۔۔ کی روح اسی درخت والے کنوئیں میں رہتی ہے۔

ہمارے گھر کے ایک طرف سیدھی سیدھی پارکیں بنی ہیں جن میں سب گھاس اُگی ہے، دوسری طرف بنگلے ہیں، صاحبوں کے بنگلے۔ سنسان اور خاموش۔ جن میں حد درجہ صفائی کی ہوئی ہے اور باغ بھی ہیں۔ میری نگاہوں کو یہ بنگلے بڑے پُراسرار لگتے ہیں جیسے کوئی راز اپنے اندر لیے ہوں، اس راز سے بوجھل ہو گئے ہوں۔

بنگلوں اور پارکوں کے بیچ سے سڑک گزرتی ہے جس پر بڑے بڑے درخت ہیں۔ یہ سڑک ایک اُفق سے دوسرے اُفق تک پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میں اکثر خاموش بیٹھے، دیر تک کھڑا سوچا کرتا ہوں کہ یہ سڑک کہاں سے آتی ہے اور کہاں تک جاتی ہے۔ پھر میں گھر کے پاس باغ کے بیچوں بیچ، ایک صاف کی ہوئی جگہ پر گول گول چکر پھیریاں لینے لگتا ہوں، جیسے مجھ پر کسی کا نشہ سوار ہو گیا ہو، بالکل بھول جاتا ہوں کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے ــــ مجھے تو بس اپنی مرضی سے مطلب! یہ اتنی بڑی دنیا پھیلی پڑی ہے اور میں آزادی سے گھومتا پھرتا ہوں۔

میری یادوں میں یہ سب سے پہلی اور دھندلی یاد ہے جو میرے ذہن میں بالکل صاف ہے۔

میں باغ میں چکر پھیریاں لیتا رہتا ہوں کیونکہ اماں نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ اگر سڑک پر نہ جاؤں تو میرا جہاں جی چاہے باہر کھیلوں۔

اس طرح یہ سڑک زندگی میں پہلا دھچکا بن کر آتی ہے جو سب سے پہلا سبق ہے۔ یہ سڑک جس پر گھوڑے اور گاڑیاں اور آدمی قطار در قطار ہمیشہ چلتے چلے جاتے ہیں۔

اماں مجھے آواز دیتی ہے۔ "یہاں آؤ بیٹا!"

میں اس کی بات نہیں سنتا، چکر پر چکر کاٹے جاتا ہوں، پھر اچانک میں ایک پیڑ کے تنے پر جا گرتا ہوں اور رونے لگتا ہوں۔

ماما آ کے مجھے گود میں اُٹھاتا اور چمکارتا ہے۔ مجھے ہوا میں اُچھالتا ہے اور
اس کی بھری بھری گھنی مونچھوں کے بیچ میں سے چلانے اور پچکارنے کے عجیب عجیب
الفاظ نکلتے جاتے ہیں۔ میں ابھی تک پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہوں۔ اس لیے وہ
مجھے اپنے کندھے پر بٹھا لیتا ہے اور گھوڑے کی طرح قلانچیں بھرتا ہے۔ اس کے جسم کی
اچھال سے اور میرے اس کے سر کو مضبوطی سے پکڑنے کے پیچھے، مجھے بڑا مزہ آتا ہے اور
رونا بند ہو جاتا ہے۔ ویسے تو میں اوپر سے ہنستا ہوا جھوٹ موٹ ڈر سے چلاتا
ہوں۔ "اُترنے دو ماما ۔۔۔ رہنے دو ماما، مجھے" لیکن مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے۔ اور یہی تو بات ہے
کہ جب مجھے واقعی اُتار دیا جاتا ہے اور اپنی ننھی ننھی مضبوط ٹانگوں پر مجھے وہاں کھڑا کیا
جاتا ہے جہاں ماما گھاس کاٹ رہا تھا تو میں پھر اس کے کندھوں پر چڑھنے کی
ضد کرنے لگتا ہوں۔ مگر ویسے ہی ماما اپنے کام میں پھر لگ جاتا ہے اور میں سب کچھ
بھول کر یہ دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں کہ وہ ایک چھوٹی سی تیز چھری لے کے کس طرح گھاس
چھیلتا جاتا ہے اور منھ ہی منھ میں کچھ گنگناتا جاتا ہے۔

"مجھے بھی گانا سناؤ" میں اس سے کہتا ہوں۔

"بھاگ، پاجی ۔۔۔ دیکھ تیری ماں تجھے آوازیں دے رہی ہیں!"

"کہاں ہیں ماں؟" میں اپنے گھر کے دروازے کی طرف نظریں اُٹھاتے ہوئے
کہتا ہوں۔

ماں وہاں نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے ننھے بھائی کو اپنے سینے سے
لگائے، دوپہر کی نیند لے رہی ہیں۔ میں ضد کرنے لگتا ہوں، "ماما گانا سناؤ!"
ماما ہنسنے لگتا ہے اور پھر دھیرے سے گاتا ہے ۔۔۔ گا رے گا رے گا رے اس کا سر

بھرتا جاتا ہے۔ میں بھی بھیڑ سے نکلتا ہوں۔

پھر مجھے سڑک پر سے گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دینے لگتی ہے اور میں اس طرف کو بھٹک جاتا ہوں۔

اونٹوں کی ایک ایسی ہی قطار لگی ہوئی ہے، ایک کی نکیل دوسرے کی دُم سے بندھی ہوئی۔ ان پر بیٹھے ہوئے شتربان جھومتے جاتے ہیں اور اونٹوں کی گردنیں، جو پیانو کی چوٹیوں کی طرح لگتی ہیں، آگے کی طرف بڑھتی جاتی ہیں۔ میں بے اختیار بھیڑ میں سے نکلتا ہوں اور کھڑا کھڑا ان کو گزرتے تکتا رہتا ہوں۔ میرا سارا جسم ان کی گھنٹیوں کی آواز میں ڈوب کر رہ گیا ہے۔ سنسنی سی ہونے لگتی ہے۔ ان کی لمبی لمبی ٹانگوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ یہ کہاں جا رہے ہیں — لیکن ماں نے کہہ رکھا ہے۔ "کرشنا، اس سڑک پر مت جانا"۔

گویا کہیں آتے ہیں — اس طرف سے جدھر میں سنتا ہوں کہ صحرا ہے، دور بائیں طرف دیکھتے جاتے ہیں، سلیوٹ کرتے جاتے ہیں" — پھر ایک چیز اور لگتی ہے — فلاں لباس پہنے ہوئے گورا بنگلے کا ایک آدمی "برو صاحب" بن جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اس بنگلے میں رہتا ہے جو ہمارے گھر کے سامنے ہے، سائیکل پر جاتا وہ جھنڈے سے نکل جاتا ہے۔ اب تو وہ خوفناک شخص نکل گیا، اب اس کے پیچھے جاتے جاتا کیا ڈر — میرے دل میں ایک بات سی اٹھتی ہے کہ یہ سڑک پار کر لوں۔ مڑ کر دیکھتا ہوں، ماں تو آس پاس نہیں ہیں، کنویں اور بگھیا کی طرف بھی تاکتا جاتا ہوں کہ ماں تو نہیں دیکھ رہی ہے، پھر میں سانس روک لیتا ہوں اور دوڑ کے اس سڑک کو پار کر جاتا ہوں — اس حد سے آگے نکل جاتا ہوں جو ابھی میری

آوارہ گردی کی آخری منزل ہوا کرتی تھی!

ایک بار میں نے اس حد کو پار کیا کہ پھر تو باغ کے بھی گئے تھے۔ سبز سبز گچھے جو میری آنکھوں کے سامنے حاضر تھے اور بہت ہی تیزی سے، سانس روک کے میں نے اس بچانی پر حملہ کیا جو مجھے سب سے پہلے دکھائی دی — گلاب کی ایک کلی! — میری اماں کی آواز سے میرا پتہ پانی ہوا جا رہا ہے، شاخوں پہ لگے کانٹے مجھے سوجھ نہیں رہے ہیں، یکایک مجھے انگلیوں میں ایک شدید چبھن محسوس ہوتی ہے لیکن میں پروا نہ کر کے توڑ لیتا ہوں — گلاب کی کلی میرے ہاتھ آ جاتی ہے دشمن لگا رہتا ہے، اب تو نہ مڑ کر اس خاموش سنسان بنگلے کو دیکھتا ہوں، نہ بچوں کی آواز سے جھنجھناتی ہوئی سنہری دھول کے ذروں سے بھری ہوا کو دیکھتا ہوں — بس سرپٹ بھاگتا ہوں، دھڑ میرا، ٹانگوں سے بھی آگے جا رہا ہے — ذہن سے میں نے پھر سرحد پار کی، لیکن پھول ہاتھ میں آ جانے کی بے تحاشا خوشی کے مارے میری ٹانگیں لڑکھڑا جاتی ہیں، ایک دوسرے میں الجھ جاتی ہیں — میں گر پڑتا ہوں۔

میرے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلتی ہے، گرم ریت پر پڑا ہوا میں ڈر کے مارے، رونے لگتا ہوں، دھوپ مجھ پر بڑھتی جاتی ہے اور میں برابر روئے جا رہا ہوں — کوئی ٹوٹے دانتوں میں مٹی سے مزا کرا رہا ہے۔ گالوں پہ پسینہ بہہ رہا ہے، پریشانی کے مارے اور بھی گڑگڑا رہا ہوں — پھر مجھے تھوڑی آہٹ سنائی دیتی ہے۔

یہ ہال ہے!

اٹھئے بابو جی — وہ مجھے ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے۔

میں چیخ کو بھی بند کرتا ہوں جس میں پھول دبا ہوا ہے کیونکہ یہ مالی غضب والے بالکل نہیں پسند کہ کوئی پھول توڑے۔ وہ مجھے گود میں اُٹھا لیتا ہے اور ادھر اُدھر بہلانے لگتا ہے۔ میرے رونے کو بے معنی لوریوں اور الفاظ میں گھو دینے کی کوشش کرتا ہے۔

میری ماں، جنھوں نے میری پکار سن لی تھی، دروازے پر آتی ہیں: "للے یہ کہاں تھا؟"

"کھیلتے میں گر پڑے تھے:" مالی جواب دیتا ہے۔

"ہیا! — اس گندی کیاری میں! اسے سڑک پر چلا گیا تھا کیا؟ —" وہ گھبرا کر کہتی ہیں۔

میں ابھی تک رونے جا رہا ہوں!

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، دیکھ تو نے چیخ تو ماردی!"

"ارے بیٹے آنکھیں تو دکھا!" ماں کہتی ہیں اور مجھے گود میں لے لیتی ہیں۔ ان کے چہرے اور گردن سے ایک میٹھی سی مہک آتی ہے، جیسے شکر ملا ہوا دودھ۔ وہ میرا گنگنا چومتی ہیں اور کہتی ہیں: "اب اچھا ہو جائے گا، اچھا ہو جائے گا نا"۔ مجھے پر تھوڑی کے پاس بستر پر لٹا دیتی ہیں اور خود بھی کر پاس لیٹ کر مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیتی ہیں۔

اب میں رو نہیں رہا ہوں، صرف سسکتا رہا ہوں۔ جلدی ہی نیند، تھکن کی نیند، دبے پاؤں میری آنکھوں میں گھس آتی ہے۔

جب تیسرے پہر اپنے ابا جی کی گود میں میری آنکھ کھلتی ہے، تو گلاب

کی کئی ابھی تک میری شخصیت میں رچی ہے اور کانوں سے لگی خواہشیں خود اپنی کہانی
کہہ دیتی ہیں۔

۲

"کہاں گیا تھا اتنے سے بابی؟ کہاں گیا تھا؟ ہیں؟" وہ گنگناتی آواز میں
پوچھتے ہیں۔

انھوں نے میرے چہرے پر پیار کی جھاڑو پھیری شروع کر دی اور میں نے
ان کی بڑی سی گھنی مونچھیں پکڑنے کی کوشش کی۔

پھر مجھے میرے ذہن میں اپنے ابی کی شخصیت کی سب سے صاف اور گہری یاد
ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میرے لیے پیار مونچھ ابی کا وجود تھی۔ ہم لوگ کچی پکی
دیواروں والے جس کوارٹر میں رہتے تھے اس کے کسی کونے میں بھی سے پھر کر گھس
بابی منہ دھوتے تو مجھے ان کی مونچھوں سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں ضرور نظر آجاتیں۔
ان کی شخصیت میں اور جو بھی رہا ہو لیکن بچے تو ان کے منہ پر اگے ہوئے یہ گھنے بالوں
کے گچھے ہی سب سے زیادہ دلکش لگتے تھے۔ ابا ان سے بھی زیادہ جو کوئی چیز
پسند تھی تو وہ ان کی بھاری آواز تھی جس میں بڑی گرمجوشی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں ابھی
آتے بھی نہ تھے کہ ان کی آواز آنے لگتی تھی، سڑک پر سے گزرنے والے سپاہیوں
کی علیک سلیک کا جواب دیتے ہوئے، یا ان کے سلام کا — یا پھر اپنے دوستوں
سے ہنسی مذاق کرتے ہوئے یا میرے دونوں بڑے بھائیوں، فرشی اور گنیش پر چیختے
ہوئے جو رجمنٹ کے بینڈ اور بگل بجانے والے لڑکوں کے ساتھ کھوئے پھرتے

کھیلتے ہوتے۔ اس گروہ میں سپاہیوں کے، بہشتیوں اور دھوبیوں کے لڑکے بھی شامل تھے۔

میں باجی کی آواز سننے کے ساتھ ہی فوراً دروازے کی طرف بھاگتا اور وہ مجھے جھٹ گود میں اٹھا لیتے، اپنی چبھتی ہوئی مونچھوں سے مجھے پیار کرتے ساتھ ہی ساتھ میرا پیار کا نام "بُلی" پکارتے جاتے اور مختلف قسم کے پیار بھرے مذاقیہ انداز میں کہتے جاتے، گانا سا گاتے جاتے۔

"بُلی —— او بُلی —— او بُلی —— میرا بیٹا
"بُلی —— میرا کتا —— بُلی —— میرا سونا
"بُلی —— میرا ننھا سا بیٹا، بیٹا، بیٹا"

اس طرح میں سب کے لیے میرے ماں باپ کے دل میں لاڈ اُمنڈتا، میری شرارت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر میری طرف داری کرنی پڑتی تھی، اور جب میں نہایت گستاخی کے ساتھ ان کی مونچھیں پکڑ کے کھینچ لیتا تب تو وہ خاص طور پر میرا پچکارا کرتے۔

اس وقت میری عمر چار، پانچ سال کی رہی ہوگی لیکن اسی عمر سے میرے باجی میرے لیے ایک روایتی ہیرو کے مانند تھے —— راجہ وکرم جیت کے بارے میں اماں کہانیاں سنایا کرتی تھیں —— یا ارجن جو سری کرشن جی کے چہیتے بھی تھے اور دوست بھی، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بانس پر گھومتی ہوئی مچھلی کی آنکھ کا عکس انھوں نے تیل میں دیکھ کر جو تیر چلایا تو وہ سیدھا اس کی آنکھ میں جا لگا۔

مجھے اپنے باجی میں جگ جیتنے والے یہ تمام خوبیاں نظر آتی تھیں اور ان کے

علاوہ وظیفہ یادوں خوبیاں بھی۔ ڈوگرہ پہاڑی لوگوں کی اس رجمنٹ میں وہی ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ لوگ ان سے اپنے خط پڑھواتے اور اپنی درخواستیں لکھواتے تھے۔ یہاں تک کہ کنٹونمنٹ کے مہتر، دھوبی اور بینڈ بجانے والے جب کسی مصیبت میں پھنستے تو بابجی ہی سے قرض مانگتے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر ان کو سلام کیا جاتا۔ "پالاگن" جیسے ان رشتے داروں کی طرف سے جو لاہور یا جالندھر، امرتسر یا پنجاب کے اور علاقوں سے آتے ــــ اور شخصیتوں کا کام کرتے یا نادوں کا۔

جب اماں گھر کے صحن میں بیٹھی چرخہ چلاتی ہوتیں۔ بابجی تپائی پر پاؤں لٹکائے آرام کرسی پر بیٹھے ہوتے ــــ لوگ اپنی شکایتیں پیش کرتے یا خبریں سناتے، تو میں بھی ادھر ادھر سے اُڑتی اُڑتی، چپکے چپکے سنا کرتا، اور اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ بابجی کی زندگی واقعات سے بھری ہوئی، رنگا رنگ زندگی تھی۔

۱۸۸۰ء میں ڈوگرہ رجمنٹ میں ہیڈ کلرک تھے۔ رجمنٹ کی ٹیم ہاکی کے جتنے میچ کھیلتی تھی ان میں وہ ریفری ہوا کرتے تھے اور ایک خاص قسم کی سیٹی وہ اس وقت بجایا کرتے تھے۔ یہ سیٹی میرے بابجی کی لکھنے کی میز کے نیچے خانے میں چھپی رہتی تھی اور اگر کبھی میرے ہاتھ لگ جاتی تھی تو میں اسے زور سے اماں کے کان میں بجا دیتا تھا۔ تمام عورتیں اور مرد میرے بابجی کو دیکھ کر کہتے "افوہ" کیونکہ انھوں نے بہت نیچے سے ترقی کی تھی اور اب تو انھیں بہت عزت اور طاقت حاصل تھی۔

اماں کنٹونمنٹ کی عورتوں سے گپ شپ کرتیں یا برادری کے جو لوگ ان سے ملنے آتے تو بات چیت کے دوران مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میرے بابجی کسی مسلمان پیر کا مرید تھے۔ میرے دادا دادی نے ان پیر صاحب سے اولاد مانگی تھی۔ ان پیر صاحب

نے فرمایا کہ "اگر تم ایک کنواں کھدوا دو اور ایک باغ لگوا دو جہاں میں ٹھہر کر عبادت کر سکوں اور رہ سکوں اور اپنی بیوی سمیت وہاں آیا کرو تو میں تم کو دو بچے عطا کر دوں گا۔"

چنانچہ میرے دادا نے جن کا نام جیت رام تھا — اور یہ نام ہماری ٹھکیار پریوار کی عورتیں بہت رٹ رٹ کے لیا کرتی تھیں — وہی کیا جو پیر صاحب کی خواہش تھی۔ اور اگلے سال جب میری دادی ایک دن کنوئیں پر گئیں تو انھوں نے دیکھا کہ کنوئیں کی جگت پر ایک مٹی کے برتن میں میرے بابو جی پڑے ہوئے ہیں، اور پھر اگلے سال، جبکہ پیر صاحب مر چکے تھے، ان کی قبر کے پاس ایک گڑھے میں میرے چچا ملے!

میرے بابو جی کا نام رام چند اور چچا کا نام پرتاپ چند رکھا گیا۔ میرے باپ کے ملنے کے بعد میرے دادا دادی کے گھر میں بڑی برکت ہوئی، اس سال خوب دولت ملی لیکن چچا کا آنا منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال میرے دادا کا انتقال ہو گیا۔

مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ موت اور زندگی کے کیا معنی ہیں، صرف یہ معلوم تھا کہ جنات کوئی چیز ہوتے ہیں جیسے کہ وہ فقیر صاحب تھے۔ جن کی روح اس کنوئیں میں رہتی تھی جو میرے دادا نے امرتسر کے باہر جھنڈیالہ روڈ پر بنایا تھا۔ اور خواجہ خضر کی روح کا کچھ تصور تھا — سفید کپڑے پہنے ہوئے، سبز عمامہ باندھے ہوئے، لمبی برف جیسی سفید داڑھی۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کی روح جامن والے کنوئیں میں رہتی تھی — یا پھر بے شمار گوروں اور سپاہیوں کی روحیں جو کنٹونمنٹ ہی میں جا بجا دفن تھے۔

گھر میں جو گھٹنیں اور مامائیں آتی رہتی تھیں ان سے میرے بابو جی کے متعلق طرح طرح کی روایتیں اور کہانیاں مشہور تھیں۔ تکیے، بچھونے، مجرے، تعویذ اور فقیر لیپڑ

کا تصور ان سب پر چھایا ہوا تھا۔ بس صرف ان کی موت ہی ایک ایسی چیز تھی جو میرے ذہن میں ان کو ہر روز سے الگ کوئی چیز سمجھا سکتی تھی۔ انھوں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا تھا اور جتنی جد وجہد کی تھی وہ سات آٹھ سال کی عمر سے پہلے میرے لیے نہیں آ سکتی تھی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ چار، پانچ سال کی عمر تک میرے ذہن میں لوگوں کا تصور کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آتا تھا۔ کبھی سر، کبھی پاؤں، کبھی دھڑ اور ان ٹکڑوں کے ساتھ ٹکڑوں کی بات چیت کے حصے ۔۔۔ پھر پانچ سال کے بعد یہ سب چیزیں مل جل کر مکمل صورتیں بننے لگیں اور مجھے یاد ہے کہ اس عمر کے بعد سے اس دنیا کے بارے میں کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ ۔۔۔ ماضی اور حال ۔۔۔ مجھے کچھ مکمل صورت میں نظر آنے لگا۔

۳

اس زمانے میں جن انسانوں کو میں نے جانا، جن سے میں قریب ہوا، ان میں میرے سب سے بڑے بھائی ہرش، پھر منجھلا گنیش اور پھر میرا ننھا بھتیجا پتھو جی تھا۔

پتھو جی کے متعلق سب سے پہلی یاد یہ ہے کہ وہ پیلا پیلا تھا۔ مگر ڈرا سو گیا، اور ہمیشہ ماں کے ایک کھٹولے پر پڑا رہتا تھا۔ اماں ایک پنکھیا تو میں نے اس پر سے مکھیاں جھلا کرتی تھیں۔ اس کے دُبلے سوکھے چہرے اور ڈھانچوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں سے مجھ کو بہت ڈر لگتا تھا۔ کیونکہ سوتے میں بھی اس کی آنکھیں ادھ کھلی رہتی تھیں۔ مجھے اس کے مرجھائے جھریاں پڑے چہرے سے نفرت تھی کیونکہ

نے فرمایا کہ "اگر تم ایک کنواں کھدوا دو اور ایک باغ لگوا دو جہاں میں ٹھہر کر عبادت کر سکوں اور روزانہ اپنی بیوی سمیت وہاں آیا کرو تو میں تم کو دو بچے عطا کر دوں گا"۔

چنانچہ میرے دادا نے جن کا نام ہیت رام تھا — اور یہ نام ہماری ٹھیکیدار برادری کی عورتیں بہت رک رک کے لیا کرتی تھیں — وہی کیا جو پیر صاحب کی خواہش تھی۔ اور اگلے سال جب میری دادی ایک دن کنوئیں پر گئیں تو انھوں نے دیکھا کہ کنوئیں کی جگت پر ایک مٹی کے برتن میں میرے بابا جی پڑے ہوئے ہیں، اور پھر اگلے سال، جبکہ پیر صاحب مر چکے تھے، ان کی قبر کے پاس ایک گڑھے میں میرے چچا ملے۔

میرے بابا جی کا نام رام چند اور چچا کا نام پرتاپ چند رکھا گیا۔ میرے باپ کے ملنے کے بعد میرے دادا دادی کے گھر میں بڑی برکت ہوئی۔ اس سال خوب دولت ملی، لیکن چچا کا آنا نحوس ثابت ہوا۔ اسی سال میرے دادا کا انتقال ہو گیا۔

مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ موت اور زندگی کے کیا معنی ہیں۔ صرف یہ معلوم تھا کہ جنات کوئی چیز ہوتے ہیں جیسے کہ وہ فقیر صاحب تھے، جن کی روح اس کنوئیں میں رہتی تھی جو میرے دادا نے امرتسر کے باہر جھنڈیالہ روڈ پر بنایا تھا۔ امیر خواجہ خضر کی روح کا کچھ تصور تھا — سفید کپڑے پہنے ہوئے، سبز عمامہ باندھے ہوئے، لمبی لمبی برف جیسی سفید داڑھی۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کی روح چاہ میانی والے کنوئیں میں رہتی تھی — پھر بے شمار گوروں اور سادھوؤں کی، جن میں جوگی رشی بھی ہیں جا بجا مدفون تھے۔

گھر میں جو کتابیں اور ساکھیاں پڑھی جاتی تھیں ان میں میرے بابا جی کے متعلق طرح طرح کی روایتیں اور کہانیاں مشہور تھیں۔ لچھمن جتی، بھیروں اور فقیر لیوڑا

کا تصور ان سب پر چھایا ہوا تھا۔ بس صرف ان کی مونچھ ایک ایسی چیز تھی جو میرے ذہن میں ان کو دوسروں سے الگ کوئی چیز بنا سکتی تھی۔ انھوں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا تھا اور جتنی سنجیدگی تھی وہ سات آٹھ سال کی عمر کے بچے میرے لیے نہیں اُڑ سکتی تھی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ پانچ سال کی عمر تک میرے ذہن میں لوگوں کا تصور کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر آتا تھا۔ کبھی سر کبھی پاؤں، کبھی دھڑ اور ان ٹکڑوں کے ساتھ ان کی بات چیت کے حصے ـــــ پھر پانچ سال کے بعد یہ سب چیزیں مل جل کر مکمل صورتیں بننے لگیں اور مجھے یاد ہے کہ اس عمر کے بعد سے اس دنیا کے باشندے میری کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔ یہاں کی تاریخ اور جغرافیہ ـــــ ماضی اور حال ـــــ مجھے کچھ مکمل صورت میں نظر آنے لگا۔

۳

اس زمانے میں جن انسانوں کو میں نے جانا، جن سے میں قریب ہوا، ان میں میرے سب سے بڑے بھائی ہرشی، پھر منجھلا گنیش اور پھر میرا اکیلا بھتیجا پتھوری تھا۔

پتھوری کے متعلق سب سے پرانی یادیں یہ ہیں کہ وہ پیلا پیلا تھا، سکڑا ہوا سا اور ہمیشہ ماں کے ایک کھٹولے پر پڑا رہتا تھا۔ ماں ایک پنکھیا لاتیں تو میں اس پر سے مکھیاں جھلا کرتی تھیں۔ اس کے دُبلے پتلے چہرے اور گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں سے مجھ کو بہت ڈر لگتا تھا۔ کیونکہ سوتے میں بھی اس کی آنکھیں ادھ کھلی رہتی تھیں۔ مجھے اس کے مرجھائے ہوئے بڑے چہرے سے نفرت تھی کیونکہ

کسی بڑے بچوں کا سا لگتا تھا۔ مجھے یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ وہ ہر وقت سویا کرتا تھا البتہ مجھ سے یہ ہر وقت کہا جاتا تھا کہ شور نہ مچاؤں ورنہ وہ پریشان ہوگا، جاگ پڑے گا، وغیرہ۔ کبھی کبھی اماں کا دودھ پیتے وقت وہ اپنی آنکھیں کھولتا اور مجھے گھورتا جیسے کہہ رہا ہو "خبردار — جو تم نے میری اماں کی چھاتیوں کو ہاتھ لگایا!"

زیادہ تر تو میں اس کی عجیب نگاہوں سے ہی اتنا ڈر جاتا کہ قریب جانے کی ہمت نہ پڑتی — لیکن کبھی کبھار جب وہ آنکھیں بند کیے اماں کی ایک چھاتی چوستا ہوتا تو میں دوسری چھاتی میں لگ جاتا۔ پھر وہ جاگ پڑتا، ہاتھ پیر مار کے مجھے گھسوٹتا اور بھگانے کی کوشش کرتا۔ میں ضد پہ اڑ جاتا، چالاکی سے اماں کی بغل میں گھس جاتا اور برابر دودھ پیے جاتا یہاں تک کہ وہ تھوڑی دیر زور زور سے چیختا اور مجھے تکلیف ہونے لگتی تو ذرا دیر کو الگ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد اپنی تکلیف بھول کر پھر حملہ کرتا —

ہم دونوں اس طرح زبردستی چمٹتے تو اماں بڑی عاجز ہو جاتیں اور انھوں نے پھر اپنی چھاتیوں پر مرچ لگانی شروع کر دی تاکہ ہم دونوں ان کا پیچھا چھوڑ دیں۔ لیکن اس سے بھی ہم نے ان کی جان نہیں چھوڑی تھی — مجھے یاد ہے کہ میری اس عادت کو چھڑانے کے لیے انھوں نے آگے چل کر بڑے سخت طریقے اختیار کیے۔

ایک طرف اپنے بھائی پر قدرتی طور سے مجھے غصہ تھا۔ حسد اور نفرت تھی تو بڑے بھائی آنگنیش کی طرف حسد کا، خاص حسد اور جلن کا درد تھا۔ میں بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اماں کے قریب بھی آئے۔ اور جیسے ہی وہ بھی آتے میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچ جاتا کہ اماں مجھے گود میں اٹھا لیں، جو کیا ہی

اور اماں دونوں ہی میری طرفداری کرتے تھے اس لیے میرا خیال ہے کہ گنیش کو میری ٹھیکیداری کا احساس تھا۔ وہ یا تو کمرے کا کونا تھام لیتا، یا پھر پاس ہی کے بچوں سے کھیلنے باہر بھاگ جاتا۔

گنیش سیدھا اور خاموش طبیعت تھا۔ اماں اور پاپا جی کچھ کہتے تو وہ پریشان نہیں ہوتا تھا۔ اگر اس کی طرف سے لاپرواہی برتی جاتی تو وہ برداشت کر جاتا تھا۔ اس کے جذبات اس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ اور میرے لئے کچھ سا سنگ دل چہرہ گویا ایک خلوت کی طرح تھا۔ آگے چل کر اس کی صحت پر ایک ایسی گہری سی چھاپ تھی جو دراصل دھوکا تھی ۔۔۔ اوپر سے یہ نکلا کرتی جاتا ہے اور اندر شعلہ یا طبیعت کی آتش چپکی چھپی رہتی ۔۔۔ اس کے کانوں کی لویں بڑی بڑی تھیں اور یہ روایت مشہور تھی کہ وہ ایک سادھو کی دعا سے پیدا ہوا تھا اور بھیک مانگے آیا تھا۔ اس کے کانوں پر خشک گری والے اور اس کے عجیب و غریب کان لئے میری نظروں کے سامنے ایک شیطان کی طرح پیش کرتے تھے۔ چونکہ وہ اکثر مجھے چھوڑ کر پڑوسی لڑکوں سے کھیلنے باہر چلا جاتا تھا اس لیے میں ہر وقت موقع ڈھونڈتا رہتا تھا کہ اس کی شکایت کروں تاکہ پاپا جی اسے ڈانٹیں یا ماریں ۔۔۔ اور اس طرح میں اس سے اپنا بدلہ نکالتا تھا۔

مجھے اس کے چہرے پر پڑے ہوئے تیل اور میلے پن کے علاوہ بھی نفرت تھی کیونکہ ہر شخص ہی اس سے دھوکا کھا کر بہت تعریف کیا کرتا تھا جبکہ میں بیٹا ہی کیوں تھا۔ صرف ایک اعلیٰ صاحب تھے جن کو صحیح احساس تھا کیونکہ وہ میرے ماموں جی کے دوست تھے میں گنیش کو برے ذائقوں اور بیچاری کو بھی لگتے تھے کیونکہ

دو اشنا ذرا سا تھا۔ مجھے اس بات سے بڑی نفرت محسوس ہوتی تھی کہ ہمارے ہی گاؤں کا کوئی بھی آ کر ترگنیش کی شادی کی بات چیت لاتا۔ مٹھائیاں اور میوے آتے جو وہ اکیلا ہی چٹ کرتا۔ ہم لوگ اس کی خوشامد میں کیا کرتے کہ "مجھے کچھ دے دو" یعنی ان مزیدار چیزوں میں سے کچھ ہم کو بھی مل جائے جو اس ایک بڑے سے کٹوری کے صندوق میں بند رکھا کرتا تھیں۔ اس کے علاوہ ترگنیش نے گھر کی پالتو بلی کا بچہ ٹھیکے لے لیا تھا۔ مجھے کبھی اس کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتا اور چونکہ وہ بڑی کامیابی سے اپنی جاتا ماں کے خلاف میں اپنی چالاکی چھپا سکتا تھا اس لیے مجھے اس سے سخت نفرت تھی۔

اپنے سب سے بڑے بھائی ہریش کی طرف میں پرستش کا رویہ رکھتا تھا کیونکہ ہریش لمبا تڑنگا تھا اور شام کو اپنے دبے کے گھوڑے پر سوار ہو کر جب گھر آتا تو میرے لیے پھل مٹھائیاں اور کھلونے لاتا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے وعدہ کرتا رہتا کہ مجھے اپنے اسکول لے جائے گا، وہاں کا میچ دکھائے، سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھائے گا!

کبھی کبھار وہ سپاہیوں کے بچوں کو پیٹتا بھی تھا جو زمین میں گچی کھود کر گولیاں کھیلتے ۔۔ ایسے موقعوں پر مجھے [illegible] کے ہاتھوں کی طاقت اور پھرتی پر رشک آتا۔ گیند بلے میں اس کی مہارت پر میں عش عش کرتا اور پھر اسے بائیسکل کے بھی بہت سے کرتب آتے تھے۔ آدھے آدھے گھنٹے تک وہ بائیسکل کو ایک ہی حالت پر روکے رکھتا! پھر جب وہ رجمنٹ کی ٹیم میں ہاکی کھیلا تو اس نے ایک نہایت ہی شاندار مظاہرہ [illegible] قمیص پہنی اور نیلا نیکر پہنا۔ رجمنٹ کی وردی میں جب ملبوس

کی دوکان پر اس نے مجھ کو مٹھائیاں کھلوائیں اور دودھ پلایا تب تو میں بالکل اس پر فدا ہو گیا! مجھے یاد ہے کہ ایک بار بابا نے اس کو کرکٹ کے اسٹمپ سے مارا تھا۔ کیوں کہ وہ ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا اور جنگلیوں کے لونڈوں میں کھیلتا پھرتا ہے، نہ سبق یاد کرتا ہے نہ گھر پر کرنے والا کام کرتا ہے۔ اس دن میں اس کی ہمدردی میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا!

بہرحال چونکہ وہ شہر میں خالہ آگی کے ساتھ رہتا تھا تاکہ اسکول سے قریب ہے اس لیے وہ کبھی کبھار ہی ہم لوگوں سے ملنے آتا تھا لہذا میری اس کی گہری دوستی نہ ہو سکی۔ عمر کا فرق بھی کافی تھا اس لیے ہم الگ ہی رہے اور میں بھی اُس کو دور ہی سے چاہتا رہا۔ ویسے یہ بات یقینی ہے کہ بچپن میں اگر میرے لیے بابا کے بعد کوئی ہیرو تھا تو وہ ہرشی ہی تھا!

۴

خالہ آگی میری ماں کی سب سے چھوٹی بہن تھیں لیکن دونوں کی صورتوں میں اتنا فرق تھا کہ بہنیں بالکل نہ لگتی تھیں۔ اماں کا رنگ سانولا تھا، چہرہ بیضاوی تھا، آنکھیں گہری بھوری چمکدار، منہ چھوٹا ٹھوڑی سی۔ اور خالہ آگی کا چہرہ گول، چاند سا، گورا، تر و تازہ، موٹی موٹی سی آنکھیں، خاموش لب! اور صرف یہی نہیں کہ وہ صورت میں الگ تھیں بلکہ دونوں میں خوشبو بھی الگ الگ قسم کی آتی تھی۔ اس وقت میں لوگوں کو بہت ہی فطری طریقے سے پہچانتا اور ان میں امتیاز کرتا تھا یعنی سونگھ کر! اماں تو جیسا میں نے پہلے بھی کہا ہے دودھ اور شکر کی طرح مہکتی تھیں، لیکن

خالہ اگّی دہری کا مجسمہ معلوم ہوتی تھیں۔

میں خالہ اگّی سے پہلی بار ملا تو مجھ پر یہ ردِ عمل ہوا کہ شرما کر الگ ہو جاؤں، پیچھے ہٹ جاؤں، اور مجھے یاد ہے کہ میں حیران تعجب سے انگلی منہ میں دیے ان کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھی اماں سے اپنا دکھڑا رو رہی تھیں۔ ان کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے ان سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ ان کے شوہر نے بے تحاشہ پھر شراب پی تھی اور انھیں مار کوٹ کے گھر سے نکال دیا تھا۔ اور وہ شب سے آتی دوڑ سے، پیدل چلتی ہوئی، ہمارے گھر پہنچ آئی تھیں۔ اور یہ کہ میرے ابا کسی کلرک کو دو پہیہ دینے پر تیار ہو گئے ہیں کہ وہ واپس جا کر اپنا گھر الگ کر لیں۔

جب وہ بات کر رہی تھیں تو مجھے ان کی آواز ایسی لگی جیسے سڑک پہ لگے ہوئے نیم کے درختوں کی، وہ ٹھنڈی اور افسردہ ہوا جس کے جھونکے سہ پہر کو چلا کرتے تھے۔ جیسے کنٹونمنٹ کے نیچے والے میدانوں سے آہوں اور سسکیوں کا وہ سلسلہ جس سے انسانوں کے بھاری بوجھ تلے نیند میں جو رو رو اٹھتے تھے؛ پھر ان کا مسلسل لہجہ یکایک ٹوٹ سا گیا جیسے کوئی پرندہ گولی سے گھائل ہو چکا ہو — بات کرتے کرتے بیچ بیچ میں ان کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے۔ ذرا دیر بعد میری اماں کی انگلیوں سے وہ رولی کا ڈبہ گر پڑا، وہ رو رہی تھیں اور وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اب مجھے اپنی آنکھوں میں بھی جلن محسوس ہونے لگی، ایک عجیب حسرت کی اداس خاموشی فضا پر چھا گئی۔ اماں چپکے سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ میں ان کی طرف بڑھا کیونکہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔

"او ہو، میرا ننھا بلی کدھر چلا؟" خالہ اگّی نے کہا اور لپک کر مجھے اماں کے

پاس پہنچنے سے پہلے ہی اپنی گود میں جھپٹ لیا۔

گود میں لے کر وہ مجھے پیار کرنے اور چومنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ گنگناتی جاتیں: "اے بلی — میرا بیٹا، بلی میرا اشتاق، بلی میرا ستودہ، بلی میرا بیٹا، میرا بیٹا، میرا بیٹا؟"

اور اب میرے نتھنوں میں ایک عجیب طرح کی خوشبو سما گئی۔ جیسے دہی میں دیسی شکر ملا دی گئی ہو جو اماں مجھے سہ پہر کے وقت پاس۔ دہی کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ خالہ اتی مجھے چومنے کے لیے جھکیں تو مجھے ان کی بغلوں سے کھٹی کھٹی مہک آئی اور میں اپنے آپ کو ان کی گرفت سے چھڑانے کے لیے مچلنے لگا۔ لیکن انھوں نے مجھے اپنی چھاتیوں میں دبا لیا۔ اور میرا ذہن ایک لطیف اور بھرپور جوان جسم کے احساس سے بھر گیا جس میں ملائی کے ان لڈوؤں کی سی خوشبو تھی جو سپاہی کبھی احسان کے بدلے میں یا سوغاتی ڈالی کے طور پر ہمارے گھر لایا کرتے تھے۔

اس واقعے کے بعد برسوں تک خالہ اتی مجھے بہت حسین نظر آیا کرتیں۔ خوب نرم گرم اور بڑی آسودگی بخشنے والی اور بھرپور کتنی دوشیزہ بھی تو تھیں وہ — اکثر اپنے دوپٹے کا گوشہ کھول کر وہ مجھے ایک روپیہ دیتیں — چاندی کا چمکتا ہوا روپیہ! حالانکہ یہ میں بھی جانتا تھا کہ جب وہ میری اماں سے پیسے مانگنے آیا کرتی تھیں تو ظاہر ہے کہ وہ خستہ حال ہی ہوں گی۔ مجھے بہت بھرے ناموں سے پکارا کرتی ہوئی ان کی آواز مجھے کس قدر چمکدار اور سنہری لگتی تھی — میں ان سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا کیونکہ دراصل راز یہ تھا کہ جس دن سے انھوں نے مجھے گود میں اٹھایا تھا میرے وجود میں ان کے لیے ایک جنسی کشش سی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ میری اماں جب اُن کی

جتنی بھی برائی کرتیں، میرا رویہ ان کی طرف سے نہیں بدلا — ان تمام باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا کہ وہ ایک بدبخت عقل گندی عورت تھیں، ایک گھٹیا افسر کی بیوی جو شرابی بھی تھا اور یہ کہ انھوں نے "جادو" سے ہریش کا دل موہ لیا تھا اور اس پر غالباً ٹونا ٹوٹکا کر دیا تھا۔

ایک بار جب میرا بڑا بھائی ہریش مجھے سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر ان کے گھر لے گیا تو مجھے ڈر بھی لگا تھا کیونکہ ہم لوگ جب پتلی سی اندھیری ڈیوڑھی سے اندر گئے تو ایک بڑی سی کالی بھینس راستے میں بیٹھی تھی۔ زینہ بالکل تاریک تھا اور ٹیڑھا میڑھا، ٹوٹا پھوٹا، چاروں طرف پیشاب اور خون کی بو تھی — میری اماں کے خیال میں یہ چیزیں ٹونے ٹوٹکے کے سلسلے میں استعمال ہوتی تھیں، جس کے ذریعے خالہ جی نے میرے بھائی کو قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے مجھے اور ہریش کو مٹھائی کھلائی، شربت پلایا تو میرا سب ڈر ختم ہو گیا — اور پھر میں ہمیشہ ان کے گھر جانے کی خواہش کرتا اور ضد کرتا۔

مجھے تو ان کا شرابی شوہر بھی اچھا لگا۔ وہ گورے رنگ کا، شریف شکل و صورت کا عجیب سا آدمی تھا — فیاض طبیعت، جس کے ہاتھ اکثر دھوتی کی انٹی کھول کر مجھ کو اور ہریش کو چاندی کے سکے دیا کرتے تھے؛ بازار کی گلی میں ایک بیٹھک سی دکان پر وہ لکڑی کے تخت پر بیٹھا ٹین کے برتنوں کو پیٹ پیٹ کر ٹھیک کیا کرتا اور ان کے شور و غل سے بھی بلند وہ گندی گندی گالیاں ہوتیں، جو اس کے منہ سے باہر نکلتی رہتی تھیں — لیکن اس کی صورت پر ایک عجیب معصومیت رہتی — مجھے وہ ایک دم بھایا کیونکہ اس کی آزاد زندگی بڑی دلکش تھی اور ان رنگوں کا ماحول

کمزور فرشتے کے اس شاندار مکان کے مقابلے میں بالکل فطری اور خودرو تھا۔ کمزور فرشتے کے ماحول میں نہ دھات پر گرتے ہوئے ہتھوڑوں کی دھنا دھن تھی نہ پچھلی رات کو پی ہوئی شراب کے اثرات سے پیدا ہونے والے قہقہے اور جھگڑے تھے، نہ دیا تھا دوام خموش!

پھر میری فلاں اور اس شرابی شخص بے تکلف ڈرائیور جیت سنگھ میرا دوست بن گیا تھا کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ پتنگ اڑائی — اس نے بے پناہ پتنگ خرید کے دی، مجھے اپنے گھر کے کوٹھے پر لے گیا اور اسے آسمان پر کھلا کے ڈور میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

جب میں ان تین شاندار اور عجیب انسانوں سے ملتا تو مجھے یوں احساس ہوتا کہ بلندیوں کی طرف پتنگ کی طرح اٹھتا جا رہا ہوں۔

۵

ایک اور ہستی جسے میں نے کافی چھوٹی عمر سے پہچانا اور چاہا وہ گل دیوی تھیں۔ بابو پریم سنگھ کی بیوی جو اے جی کی ایجنسی میں کسی ڈسٹرکٹ کے کلرک تھے۔ وہ ناٹے کد کی نحیف عورت تھیں، سنجیدہ، افسردہ چہرہ، آواز جیسے فاختہ کوک رہی ہو! وہ ہر دوسرے تیسرے ہمارے ہاں آتی تھیں، اپنے ساتھ سلائی، اچار، دری کا کام بھی لاتی تھیں۔ اماں پر تصویر کو گود میں لٹائے پھونک کاتی رہتیں اور گل دیوی اپنا کشیدہ بناتیں یا سلائی کرتیں۔ وہ دونوں سہیلیاں جانے کیا باتیں کیا کرتیں۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ گل دیوی ہی کے متعلق تھیں کہ ان کے یہاں بچہ نہیں

ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں میں دوپہر کو بے حد کوشش کرکے جاگتا رہتا
تھا تاکہ ان دونوں کی باتیں سن سکوں اور یہ معلوم کر سکوں کہ گرودیوی کو کیا غم تھا اور
وہ کیوں ہر وقت اداس رہتی تھیں۔ لیکن میری اماں اور گرودیوی کی مدھم مدھم
بات چیت سے فضا پر ایک نیند کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چرخے کی گھوں گھوں
الگ ہوتی تھی اور پھر برآمدے میں اکثر بھونرے گنگناتے ہوئے گھس آتے تھے۔
میرا سر بوجھل ہونے لگتا، ہاتھ پاؤں میں سستی بھر جاتی اور میں سونے کیلئے کروٹیں
بدلتا، لیکن چونکہ سو نہ پاتا تھا اس لئے گرودیوی مجھے اپنی گود میں لے لیتیں اور
جھکولے لے لے کر لوری کے سروں سے مجھے سُلا دیتیں۔ ان کی گردن پہ سے
بہتے ہوئے پسینے سے میں بھی بھیگ جاتا لیکن ان کی گدگدی بانہوں میں مجھے
آرام سے مجھے نیند آجاتی اور میں اس وقت تک سوتا رہتا جب تک ان کے گھر
جانے کا وقت آجاتا۔ پھر جس طرح وہ ایک لوری گا کر مجھے سلاتیں، اسی طرح
دوسری لوری گا کر مجھے جگاتیں اور میں جاگ پڑتا، ایسا محسوس کرتا کہ میں
پہلے سے زیادہ بڑا ہو گیا ہوں، مضبوط ہو گیا ہوں اور یہ کہ سورج دوسری جانب
اتر چکا ہے اور دھوپ کی جگہ شام کے طرح طرح کے رنگ فضا میں گھل رہے
ہیں۔ اس ننھی سی عمر میں بھی مجھے اس جنسی لذت کا احساس تھا جو گرودیوی کی
آغوش میں حاصل ہوتی تھی — اور پھر ان لمحوں کا لطف جب انسان
دوپہر کی نیند کے بعد اٹھتا ہے اور انگڑائی لے کے شام کی خنکی کا اندازہ کرتا ہے!
کبھی کبھی گرودیوی مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتیں۔ ایک محافظ کی طرح
جو ان سپاہیوں کی بیجا دھینگا مشتیوں یا بدتمیزی کے جملوں اور قہقہوں سے بچا سکے۔

اس پیاروں کے انعام میں، وہ ایک بڑے تجس میں سے مجھے "چیز" کھلاتیں ۔۔۔ یہ تجس بالکل ویسا ہی تھا جیسا بابا کے، ان میں تھا اور اماں اس میں سے ہم لوگوں کو "چیز" کھلاتی تھیں۔ میں بیٹھا ہوا مٹھائی یا سوکھی انجیر یا کھجور کھاتا ہی ہوتا تھا کہ بابو چھتر سنگھ دفتر سے آجاتے۔ وہ مجھے گود میں اٹھا لیتے اور وہی بے معنی گانا گا گا کر مجھے اچھالنے لگتے:

"بِلّی — بلی، بلی — میرا بیٹا!"

بابو چھتر سنگھ سکھ تھے۔ اس لیے ان کے ایک لمبی سی لہراتی ہوئی کالی داڑھی تھی۔ ظاہر ہے کہ بالوں کی یہ جھاڑی مجھے بہت پسند آتی تھی اور میں اسے مٹھی میں پکڑ کر زور زور سے کھینچا کرتا تھا اور اس وقت تک نہ چھوڑتا جب وہ مجھے پیڑی گھمانے کا وعدہ نہ کر لیتے۔ اور اس طرح ہم لوگ خوب کھیلتے۔ شور وغل بڑھتا جاتا یہاں تک کہ باہر سے مجھے! جی کی آواز سنائی دیتی اور میں ان کے پاس دوڑا جاتا۔ خوش خوش بھاگتا ہوا، پھر ولال، فوراً میں اپنے بابا جی کے کندھے پر سوار ہو جاتا اور آسمانوں تک پہنچتا ہوا محسوس کرتا۔

جلد ہی جلد ہی، مچلتی ہوئی سانس کے ساتھ، میں اپنے بابا جی کو اپنے دن بھر کے افسانے سناتا۔ انھیں بتاتا کہ گرو دیوی نے جو مٹھائی دی تھی وہ کتنی لذیذ تھی اور بابو چھتر سنگھ نے جو پیڑی چڑھائی وہ کتنی شاندار اور مزے دار تھی۔۔۔ اسے خوشی کے بجائے ایسا لگتا کہ سر سے پاؤں تک مسرت میں غرق ہوں۔ لیکن اس خوشی میں کھنڈت پڑ جاتی جب بابا جی مجھ کو ٹوکتے کہ گرو دیوی اور چھتر سنگھ کا نام نہ لیا کروں بلکہ ان کو "پھوپی اماں" اور "چھوٹے بابا جی" کہا کروں!

مجھے اب تک یاد ہے کہ تعجب کی ایک دُھندلی سی لہر میرے دل میں اُٹھی تھی کہ بابا جی مجھے ایسا کرنے سے کیوں کہتے ہیں۔ بعد کو خود میں یہ سمجھ کر وہ پیر کو گزر گئیں اور اماں میں جو چُپ چُپ ہوا کرتی تھی اور گزر گئیں کے بعد نہیں ہوتا تھا وہی اس کا سبب تھا۔ مجھے بڑے فخر کا احساس ہوتا کہ اُن کا بیٹا مجھے بنایا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لیے میرا وہیں رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو ڈھال دیا تاکہ میں اپنی دُنیا میں اچھی طرح فٹ ہو سکوں اور اس طرح دُنیا کو اور اپنے ماحول کو اچھی طرح سمجھ سکوں۔

۲

زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ سبھی گرم ہوتی تھیں اور ان مہینوں کا اکیلا پن اپنے اندر عجیب سی تازگی چھپائے رہتا تھا۔ سہ پہر کو سامنے والے میدان میں ہوتا تھا اور سڑک کا کنارہ جس پر قافلوں کا سلسلہ گزرتا رہتا تھا، اونٹ برابر چلتے رہتے تھے — اور پھر کوئی ایک غیر مرئی اور بھیانک چیز کے تاریک سائے میری زندگی پر منڈلانے لگے — موت! مجھے اس پرچھائیں کا نام تک نہیں معلوم تھا، نہ میں اسے دیکھ ہی سکتا تھا۔ ہمیں یوں ہوا کہ ایک دن میں اور میرا بھائی گنیش یکایک سوتے سے اُٹھ گیا، دیکھتے ہیں کہ ہم دونوں باہر چبوترے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر سلا دیے گئے ہیں اور بچھونی اماں گر رہی ہم کو تھپک رہی ہیں۔ میں گھبرا سا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف کے باہر، پھاٹک پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں اور گھر بھر میں۔ مجھے اس

چہرہ کا — موت کا — نام بار بار سنائی دیا!

سہ پہر کا وقت تھا اور اترتی دھوپ بھی دیواروں سے لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں گھر میں گھسے تو اماں اور بابی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گنیش نے میری چھوٹی انگلی پکڑی اور آنگن میں سے ہو کر دوسری طرف لے گیا۔ جیسے ہی ہمیں یہ نظر آیا کہ برآمدے میں وہ کھٹولا خالی رکھا ہے جس پر پتھری سوتا تھا اور دونوں کوٹھریوں میں تالے پڑے ہیں مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ کوئی آفت ٹوٹی اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ گنیش نے زیادہ بہادری دکھائی، مجھے اس پیڑھی پر بٹھایا جس پر بیٹھ کر اماں چرخہ کاتتی تھیں اور چرخے کا ہتھا گھما گھما کر مجھے بہلانے لگا۔ لیکن میں ہرگز نہ بہلا —

"اماں کے پاس جاؤں گا" میں نے رٹ لگا دی۔

گنیش نے تھوڑی سی روئی لی اور اس کی مونچھ بنا کر بابی کی نقل کرنے لگا۔ میں اور بھی ڈر گیا اور زور زور سے رونے لگا۔

خوش قسمتی سے اسی وقت بابی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تانبے کا برتن تھا، جس میں دودھ تھا۔ ان کا چہرہ اداس تھا مگر میں ان کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اب گنیش کے پاس بیٹھنے میں ایسا لگتا تھا کہ محفوظ ہوں۔ بابی رسوئی میں گئے اور دو پیالے خوب گرم دودھ لے کر آئے — دونوں پیالوں کے نیچے بھپارے تھے، وہ ہمیں دودھ ٹھنڈا کر لینے کے لئے بھی ایک پیتل کا کٹورہ بھر کر دودھ لائے اور پینے لگے۔ ان کی مونچھیں دودھ کے کٹورے میں ڈوب گئیں۔ پیتے پیتے وہ ہم لوگوں کو بھی بہلاتے جاتے کہ جلدی جلدی غٹ غٹ دودھ

پہنیں بلکہ اس کی چھکیاں لیں۔

اب میرا دل کافی ٹھہر گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو بار بار اطمینان دلاتا تھا: "یہ میرے بابا جی ہیں، میرے پاس، مجھ سے قریب"۔

لیکن جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ چرخے کی روں روں نہیں سنائی دے رہی ہے، میں نے ان سے پوچھنا شروع کر دیا: "اماں کہاں ہیں؟"

"وہ ابھی آتی ہوں گی بیٹا" انھوں نے جواب دیا۔ "تم دونوں دوسری پھول راں گردیوی کے یہاں کھیلنے چلے جانا۔ وہ تمھیں 'بیر' کھانے کو دیں گی۔ چلو میں ابھی تم کو پہنچائے دیتا ہوں"۔

پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیٹی کی گڑیا انھوں نے کونے میں پھینک دی۔ مجھے اپنی گود میں اٹھایا اور گنیش کو آنے کے لیے کہہ کر چند ہی قدم اٹھے ہوں گے کہ ہم لوگوں نے اماں کو آتے دیکھا ۔۔۔ ان کی بھیگی ساڑی ان کے جسم سے چپکی تھی، خالہ اماں کے کپڑے بھی بھیگے تھے۔ وہ دونوں ڈیوڑھی سے داخل ہوئیں تو ہمیں یہ نظر آیا کہ ان کی آنکھیں لال تھیں اور وہ بیحد تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔

"تم ان لوگوں کو گردیوی کے یہاں سے کیوں لے آئے؟" انھوں نے بابا جی سے جھگڑنا شروع کیا۔

"ارے خیر کیا ہوا ۔۔۔ جانے دو ۔۔۔ ہوگا" خالہ اماں نے اماں کے لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

اماں روتے روتے بولیں: "ان لوگوں کو میرے پاس آنے دینا۔ ابھی بدن پر مٹی کی چھوت لگی ہے"۔

"آؤ — آؤ — منہ رہا،" خالہ امی نے کہا۔ "ذرا بیٹے کے بچے کو خیال کرو۔ اتنا نہ روؤ!"

میں پوچھ رہا تھا "اماں کو کیا ہوا — کیا ہوا —" اور گھسٹ کر جا کے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"تمہاری ماں کو جی اچھا نہیں ہے۔" باجی نے کہا۔

"میں اماں کے پاس جاؤں گا، اماں کے پاس جاؤں گا۔" میرا جی چاہتا تھا کہ باجی کی گود سے اچھل کر اماں سے لپٹ جاؤں!

وہ خود ہی برآمدے میں آ گئیں، مجھے گود میں لے لیا اور زور زور سے رونے لگیں۔ "ہائے بچی کے ہونے سے تو میرا گھر لٹ گیا۔" انھوں نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور اپنا سر پیٹنے لگیں۔ اب خالہ امی نے بھی اپنی ننگی چھاتی پر دوہتڑ مارنے شروع کیے اور سیاپے کے ساتھ ساتھ بین کرنے لگیں۔ "ہائے شیرا۔ ہائے ہائے شیرا!"

"یہاں اس طرح ماتم نہ کرو۔" باجی بولے۔ "یہ امرتسر نہیں ہے جو تم واویلا کرو، یہ کنٹونمنٹ ہے، صاحب لوگ سنتے ہوں گے!"

"اچھا بابا!" خالہ امی نے آنسو پونچھے۔ "کم از کم یہی تسکین ہے کہ یہ تو بچ گیا مگر جلد ہی ان کی گود پھر بھر جائے گی!"

باجی خاموش، آرام کرسی پر بیٹھے مونچھوں کو بل دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان میں اور میری اماں میں کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ کتنے الگ اور سخت معلوم ہوتے تھے، اماں کتنی قریب، نرم اور گداز —

"اٹھ گنیش آ ــــ تجھے سمندر پار تک گھما لاؤں" بابا جی نے کہا۔ گنیش اٹھ کھڑا ہوا ــــ باہر صحن میں چڑیاں چوں چوں کر کے شور مچا رہی تھیں ــــ اماں اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کی پلکیں اسی کوشش کی وجہ سے کانپ رہی تھیں۔

"بھگوان اس کی آتما کو شانتی دے۔" میرے بابا جی نے روانسے ہو کے کہا۔

"اب تو جو بچہ پیدا ہونے والا ہے وہی کچھ تسلی دے سکتا ہے۔ شاید لڑکی ہو ــــ کون جانے؟"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ فضا چکر کھا رہی تھی اور مجھے دکھائی دے رہا تھا کہ پرتھوی کا جسم میرے جسم سے الگ کوئی چیز ہو گئی ہے۔ اس کا ہمیشہ سوتا ہوا چہرہ میرے ذہن کی آنکھوں میں پھر رہا تھا کیونکہ میرے نزدیک نیند اور موت کچھ ایک ہی جیسی چیزیں تھیں۔ یہ حقیقت بھی مجھ پر ظاہر ہوئی کہ اس وقت جہاں میں لیٹا ہوا ہوں ــــ اپنی ماں کی گود میں ــــ یہاں وہ اکثر لیٹا رہتا تھا، مگر اس وقت نہیں تھا۔ تو پھر کیا میری ماں بھی میری اپنی نہیں تھی۔ میں بالکل سہم کر رہ گیا۔ پرتھوی کا چہرہ دھند سے آ آ دکھائی دے رہا تھا، ایک دور دراز جگہ سے جہاں وہ چلا گیا تھا ــــ قریب، اور قریب، اور قریب۔ مجھے یقین تھا وہ ضرور واپس آئے گا ــــ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ــــ نیند ــــ اب کوئی چیز کچھ نہیں تھی!

۷

پرتھوی کی موت کی خبر سے ہمارے یہاں مہمان آنے لگے۔ ان لوگوں میں دو ہستیاں ایسی تھیں جن کی شخصیت فوراً میرے ذہن پر چھا گئی — میرے چچا پرتاپ اور چچی دیوکی!

ان کی جوڑی بہت شاندار تھی — چچا پرتاپ بڑے وجیہہ تھے، دیوکی چچی بہت ہی پیاری سی تھیں۔ ہمارے گھر میں ان کے خلاف طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں، لیکن ان دونوں میں کچھ ایسی جادو بھری دلکشی تھی کہ میں وہ سب باتیں بھول گیا۔ ان دونوں نے میرا خوب چوچلا کیا، خوب لاڈ کیا۔ میرے نام کا گانا بار بار گنگناتے، پیار کرتے، لپٹاتے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ امرتسر واپس جائیں گے تو مجھے اپنے ساتھ لیتے جائیں گے! دوپہر کے کھانے پر دیوکی چچی نے گوشت پکایا — ایک [illegible]۔ چونکہ میری ماں اپنی رسوئی میں اپنے ہاتھ سے گوشت نہیں پکاتی تھیں اس لیے میں گوشت کا مزا چکھنے کے بعد تو ان پر بالکل لٹو ہو گیا — اور اس دن کا انتظار کرنے لگا جب میں ان کے ساتھ امرتسر جاؤں گا۔ امرتسر جو دربار صاحب کی طرح روشنی اور نور کے کسی دھانے میں، دور کہیں چھپا ہوا تھا!

سہ پہر کے وقت جب پرتاپ چچا، نیم کے گھنے ٹھنڈے سائے میں قیلولہ کرنے بیٹھ گئے تو میں نے دیوکی چچی کو یہ پوچھ پوچھ کر خوب عاجز کیا کہ وہ کب واپس جا رہی ہیں۔ وہ بے چاری میرے سوالات کے بارے میں کچھ بھی نہیں پا رہی تھیں کہ کیا جواب دیں۔ چنانچہ مجھے ٹالنے کے لیے انھوں نے مجھ

سے کہا کہ جا کر اپنا سامان باندھوں تاکہ شام کو چلنے کے لیے تیار ہو سکوں۔

اس بات پر میں نے نئے نئے کپڑوں کے لیے اماں کی خوب جان کھائی تاکہ میں گٹھری ٹھیک ٹھاک کر کے روانگی کے لیے تیار ہو سکوں۔

پہلے تو انھوں نے مجھے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ روانہ ہونے سے پہلے وہ خود ہی میرا سب سامان ٹھیک کر دیں گی۔ جب میں نہیں مانا تو وہ مجھے اندر کوٹھری میں لے گئیں اور پھر تھوڑی دیر کے لیے پلنگ پر سلانے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہاں نہ صرف یہ کہ مجھے بے حد ڈر لگا بلکہ نیند بھی نہیں آئی۔ بات یہ ہے کہ میں دوپہر میں کبھی نہیں سوتا تھا۔ اماں ہمیشہ کہتی رہتی تھیں "اس کی تو قسمت ہی میں نیند کبھی لکھی ہی نہیں ہے" اور ظاہر ہے کہ اس دن تو مجھے اور بھی ایکسائٹمنٹ تھا۔ اس لیے مجھے پیار بھری لوریاں دینے اور بہلانے کے بجائے پیارے پیارے لفظ کہتے کہتے وہ مجھ سے آہستہ آہستہ ان دونوں کے بارے میں بہت بری بری باتیں بتانے لگیں ـــــ کہ وہ لوگ ہمیشہ گوشت کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، بدمعاش لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں اور یہ کہ میں ان کے یہاں چلا گیا تو مجھ کو بہت تکلیف ہوگی وغیرہ۔ وہ مجھ کو ڈرا ڈرا کے روتی رہیں تاکہ دیر کی جائے، وہ اور بھی نہیں، اور پیچھے پیچھے یہ سب باتیں کہتی جاتیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے اپنے چچا اور چچی کے ساتھ جانے سے اور زیادہ آمادہ کرنے کا اس سے اچھا طریقہ کیا ہو سکتا تھا؟ اس لیے میں اس بڑی کا مزا تو چکھ ہی چکا تھا جو دیکی چچی نے مجھے اپنی ہنڈیا میں سے دی تھی۔ بنا نہ میری اماں نے دو چار تھپڑ رسید کیے اور مجھے ایک کونے میں ٹھنسا کر چھوڑ گئیں۔ جاتے وقت یہ بھی کہتی گئیں کہ اگر رویا یا ٹھنکا یا چیخا تو ابا جی سے شکایت کر دوں گی

اور وہ پھر مجھے میری شرارت اور ضد کا مزہ ٹھیک سے چکھائیں گے۔

میں اماں کے ہاتھ سے مار کھا کے سہم گیا۔ زندگی میں جو مار میں کھائیں ان میں یہ ایک پہلی مار تھی یہ! میں نے اپنی ہچکیوں کو دبانے کی بہت کوشش کی — کرکٹ کے بلّے سے بہت ڈر لگ رہا تھا کیونکہ بابو جی ضرور اسی سے مارتے۔ ایک دن میں نے اپنے بڑے بھائی کو بھی، بیٹ والوں اور بھنگیوں کے لڑکوں سے کھیلنے کے جرم میں اسی سے پٹتے دیکھا تھا۔ پھر بھی میں اپنا رونا بند نہ کر سکا!

دیوکی چچی آئیں اور مجھے گود میں لے کر "بل — بل" کی تال پر جھلانے اور چپ کرانے لگیں۔ پھر چچا پرتاپ آئے اور انھوں نے دودھ شکر کی لسّی بنائی اور مجھے ایک گلاس بھر کے دی۔ اس سے مجھے کچھ تسکین ہوئی اور پھر میں نے بڑا بڑھ دیوکی چچی کو بتانا شروع کر دیا کہ مجھ کو امرتسر نہ بھیجنے کے لیے میری اماں نے کیا اسباب بیان کیے تھے! دیوکی چچی تو ہنسنے لگیں مگر چچا پرتاپ کو۔ یہ بیان — ان کو برا لگا! پھر اماں نے بہتیری کوشش کی کہ بات بنائیں مگر پرتاپ چچا نے چپ سادھ لی — وہ چپ جو ان کے کردار کا ایک خاص نشان تھی۔ اور دیوکی چچی ٹرین چھوٹنے کا وقت دریافت کرنے لگیں۔

خیریت گزری کہ عین اسی وقت بابو جی دفتر سے آ پہنچے اور اپنی خوش مزاجی سے سب کو خوش کر دیا۔ ہمارے ہاں جو بھی مہمان آتے وہ بابو جی کے حسِ مذاق سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔

دیوکی چچی نے مجھے الزام لگنے سے صاف بچا لینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی — کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے سزا ملتی۔ گھر بھر میں سے

انھوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا — کہ باجی سن لیں — کہ وہ بچے اپنے
ساتھ امرتسر لیجانا چاہتی تھیں اور ماں نے انکار کر دیا تھا اس لیے میں بہت پریشان
اور رنجیدہ ہو گیا تھا۔

باجی جو ہمیشہ میرا چونچلا اور لاڈ کیا کرتے تھے، اس قصے کو سن کر ہنسنے
لگے۔ بچے کو گود میں اٹھایا اور بہکنے لگے۔ "کیوں بے بدمعاش، تو اپنے چچا جی کے
ساتھ جائے گا؟"

میں ماں کے تھپڑوں سے اتنا خوفزدہ تھا کہ میرے منہ سے کچھ نہیں نکلا
مگر میرے بھائی گنیش نے ہمت کر کے آہستہ سے کہا کہ اگر اس کو اجازت
دی جائے تو وہ چچا جی کے ساتھ امرتسر جانا چاہتا ہے۔

باجی نے گنیش کو آگے، پرتاپ چچا کی طرف دھکیلا۔ "یہ تو تمھارا ہی
ہے۔ جیسا جی چاہے کرو۔"

چچا پرتاپ بولے: "اب یہ ٹھیک اس عمر کو پہنچ چکا ہے جب اسے
کاروبار کی تربیت دی جا سکتی ہے۔"

میرا دل یہ تصور کرنا چاہتا ہے کہ اس دن دوپہر بھر جب دیوکی چچی بچے
اپنی گود میں سلائے رہیں، اور دل گرفتگی میں سے ان کا مرا اور گلاب سا چہرہ
پھر چمکا رہا — تو وہ میں تھا جسے وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں —
میرا بھائی گنیش نہیں — مگر وہ کیا کرتیں۔ میرے باجی کا حکم یوں ہی تھا اور
پھر ان کے شوہر بھی تو اسی بات پہ راضی ہو گئے تھے۔

میں دن کی حسن کی کرنوں میں غسل کرتا رہا، دل میں ان کے پیار کا ایک

طوفان سا اٹھا ہوا تھا جس نے میرے پورے وجود پر ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔

اور میں محسوس کر رہا تھا کہ نہ تو میری اماں کی شیر و شکر والی چہک، نہ خالہ اتی کا دہی کا عطر، نہ چھوٹی اماں گڑ و یوی کی سینٹ بیل بھری گھاس کی سی خوشبو میری دیدی کا مقابلہ کر سکتی تھی — جن میں سے موتیا اور مولسری کی سی ہلکی ہلکی لپٹیں آتی تھیں۔ بڑے تو سب ہمیں اپیس کر کے پرتھوی کے متعلق باتیں کرتے لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے چپکے سے دیدی سے ایک پیمان باندھا تھا — کہ ایک نہ ایک دن وہ مجھے ضرور امریکہ لے جائیں گی۔ جب انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تو ان کی آواز ان ہواؤں کی طرح بھیگی اور خنک سی تھی جو نیم کی پھنگیوں کو سرسراتی ہے۔ جب وہ مجھ پر جھکی ہوئی، مجھے لپٹائے، بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں تو ان کی چھاتیاں مجھے گدرائے آموں کی طرح سخت محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے چومتے ہوئے ان کے بوسے بارش کے خنک سے قطروں کی طرح خنک تھے — اور میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ وہ میرے ماتھے پر جھکتیں اور ان کا چہرہ میرے قریب آ جاتا تو کس طرح ان کی گنگناتی ہوئی آواز درد اور سوز سے بھرا جاتی۔

۸

ویسے تو مجھے اور گنیش سے کوئی خاص نہیں پٹتی تھی لیکن جب وہ بیچارا پرتاپ اور دیدی کے ساتھ امریکہ چلا گیا تو میری زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا کیونکہ پرتھوی کے مرنے کے بعد اب میرے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں رہ گیا

تھا۔ گنیش کم از کم کبھی کبھار صبح کے وقت مجھ سے کھیلتا تھا کیونکہ اس وقت اس کے دوست، سپاہیوں کے لڑکے اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

اور مجھے یاد آتا ہے کہ مجھ پر ایک عجیب قسم کی اداسی چھا گئی تھی — ایک ایسی اُداسی جو سامنے پھیلے ہوئے وقت کی طرح لا متناہی لگتی تھی، اس میدان کی طرح وسیع جو ہمارے گھر کے باہر رہٹ والے کنویں سے بھی آگے، باغوں سے بھی بھٹکتا ہوا، پھیلا ہوا تھا۔

اس زمانے کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ بچپن خوشیوں اور بے فکریوں کا وہ زمانہ نہیں ہے جس کی جذباتی لوگ تصویریں کھینچا کرتے ہیں، اور بڑھاپے کی جدوجہد سے جس کا مقابلہ کیا جاتا ہے — بچپن میں بھی اکیلے پن کے لمبے لمبے دورے پڑتے ہیں، جب ننھے بچے، بری طرح یا بھلی طرح اپنے احساسات کے جال میں جکڑ جاتے ہیں — اور بڑوں کی دنیا سے دُور اپنے دماغ کی تخلیقوں میں کھو جاتے ہیں — اور اکثر ایسا وہاں ہوتا ہے جہاں کنڈرگارٹن نہیں ہوتا، کوئی بال گھر نہیں ہوتا، جھولا نہیں ہوتا اور ساتھ کھیلنے کیلئے دوسرے بچے نہیں ہوتے۔

یہ سچ ہے کہ اکیلا بچہ ان حالات میں اس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ جیسے وہ کسی بڑی بیماری سے اُٹھا ہو، وہ اپنے چڑچڑے پن کو تصورات سے اور بھی بڑھاتا رہتا ہے، اپنی توجہ کو ادھر اُدھر لگاتا رہتا ہے — ویسے تو اگر شروع میں یہ عادت پڑ جائے تو آگے چل کر مفید بھی ثابت ہوتی ہے لیکن بچے کی طبیعت پر یہ بہت بڑا بار ہوتا ہے کہ ابھی باغ کے کسی کنج میں بیٹھے تصورات کا جال بن رہے ہیں اور ابھی پتہ چلا کہ بڑوں کے بنائے ہوئے قاعدوں کے

مطابق کھانا کھاتا ہے یا دوپہر کی نیند کے لیے چپ لیٹتا ہے!

پھر بھی اکیلے پن کی اس تکلیف کے باوجود اس دور نے مجھ میں ایک عجیب قسم کی قوت پیدا کی۔ میں نے اپنے حاصل کیے ہوئے تجربات پر زندہ رہنا سیکھا۔ باغ کے گھنے درختوں میں گھوم گھوم کر ان سے یگانگت کا رشتہ قائم کیا۔ صاحب کے باغ میں پھول اور دوب تو تھی ہی جہاں میں اکثر بھٹکتے بھٹکتے پہنچ جایا کرتا تھا — اور سڑک — اور اس کی مستقل طور پر بدلتی ہوئی زندگی — سڑک جس پر نیم کے گھنے درختوں کی چھاؤں سے نکل کر دوسری طرف پہنچ جاتا، اس کی دھول میں لوٹتا، انسانوں، جانوروں اور چڑیوں سے گفتگو کرتا — وہ سڑک جو میری زندگی پر چھا گئی تھی — جس کا ماضی کوئی نہیں جانتا تھا جس کا مستقبل کسی کو معلوم نہ تھا۔

مجھ سے کہا گیا تھا کہ وہاں روحیں گھومتی رہتی ہیں۔ ایسی روحیں جو آسمان پر نہیں جا سکیں۔ اس لیے یہ خاموشی اور سناٹا ایک ڈر بھی تھا جو مجھ سے حل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ڈرتا بھی تھا، اس کا سامنا کرتے گھبراتا بھی تھا۔ پھر بھی اکثر اس سناٹے کا ایک حصہ بن جاتا تھا — طوطے کی طرح وہ بچے فقرے خود ہی دہراتا ہوا ادھر ادھر بھٹکتا رہتا۔ چوہے کی طرح ایک گڑھے سے دوسرے گڑھے میں گھستا، جھانکتا، ان گڑھوں میں اکثر کنویں کا کھینچا ہوا پانی بھرا رہتا اور مجھے جہاں کہیں مٹی کے گول گول ڈھیر دکھائی دیتے، میں کیچوؤں کی تلاش میں ان کو کھود ڈالتا۔ غور سے ان کیچوؤں اور بیربہوٹی کے جسموں کو دیکھتا اور حیران رہ جاتا کہ رام دین مالی کھرپا مارے جاتا ہے مگر وہ رینگتے ہی جاتے

ہیں۔ اور پھر رام دین کی کہانیاں تو تھیں ہی کہ کس طرح اس نے بچھوؤں کو بنسی کے کانٹے پر لگا کر کتنی بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔

ان ہی لمحوں میں میں نے یہ بھی سیکھا کہ چارپائی پر لیٹے ہیں اور آسمان کی نیلی حکومت کی سرحدوں پر تیرتے ہوئے بادلوں کو طرح طرح کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ـــ جن اور بھوت اور دیوتاؤں کی شکلیں بن رہی ہیں۔ یہ بنتے دیکھنے سے بڑا مزا بھی آ رہا ہے، سب بیہودہ بھی لگ رہا ہے ـــ اور ان ہی لمحات میں آسمان سے دھیرے دھیرے زمین کی طرف آتی ہوئی ٹھنڈک اور خنکی کی نرمی کا بھی احساس ہوتا تھا ـــ اس ٹھنڈک کی سچائی اور حقیقت پر پیار بھی آتا تھا ـــ وہ کتنی اچھی لگتی تھی، جیسے سچ مچ میری ماں کی دعاؤں سے کوئی حور آسمان سے اتر آئی ہو! میری اماں مالا ہاتھ میں لیے آلتی پالتی مارے مصلّے پر اس طرح بیٹھی ہوتی تھیں جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق تھیں۔ مجھ سے پاس بھی اور پھر بھی اتنی دور ـــ اتنی دور کہ ان سے کچھ ڈر سا لگتا تھا۔

تو اس طرح ساتھیوں کے نہ ہونے سے جو تنہائی مجھے جھیلنی پڑی اس میں کوئی خوشی تو یقیناً نہیں تھی لیکن اس کمی نے مجھ میں خاموش رہنے کا رجحان پیدا کیا ـــ جو میری جوشیلی طبیعت کے بالکل متضاد بات تھی ـــ اسی رجحان کی دوسری طرف کبھی کبھار میرے مزاج میں ایسی اتھل پتھل ہوتی کہ برابر کسی نہ کسی آفت میں اس کی بدولت پھنستا رہتا۔

اس زمانے میں مردوں کو دیکھتا تو وہ مجھے سنجیدہ نظر آتے ـ عورتیں

کی آوازیں سنتا تو ان میں درد کی ایک لہر محسوس ہوتی۔ آسمان اور زمین اس وقت میرے لیے بہت بڑے ہو گئے تھے، آنکھوں کے سامنے بھاری اور تاریک پرچھائیاں نظر آتی تھیں، نگاہوں میں خوف تھا، بھیانک تصورات تھے!

۹

میں ایک دن اپنے گھر کے دروازے پہ کھڑا ہوا تھا کہ ایک مداری آ پہنچا۔ ہاتھ میں ایک ڈگڈگی تھی، دوسرے سے ایک بڑے سے کالے رنگ کے بھالو کی رسّی کھینچتا۔ اس کے کندھے پہ ایک بڑا سا جھولا لٹکا ہوا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا کہ یہ ضرور تماشہ کروائے گا، بس فوراً اس نے حلق سے گہری آوازیں نکالنی شروع کر دیں: "اوے ناچ کے دکھا دے ذرا"

میں اپنی جگہ پہ کھڑا رہا، میرے نہ ہٹنے سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی اور وہ بھی رک کر کندھے پہ سے جھولا اتارنے لگا۔ پھر خوب زور سے ڈگڈگی بجاتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی لے سے، ریچھ کو ٹہوکے دینے شروع کیے یہاں تک کہ بھاری، سیاہ ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہو گیا اور ناچنے لگا۔

جب ریچھ کے پیروں پہ بندھی ہوئی گھنگھریاں بجنے لگیں اور وہ جھومتا ہوا جھوم جھوم کے بڑے مزے میں ناچنے لگا تو رام دین مالی اور بہت سے راہی بھی تماشا دیکھنے اکٹھے ہو گئے!

مداری گا گا کے اپنے ریچھ سے پتہ نہیں کیا کیا اوٹ پٹانگ بکنے لگا۔

"اٹھ نے ناچ رے بھالو ناچ، اٹھ نے ناچ رے لڑکے، ہو لمبا روگ کوئی

اُڑن کوٹ ہے دیں، آئی بلا کو ٹالنے کے لئے سر سے اتارا تیل دے دیں، باسی کھوسی روٹی جو کوئی نہ کھائے سو مجھ غریب کو مل جائے — اے دھوبن کے بنگلے میں کیا جھانک جھانک دیکھتا ہے رے! بری بات! تیری ایسی ہی دلہن لاوے گا جیسے تو ہے، کالی کلوٹی، لمبے بالوں والی — ایسی ہی سوکھی سی تھرتھری نکلے جیسی تیری ہے......"

"اے ناچ رے لڑیا ناچ، جنٹلمن کو ست گھر نہ جا، ادھر دیکھ تو تجھے بھی سرکاری نوکری کا کوئی کپڑا اتار مل جائے — اے کیوں بدمعاشی سے ہنسے جا رہا ہے رے......"

یہ الفاظ ایسے عجیب تھے کہ میں فوراً ان کو دہرانے لگا حالانکہ ان الفاظ میں جو شریر معنی چھپے ہوئے تھے ان کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

ریچھ کی شعلہ بار سانسیں، دُھوں دُھوں کرتی جا رہی تھیں، اور اس کے سیاہ بھاری بھر کم وجود کے نیچے سے بجتی ہوئی گھنٹیوں کو اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کو بجا بجا کرتے دیکھے جا رہا تھا۔ لیکن چالاک مداری نے اب ڈگڈگی بجانا بند کر دیا تھا۔ وہ جانور کا پورا تماشہ دکھانے سے پہلے اس بات کا یقین کر لینا چاہتا تھا کہ اس کا انعام مل جائے گا۔ ڈگڈگی بند ہوتے ہی بالدار دندنا دھم سے چاروں پیروں پر آ رہا — چاروں طرف اڑتی ہوئی مٹی پھر نیچے معمول سطح پر جم گئی۔ مداری نے بھیگی بھیگی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کچھ مل جائے دل والے سخی، دعائیں جو فقیر سائیں کو کچھ کھانے کو مل جائیں دھیلہ پیسہ!"

یہ سُن کر مجھے ساہی کی کھٹک ہے!

"بکنڑ بس جائیں — بابا۔"

اس بات پر ایک جاتے ہوئے سپاہی کو غصّہ آگیا اور رک کر بولا کہ اگر اب مداری نے بدتمیزی کی تو اس کو پکڑ کر اسے مرغا بنوائے گا۔ اس دھمکی کا جواب مداری نے ایک گندی گالی سے دیا اور لڑائی ہوتی جاتی مگر اماں ایک پیالے میں آٹا لیے باہر نکلیں۔ مداری نے دوڑ کر آٹا اپنے تھیلے میں لے لیا۔ بجا رہی اس کے ساتھ آیا ایسے زور کے لمبے اپنی اماں کی ساری کا تیر بھیج کر ان سے لپٹ گیا۔

"گرو گورکھ ناتھ تمہارا اور تمہارے بال بچوں کا بھلا کریں مائی۔" مداری نے کہا۔

"کیوں سائیں بابا — یہ جادوگر گورکھ ناتھ بھی ہم سے خوش تو ہیں نا؟" میری اماں نے تیر سر پر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔ میں اس بات چیت سے بور ہوگیا اور اماں سے ضد کرنے لگا کہ اس سے تماشا کروائیں۔ "ٹھہر تو بیٹا!"

انھوں نے میری بات ان سنی کردی!

لیکن اسی وقت میرے ابا دفتر سے آتے دکھائی دیے۔ ان کو دیکھ کر میں زور سے چلایا، "ابا جی! ایک مداری آیا ہے جادو والا۔ ابا جی اس سے جادو کا تماشا کروائیے نا!"

مداری نے پھر سے تماشہ دکھانا شروع کیا کیونکہ اسے امید ہو چلی تھی کہ ابا جی ضرور اسے کچھ انعام دیں گے۔

چنانچہ وہ تماشہ کرنے لگا۔ "اے لڑکے — دکھاوے ناچ ان لوگوں کو۔ تونے چیانٹوں کی ... ابھی ... بچھو جیسا تماشہ کیا کیسے بڑھا چلا ہے — تو جنگل کا رہنے والا، بس گرو گورکھ ناتھ کے سامنے جھکنے والا — دکھاوے ناچ۔"

دکھائے ناچ :

جمالو نے پھر اپنے پنجے اُٹھائے، اور اپنے بھورے اور سیاہ بالوں کو ہلا ہلا کر عجیب مسخرے پن سے ناچنے لگا۔ اس کے بال مونچھ کی طرح سر پر آ گئے تھے، بڑا سا بھاری، بھدا جسم جھوم رہا تھا اور وہ زمین پر بھدا بھد، بھدا بھد کوٹے جا رہا تھا۔ جب جمالو کے پاؤں میں بندھی گھنٹیاں گنگنانے لگیں اور مداری کا گانا چل پڑا تو مجھ پر ایسی حیرانگی اور ایسی مسرت طاری ہوئی کہ گویا نشہ چھا گیا ہو ـــ مداری کے الفاظ نے گویا جمالو کے ناچ کا جادو اور بھی بڑھا دیا ـــ آسمان زمین ایک محسوس ہونے لگے۔

"اٹھے اسے لڑیا ـــ ناچ دسے لڑیا ـــ تو ہی دکھی لوگوں کی مدد کرتا ہے، تو ہی انسانوں کی پریشانی دور کرتا ہے، عورتوں کے دلوں پر تیرا ہی تو قبضہ ہے!"

"اٹھے ناچ شے۔ اور ناچ شے ـــ تیرے ماتھے پر سفید تلی ہے کیونکہ تیرا جسم کالا ہے مگر تیرا دل تو نور سے بھرا ہے!"

"اٹھے ناچ شے ناچ ـــ برائی کو دور بھگا شے، کنجوسوں کو نکال شے، بس سخی داتا رہ جائیں..... تو تو جانوروں کی شاہی نسل سے ہے ـــ شہزادہ ہے تو ـــ کالا شہزادہ....."

اور جمالو ناچتا رہا ـــ اس کی سانس پھولتی گئی مگر وہ تھکا نہیں، پسینہ آ آ رہا مگر رکا نہیں، خوشی کے جوش میں وہ دھا دھم زمین پر قدم مارتا تھا۔ اور میں اس رقص کی حیرت اور مسرت میں کھو گیا تھا اسی طرح دیوانہ وار

خوش ہو رہا تھا جیسے مدتوں سے ——— پر تھوڑی کی مسرت سے کہ اب تک نہیں ہنسا تھا!

بچپن — آہ — بچپن — بچپن میں انسان کے لئے کتنا آسان ہے ذرا سی بات پر رنجیدہ ہو جانا ، معمولی سی بات پر خوش ہو لینا — اور بچپن کے اس فوراً بدلتے ہوئے غم اور مسرت سے بھی زیادہ کوئی غم ہے ؟ کوئی مسرت! ان دنوں میں، وہ کیا سحر پنہاں تھا جو اب نہیں — کیا وہ اپنی عمر کی خصوصیت تھی یا اپنے جسم کا نیا نیا خون!

۱۰

دن کو مجھے نیند نہیں آتی تھی ، اور پچھلے پہر، دوپہر روشن کی تنہائیوں سے بچنے کے لیے میں نے سپاہیوں کی بارکوں میں رہنے والے لڑکوں سے آہستہ آہستہ دوستی کا تعلق شروع کی ۔ یہ بارکیں ریتیلے میدان کے دوسری طرف پڑتی تھیں!

کئی کئی دن تک لگاتار، ایسا ہوتا تھا کہ میں کنوئیں کے پاس باغ کے درختوں کی چھاؤں میں کھڑا، کھیتوں اور پرے کے میدان کی لامتناہی وسعتوں سے پار، افق کی طرف تکتا رہتا تھا، جہاں سپاہیوں کے کچے جھونپڑے تھے۔ ان جھونپڑوں کو ہمیشہ دھواں گھیرے رہتا تھا جو دو سرخ رنگ کی چمنیوں سے مسلسل نکلتا رہتا تھا۔ ان چمنیوں میں بارکوں کا فضلہ جلایا جاتا تھا — وہاں کھڑے کھڑے میں، اُفق کی تنہائیوں پر نظریں جمائے رہتا تھا، کبھی کبھار کسی گنگناتے ہوئے جوڑے کی مدھم آواز میرے کانوں کو چھو لیتی تھی — اور

مجھے اس وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ مجھے کسی ساتھی کا انتظار ہے، کسی دوست کا انتظار ہے جو ابھی نکل آئے گا اور میرے ساتھ کھیلے گا۔

ایک دن مجھے علی نظر آیا ——— وہ جبدل کا بھائی تھا جو رجمنٹ میں بگل بجایا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پیچھے پیچھے رینگتا ہوا، پاخانوں کے بیچ والے ٹیلے کی طرف گیا اور ایک کیکر کے درخت کے نیچے دبک گیا۔ میں نے اس کی نظر بچا کر دوڑنا شروع کیا اور باغ کی طرف مڑ کے دیکھے بغیر علی کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ گیلی مٹی کا ایک ڈھیلا چبا رہا ہے، اس کی ناک بہہ رہی تھی اور سر پر پہنی ہوئی لال ترکی ٹوپی سے پسینہ بہہ بہہ کر گالوں پر سے بہتا ہوا گردن پر ٹپک رہا تھا۔ میلی دھاری دار قمیص بھی بھیگی ہوئی تھی اور میلی ڈھیلی ہوئی شلوار مٹی میں اٹی تھی۔

"آؤ ——— کھا کے دیکھو۔" وہ چپکے سے خنخناتی ہوئی آواز میں بولا۔ اس کی ناک طوطے کی طرح تھی اور لیسدار رطوبت اس میں سے نکل کر ہونٹوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں اس دعوت پر بے حد خوش ہوا۔ بات یہ تھی کہ علی گنیش کا خاص دوست تھا اور ہمیشہ اس شرط پر گنیش کے ساتھ کھیلتا تھا کہ میں کبھی ان میں نہ چپکوں۔ میں نے مٹی کا ایک نوالہ کھایا اور اس کا میٹھا، سوکھا، رتیلا مزہ مجھے اچھا لگا۔

"ابے بیٹھ جا گدھے! نہیں تو تیری ماں ہم دونوں کو دیکھ لے گی۔" ——— اس نے میری قمیص کا دامن پکڑ کے کھینچا۔

ظاہر ہے کہ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ اماں دیکھیں اس لیے اس راز کی اور خوشی میں فوراً شریک ہو گیا۔

"اچھا وعدہ کر کسی سے کہے گا تو نہیں کہ میں نے تجھے مٹی کھلائی ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں وعدہ کرتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

اس بات پر اس نے اس مٹی کے ڈھیلے میں سے ایک منہ مجھے اور کھلایا جس کو وہ خود چوہے کی طرح کتر رہا تھا۔

"چل اب ناگ پھنی کا پھل کھائیں ـــ سوکھی مٹی کے بعد اس کا رس بڑا اچھا لگتا ہے"

وہ ناگ پھنی کی جھاڑیوں میں رینگا، میں نے بھی اس کا ساتھ دیا لیکن وہ جھک کے چاروں ہاتھ پاؤں پر چلا اور میں اُٹھ کر کودتا ہوا دوڑا۔

"ابے لیٹ، کہہ رہا ہوں" کلّو نے مجھے زور سے زمین پر کھینچا اور ایک زناٹے کا طمانچہ رسید کیا۔

میں نے بھوں بھوں رونا شروع کر دیا!

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھسپھس سے بولا: "ارے خدا کے واسطے چپ رہ دوست ورنہ تو تو میرا بھی بیڑا غرق کروائے گا ـــ دیکھ تو ـــ اسے دیکھ تو سہی ـــ تجھے کیا شے دے رہا ہوں"

بائیں ہاتھ سے اس نے ایک گہرے رنگ کا پھل توڑا، پھر اسے ذرا دیر زمین پر زور زور سے رگڑا اور اس کی ڈھیبی کھول دی۔ سُرخ سُرخ

رس پھل میں سے اُبلنے لگا۔ اس نے سر ہلا کر بڑے مزے سے اس کو چوسنا شروع کر دیا جیسے آم چوس رہا ہو۔

"ذرا سا مجھے بھی!" میں نے خوشامد سے کہا اور اس نے مجھے بھی ایک پھل چوس لینے دیا۔ اس کا مزہ گرم اور چٹپٹا تھا جو زبان اور دانتوں پر ذرا لگتا تھا۔

"کیوں؟ اچھا لگا نا؟"

"ہاں" میں نے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر ایک ہی لمحے بعد میں اپنے ہونٹوں کو ہاتھ سے مل رہا تھا اور جو رس چوسا تھا اس کو تھوک رہا تھا۔

"اُلّو کہیں کا ۔۔۔ گدھا ۔۔۔ کانٹے بھی اس کے ساتھ نگل گیا!"

مجھے اس مصیبت سے سخت ہول ہونے لگا اور میں حلق پھاڑ پھاڑ کے چلانے لگا۔

"چپ رہ سالے" علی نے مجھے گالی دی۔ لیکن میں چپ نہیں ہوا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ علی نے جب پھل کو چھیل پرے گرایا تو جلدی میں کچھ کانٹے کھیں لگے تو کچھ لگے رہ گئے تھے اور وہی میری زبان اور ہونٹوں میں چبھ گئے۔

"دیکھ تو ۔۔۔ ایک گھونٹ اور دے گا!"

ویسے تو مجھے اس کے غصے سے زیادہ کانٹوں کا ڈر تھا مگر پھر بھی میں اس کی بات مان گیا۔ میں نے پھر رس چوسا۔ لیکن سوالے کے کانٹوں کی چبھن سے اب تک مجھے رُلائی آ رہی تھی۔ ان کی تکلیف تو ان ننھی مرچوں سے بھی زیادہ

جلن دار تھی جو اماں مجھے جگانے کے لئے اپنی چپاتیوں پر لگا کرتی تھیں۔

اب علی کے بے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ مجھے واپس گھسیٹ کر سپاہیوں کی بارکوں تک پہنچائے۔ جب میرا ملائم نرم جسم، میدان کی کھردری تپتی ہوئی زمین پر گھسٹنے لگا تو میں اور بھی زور سے رونے چیخنے لگا۔ اب تو بہنیں سب کو سنائی دے سکتی تھیں۔

بھنگی کا لڑکا باکھا جو سرخ جھنڈیوں میں سے پھاوڑے بھر بھر کے کوڑا اور گندگی نکال رہا تھا، دوڑا ہوا ہمارے پاس آپہنچا۔ "ابے کیوں تو بچے کو اس طرح گھسیٹ رہا ہے؟"

"یہ سالا چیخ کر میری ماں کو اٹھائے گا اور میں اسے سوتا چھوڑ کر آیا تھا؟" علی نے جواب دیا۔ "یا اس نے مجھے انعام دیا ہے ایک تو [illegible] کا چیس کھلایا اور......"

"ابے سالے اسے تو چوٹ لگ گئی ہے" باکھا نے کہا۔ "بتاؤ تو بھیا کیا ہوا تھا؟"

میں نے پانچوں انگلیوں سے منہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "کاٹے!"

"اوہ کہیں کا" باکھا نے کہا اور ٹانگ اس طرح گھمائی کہ علی کے ٹخنوں پر اس کے بھاری فوجی جوتے پڑتے پڑتے بچے! پھر وہ جھنڈے والے کے لئے سے مڑ گیا۔ اس کا بھاری صافہ کھل گیا تھا، خاکی وردی اور نیکر ڈھول اور پسینے میں لت پت ہو رہے تھے!

"میں تمہیں گود میں لے سکتا ہوں؟" وہ مجھ سے بولا۔ "پر ذرا ٹھہرو بھیا

میں چھبو نے اور رام چرن کو بلا کے لاتا ہوں۔"

"اس نے مجھے سنی بھی کھلائی تھی" — میں نے باگھا کے جاتے جاتے کہا۔

"چپ رہو سالے" علی چیخا اور پھر اس نے ایک زناٹے کا طمانچہ مجھے رسید کیا۔ میں نے چیخ چیخ کے آسمان سر پر اٹھا لیا! باگھا رک گیا اور زور سے آواز دے کر چھبو نے اور رام چرن کو بلایا جو سپاہیوں کے شاگرد پیشوں کی کچی جھونپڑیوں کے پیچھے اوٹ گولیاں کھیل رہے تھے۔ پھر واپس آ کر اس نے علی کا کان پکڑا اور سب سے پہلے اس سے کہا کہ ناک ٹھیک سے چھنک لے تاکہ اس کی عمدگی سے مرمت کی جا سکے۔ جب علی نے ایسا نہیں کیا تو باگھا نے اس کی ترکی ٹوپی جھپٹ کے اتار لی اور اس سے اس کی ناک پونچھ دی!

بانسری بجانے والا چھوٹا اور گلابو دھوبن کا لڑکا رام چرن، علی کو باگھا کے ہاتھ سے یہ سزائیں پاتے دیکھ کر بڑا مزا لینے لگے۔

چھوٹا دور سے ہی بولا۔ "چل بے، علی کے بچے، کر جو باگھا کہہ رہا ہے!"

"چل ۔۔۔ چل ۔۔۔ کر" رام چرن نے دھوپ کے چلکے سے اپنی پلکوں بھری آنکھوں کو بچا کے کہا۔

علی بولا، "ٹھہر جا سالی، رک جا ذرا، مجھے موقعہ لگنے دے بدلہ لوں گا! ایک تو اس نوکر کے بچے نے مجھے چھوا اور گندہ کیا۔ پھر میری ترکی ٹوپی سے میری ناک پونچھ کر میرے دین کی توہین کرتا ہے!" غصے کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ باگھا کی گرفت میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

میں کبھی روتا، کبھی ہنستا! لیکن چونکہ زبان اور حلق میں کانٹے اب بھی

وجہ رہے تھے اس لیے بیچ بیچ میں انھیں اب بھی مارنے لگتا۔

"چپ رہو سالے" بھو نے چیخ کے کہا۔ "کون تجھے گود لے رہا ہے — اُٹھا اسے رام چرن!"

اس بات پر میں زمین میں لوٹ گیا اور رام چرن کی گود میں جانے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ اس کے گھر کے بچھوے جوڑے تھے اور آنکھیں بچھو کی طرح لال لال سی تھیں! بکھارا کو معلوم تھا کہ وہ بہت تھرڈ ہے اس لیے اگر کسی کو اور خاص کر میری ماں کو معلوم ہوا کہ اس نے مجھے ہاتھ لگایا تو اس کی خیر نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے مجھے گود میں نہیں لیا اور خود اپنے جاروب کی بوٹ چمکاتا ہوا سپاہیوں کی بارک کی طرف چلا۔ "ٹھہرو بھیا — کسی کو بلا کے لاتا ہوں جو تمہیں گود میں لے چلے۔"

اس کی پیٹھ مڑی ہی تھی کہ میں چیتے کی طرح رام چرن پر جھپٹ پڑا — دونوں گتھم گتھا ہو کر زمین پر لوٹنے لگے۔ بھو نے دونوں کو چھڑانا چاہا لیکن میں نے جو اس کے ہاتھ میں کاٹا تو وہ بھی مجھ کو لپٹ گیا۔

اب تو مجھے اتنا ڈر لگا کہ کچھ کہنے کو نہیں۔ چاروں طرف نظر دوڑاتا تھا تو صرف سنسان میدان دکھائی دیتے تھے۔ بن میں ناگ پھنی، تھوہڑ اور گوکھرو اُگے ہوئے تھے۔ اس ڈر کے مارے دم بھی جان نکلی جاتی تھی کہ اماں نے منہ میں کانٹے دیکھے تو خوب ہی خبر لیں گی۔

آخر کار بکھارا لوٹا — اس کے ساتھ کلیش تھا۔ لمبا چوڑا سپاہی رام سیا جو رجمنٹ کے بینڈ میں بگل بجاتا تھا اور کچھ دن تک مجھے اردلی کی حیثیت

810-4/881 50600-9

بھی کام کر چکا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھایا اور پچکارتا بہلاتا گھر لے گیا۔
اماں سو رہی تھیں، کنڈی کھڑکھڑانے کی آواز سے گھبرا کر اٹھیں اور مجھے
روتا، دھول میں اٹا، دیکھ کر چیخ پڑیں۔

اور پھر مجھے ان کے ہاتھ سے دوسری بار مار پڑی! — وہ تو خیریت
ہوئی کہ گنیش ساتھ تھا، غیر ہونے کے لحاظ سے اماں کی مار سے اس نے مجھے
بچا لیا۔ جب ان کا غصہ ذرا دھیما ہوا تو انھوں نے مجھے پیار سے نہلا دھلا کر
صاف ستھرا کیا، اور مٹی اور پھوٹے اور بابا کو اور رام چرن سب کو خوب کوسا
کہ ان کے ننھے منے بیٹے کو ایسے بڑے بڑے کھیل سکھاتے ہیں کہ مٹی کھاؤ اور
ناک چھینی کا دم پیو!

"دیکھو لوگو" وہ بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ "اندھیر ہے دنیا میں اندھیر —
ان نیچ کمینوں نے کیا سر اٹھایا ہے کہ آسمان پر ان کے دماغ پہنچ گئے ہیں!"

ان کی بات کے ساتھ ساتھ میری نظروں میں بھی وہ سپاہیوں کی باتیں
اور ان کے شاگرد پیشیوں کا وہ گندہ ماحول گھوم رہا تھا اور مجھے اس سے نفرت محسوس
ہو رہی تھی۔ وہ کوڑے کے ڈھیر جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، ہوا میں پھیلا ہوا گردوا
بدبودار دھواں، اور بکھری زمین، مرے ہوئے کتے، بلیوں کی سڑتی ہوئی لاشیں،
پچکے ہوئے ڈبوں کے بیچ بیچ میں جو دھونیوں اور چنگاریوں نے سلگنے کے لیے
پھیلائے تھے!

١١

اس قصے کے بعد باجی نے گنیش کو امرتسر سے بلوا لیا۔ گنیش کے بولنے

میں دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میرے ساتھ کھیلنے کے لیے کوئی ہو جائے، دوسرے یہ کہ اسکول میں داخل کروا دیا جائے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ گنیش کو جو پرتاپ چچا کے ساتھ بھیجا گیا تھا تو شکار ہی کا صرف نام تھا، دراصل کام سمجھا تو محض ایک بہانہ تھا، دراصل بابی کا پلان یہ تھا کہ پرتاپ چچا اسے گود لے لیں کیونکہ پرتاپ چچا کے کوئی اولاد نہیں تھی ـــــ اور اس طرح بالآخر خاندانی جائداد ایک ہی جگہ رہے!

گنیش آیا تو پہلے سے زیادہ خوش لگتا تھا اور ایسا بھی معلوم ہوتا تھا کہ اچھا کھاتا پیتا رہا ہے ـــــ وہ نئی دھوتی اور نئی صدری پہنے تھا ـــــ بالکل شہر کے لالاؤں کی طرح۔

کچھ دن تک وہ مجھ پر بہت مہربان رہا اور میں بالکل اس کا ہو گیا۔ شاید اس نے مجھے ایک ململ کا رومال دیا اور مجھے اکنیاں اور دونیاں گرہ باندھ کر دیں۔ کھیلنے کو دیں! پھر اس نے مجھے ایک مٹی کا بنا سا گھوڑا چھونے کی بھی اجازت دی جو وہ شہر سے لایا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پرتاپ چچا نے ایک دن دربار صاحب سے اس کو یہ گھوڑا خرید کے دیا تھا۔ پھر اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کرشن ہی پار دیوکی چچی نے گوشت پکایا تھا اور روٹیاں کھاتے وقت میرا ذکر کیا تھا۔ "مجھے یاد کیا تھا!" اور کس طرح فقیر خانہ میں جانے، اپنے گھر کے پاس رہی، اپنی چھت پر شام کو بیٹھ کر دیوکی چچی نے جانے کتنی ہی دیوتوں اور پریوں کی کہانیاں اسے سنائی تھیں!

میری اماں خوب کرید کرید کر گنیش سے پوچھتی تھیں کہ دیوکی چچی کے یہاں کون کون لوگ ملنے آتے تھے، اور اس طرح ان کو جو کچھ بھی باتیں اور افسانے ہاتھ آئے، سب کو جوڑ جاڑ کر انھوں نے دیوکی چچی کے خلاف اچھا خاصا مقدمہ تیار کر لیا!

ہمارے گھر میں جیسے پھر سے بہار آگئی، نغمے سے پھوٹنے لگے، ہماری آوازیں گونجنے لگیں، کیونکہ پرتھوی کی موت کے بعد سے گھر کی فضا بھی بوجھل رہتی تھی اور میرے اور گنیش کے جھگڑے بھی بند ہو گئے تھے۔ "چیزوں" اور ان کے حصوں کے متعلق ہماری لڑائیاں بھی رک گئی تھیں۔ ایک بات اور یہ بھی ہوئی کہ میرے بڑے بھائی ہرش نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا اور اب وہ جلد جلد ہم لوگوں سے ملنے آنے لگا۔ اماں کے یہاں بھی بچہ ہونے والا تھا اور ان کا پیٹ خوب بڑھا ہوا تھا۔ میں جب کبھی اس گھڑے سے پیٹ کے ساتھ پٹا یا جاتا تو مجھے اندر ہلتے ڈولتے بچے کا احساس ہوتا!

گھر کے ماحول پر جب پھر محبت چھا گئی تو گنیش بھی اکثر مجھ سے کھیلنے لگا۔ اماں اور بابا جی دونوں ہی یہ ناپسند کرتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی باہر کے لڑکوں سے کھیلے، جہاں جھگڑے اور لڑائیاں ہوں۔ اس لیے گنیش کے واسطے بھی اور کوئی راستہ باقی نہ تھا۔

لیکن ہماری اس نئی دوستی کا انجام اس قدر ہولناک ہوا کہ غل کے ساتھ جھگڑے کے سلسلے میں جو آفت مجھ پر ٹوٹی تھی وہ اس کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ گھر میں بلی نے بچے دیے۔ کئی دنوں تک اس بلی کی حالت یہ تھی کہ اماں کے سوا اگر کوئی اس کی ٹوکری کے نزدیک چلا جاتا تو بہت بری طرح سے جھپٹتی تھی! دوسرے بلی کے ننھے بچوں کو دیکھنے کے لیے میرا اشتیاق بڑھتا جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ مجھے اس کے قریب جانے سے روکا جاتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں بالکل آپے سے باہر ہو گیا۔

ایک دن جبکہ بلی آس پاس نہیں تھی، اور میں ایسے ہی سوتے کی تلاش میں تھا، میں ٹوکری کے نزدیک پہنچا اور دیکھا کہ پانچوں بچے، ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے، بے چین پڑے ہیں۔ تین کی تو آنکھیں کھل چکی تھیں اور دو بالکل اندھے۔ ان تینوں کے نیچے دبے پڑے تھے!

میں نے گنیش سے یہ طے کیا کہ چونکہ وہ تنہا ہے اس لیے وہ دو بچوں کو اٹھائے، میں ایک کو اٹھاؤں — اور پھر وہاں باغ میں چلیں اور ان کو دکھائیں کہ جہاں کیا ہاتھ لگا ہے۔ گنیش نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہم دونوں نے اپنے اپنے بچے اٹھائے۔ وہ بیچارے میاؤں میاؤں کرنے لگے۔ ہم لوگ ان کو تھپکتے، پیار کرتے باغ میں لے گئے۔ ماں کہیں نظر نہ آیا اس لیے کچھ دیر ہم لوگ ان سے کھیلتے رہے۔ انھیں چلاتے رہے! چونکہ ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ اپنے آپ چل پھر سکتے اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی گردنوں میں رومال باندھ کر اس طرح ان کو چلائیں جیسے صاحب لوگ کتوں اور بلیوں کو گلے میں پٹہ اور زنجیر ڈال کر گھماتے ہیں! لیکن بلی کے بچوں نے اس ترکیب پر عمل کرنے نہیں دیا۔ اور بھی زیادہ غمگین آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگے! اس بات پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کنویں پر چل کر بچوں کو پانی میں ان کا عکس دکھایا جائے!

کنویں کی نیچی جگت پر کھڑے ہو کر ہم منڈیر کے پاس سے جھکے اور بلی کے بچوں کو پانی پر آگے بڑھایا تو ہمیں پانی میں ان کا عکس دکھائی دینے لگا۔ ہمیں اپنی آوازوں کی گونج کنویں کی گہرائی سے سنائی دے رہی تھی اس لیے ہم نے خود سے کان لگا کر سنا کہ بلی کے بچوں کی میاؤں میاؤں کی گونج بھی سنائی دے رہی ہے کہ

نہیں۔ ان بیچارے ننھے بچوں کی آواز بہت ہی ہلکی آ رہی تھی۔

یکایک گنیش نے مجھے بڑھاوا دیا کہ اپنے والے بچے کو کنوئیں میں پھینک دوں ___ کیونکہ " اس نے کہا، " پھر ہم کو اس کی میاؤں میاؤں کی آواز زیادہ صاف سُنائی دے گی:

میں نے اس سے کہا کہ وہ بھی اپنے بچوں کو پھینک دے، پھر اور زیادہ میاؤں میاؤں ہوگی! وہ مان گیا تو میں نے کہا کہ پہلے وہ شروع کرے کیونکہ اسی کے پاس وہ بچے ہیں۔ لیکن اس نے بڑے ہونے کے ناتے مجھے حکم دیا کہ پہلے میں پھینکوں۔ پھر میں نے زیادہ بحث نہیں کی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بچے کو کنوئیں میں چھوڑ دیا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا نیچے چلا گیا، وہ تین بار پانی میں ڈبکی کھائی دو تین بار اس کا سر دکھائی دیا ___ اور وہ برابر اپنی طاقت بھر میاؤں میاؤں کرتا رہا۔

گنیش کو یا تو اتنا ڈر لگا کہ وہ اپنے والے بچے کو پھینک ہی نہ سکا یا اس کی نیت سرے سے پھینکنے کی تھی ہی نہیں، بہرحال وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا اور بھاگتا ہوا گھر میں گھسا اور اماں کو بتا دیا کہ میں نے کیا کیا۔

میری اماں دوڑتی ہوئی باہر نکلیں، سینہ پیٹتی، جیسے وہ پڑوسی کی موت کے وقت پیٹ رہی تھیں اور مجھے اس گناہ پر بُرا بھلا کہنے لگیں۔ پھر انھوں نے مالی کو بلایا اور اس سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کنوئیں میں اُتر کے بچے کی جان بچانے کی کوشش کرے!

مالی کنوئیں پر بندھی زنجیر کے ذریعے، ہاتھ میں ٹوکری لیے، اندر اُترا۔

لیکن اوپر آ کر اس نے بتایا کہ بچہ نرسری میں سے تو سہی مگر مرا ہوا۔

مجھے نہیں معلوم کہ جو مار پڑنے والی تھی اس سے میں کیسے بچا۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ اماں مجھے اس ہتیا پر برا بھلا کہتی رہتی تھیں جو میں نے بلی کے بچے کو کنویں میں ڈبو کر کی تھی۔ چونکہ بچوں کی ماں بلی بار بار میاؤں میاؤں کرتی ادھر اُدھر اپنے بچوں کو تلاش کرتی روتی پھرتی تھی اور باقی بچوں کی بڑی شدت سے حفاظت کرتی تھی اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اماں ایک سونے کی بلی بنوا کر ٹھنٹت میں پنڈت بالکرشن کے مندر میں چڑھائیں تاکہ میرے پاپ کا پرائشچت ہو سکے۔

مجھے اس وقت احساس نہیں تھا کہ میں نے کتنا بڑا کیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میرے لیے اس وحشت کو ہی اپنے ذہن سے نکالنا مشکل تھا جو مجھے بار بار پانی میں ڈوبتے ہوئے بچے کی میاؤں میاؤں یاد آنے پر ہوتی تھی اور بچے کے لیے بلی کا رونا سن کر مجھے ایسا لگتا کہ خدا کا ایک بڑا سا داڑھی والا چہرہ میرے بالکل نزدیک آ گیا ہے اور طرح طرح کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہیں اور گھنٹیاں بج رہی ہیں اور کوئی کہہ رہا ہے۔ "ٹھہر — تجھے اس کی کیسی سزا دیتا ہوں میں —" میرے وجود میں جو ضدی اور خود سر بچہ بیٹھا ہوا تھا وہ بالکل بجھ مُردہ ہو گیا — یہ تو مجھے کئی سال بعد پتہ چلا کہ گنیش نے یہ ترکیب بنا کر مجھ سے یہ حرکت کروائی تھی — اس نے میرے ساتھ جو یہ دھوکا کیا تھا اس کے لیے میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکا۔

۱۴

اس حادثے کے بعد میں بہت ذلیل ہو گیا خاص کر اماں کی نظروں میں۔ کیونکہ ان کو نہ صرف میرے اس گناہ کا احساس تھا بلکہ میرے گناہ کے کفارے میں جو بلی بنوا کر مندر میں چڑھوائی تھی اس کے سونے کی قیمت بھی دینی تھی! ویسے تو خیر سے اپنی ناراضی کا کوئی خاص اظہار نہیں کیا لیکن اکثر خفا ہوتی تھیں اور اکثر غریب بلی کا رونا روتیں تو مجھے اس لاپروائی پر برا بھلا کہتیں۔

باجی البتہ اب تک خوب لاڈ کرتے تھے، گود میں لے کر بے معنی الفاظ گنگناتے ہوئے جھلاتے۔ مجھ سے اپنی مونچھیں کھنچواتے اور اماں کی توہم پرستی کا خوب مذاق اڑاتے۔ مجھے ان کے الفاظ اور اماں کے جواب یاد ہیں حالانکہ اس وقت میں ان کا مطلب بالکل نہیں سمجھتا تھا۔

"یہ تیری اماں بالکل بیوقوف ہے" باجی کہتے "ذرا سوچ تو بھگوان کو خوش کرنے کے لیے سونے کی بلی بنوانے کا کیا تک ہے آخر! وہ سونے کا کھلونا ضرور پنڈت بالکرشن کی تجوری میں پہنچے گا، تجوری اور بھر جائے گی۔ بلی کا بچہ تو مر چکا، ختم ہو چکا، اس بچے کا قصور ہی کیا ہے جبکہ اس کو یہ پتہ ہی نہ تھا کہ وہ کر کیا رہا ہے اور یہ پاگل سندریا خواہ مخواہ غصہ کی کلکل سے مری جاتی ہے۔"

"ارے اب ایسے نہ بنو جیسے سب کچھ تم ہی جانتے ہو۔ بھگوان کی لیلا نیاری ہے، وہ سب دیکھتا ہے، ہم کس وقت کیا کرتے ہیں۔ اگر پاؤں کے کی چیونٹی کو بھی ہم دکھ پہنچائیں گے تو اس کو پتہ چل جائے گا ـــ اور اس کے

یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ میں تو کبھی نہ چاہوں گی کہ وہ ہم سے خفا ہو۔ ویسے ہی ہم اپنے برے کرموں کا پھل بھوگ چکے ہیں — پرتھوی چلا گیا۔ اب انہیں لڑکوں کی اور پیدا ہونے والے بچے کی عمر بڑھے۔ اور تم تو یہ دل لگی نہ کرتے تو اچھا کرتے۔ میں تمھارے گناہوں کا خمیازہ ویسے ہی بھگتا کرتی ہوں۔"

"یہ تو عجیب دلیل ہے بھئی" پاپا جی نے کہا۔ "یہ کس قسم کا خدا بھگوان ہے جو اس طرح سے انتقام لیتا ہے؟"

"مت بے دینی کی باتیں کرو" ماں جی نے کہا۔ "بھگوان کو گالی دیتے ہو۔ دس سال تک پورن ماشی پر برہمن کھلانے پڑیں گے۔"

پاپا جی نے صرف آنکھیں سکوڑیں اور ہنسنے لگے۔ پھر وہ ہم سب کو سمیٹ کر باغ والے کنویں پر نہلانے کے لیے لے گئے۔

ان دنوں وہ ہم لوگوں کی دیکھ بھال میں زیادہ حصہ لینے لگے تھے کیونکہ غالباً ان کو یہ خیال تھا کہ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور وہ ہم لوگوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی ہیں۔ ہم اس بات پر بے حد خوش تھے کیونکہ ہمارے لیے تو وہ ایک قسم کے دیوتا تھے جو پہلے ہمیشہ تھوڑا سا دلار پیار کر کے ہم کو گھر پر چھوڑ جاتے تھے — اب ان ہی پر ہم کو کھلانے، پہنانے، نہلانے، دھلانے اور بہلانے کی ساری ذمہ داری تھی۔ پاپا جی ہم لوگوں کو بہلانے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتے تھے کہ جن میں پیسہ بالکل خرچ نہ ہو۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ مثلاً وہ مجھے اور گنیش دونوں کو ہر سنڈے کے بازار جاتے جہاں اس وقت ہم پھیری والے ہو جاتے اور ہر جگہ سے

اپنا اپنا فرض پورا کرتے — بنئے کے یہاں سے گڑ کی ڈلیاں، کنجڑے کی چھابڑی میں کوئی سیب یا آم، حلوائی کی دوکان سے برفی یا قلاقند۔ چونکہ بابی کافی باشعور آدمی تھے اس لیے دوکاندار لوگ خوشی سے ہمیں یہ دانے چراتے تاکہ وہ رشوت نہ معلوم ہو اور میرے ابا جب تک بازار میں رہتے ایسا ظاہر کرتے گویا وہ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ جب بازار پیچھے چھوٹ جاتا تو وہ ہم سے بچے کو مٹھائیوں کو قاعدے سے رومال میں باندھ لیں اور اس میں سے تھوڑی سی بچا کر "چیز" والے بھی ہیں۔ کہ وہیں تک گھر اور پروسوں میں کھائی جائے۔ جب افسروں کی میس کے اسٹور روم کا معائنہ کرنے جاتے تو ہم لوگوں کو ضرور ساتھ لیجاتے اور جب اسٹور کا کلرک ہماری جھولیوں کو چاکلیٹ، لیمن ڈراپ اور پیپرمنٹ سے بھرتا ہوتا تو وہ جان بوجھ کر کسی اور طرف دیکھنے لگتے۔

ویسے تو انھوں نے ہمیں یہ سکھایا تھا کہ کوئی بھی کوئی چیز دے تو لینے سے پہلے تین بار انکار کریں۔ لیکن یہ قاعدہ کبھی کبھی توڑ بھی دیا جاتا تھا۔ مثلاً جب بوڑھا خانساماں اللہ بخش، جس کی لمبی سی سفید داڑھی تھی، ہم لوگوں کے لیے کیک کا یا میس کے تنور سے گرم گرم تازی ڈبل روٹی لاتا — میری اماں ہمیشہ احتیاط کرتی۔ حتیٰ کہ گائے کا گوشت کھانے والے مسلمانوں اور عیسائیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی کھانے کی چیزیں نہ کھائی جائیں مگر بابی اس کو چٹکیوں میں اڑا دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ہم کو ان چیزوں کی چاٹ لگ گئی تھی اور بازار یا میس میں ہر ہفتے پھیرے ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہفتے میں دو بار بھی!

صرف یہی نہیں، میرے دل میں اور بھی اونچی آرزوئیں تھیں۔

مثلاً یہ کہ ایک دن کپتان اوٹن صاحب ، باباجی کو راکل کے میدان لے جانے کے لئے بگھی میں بیٹھ کر جا رہے تھے ، دروازے تک آنے والے تھے تو میرا بھی جی چاہنے لگا کہ باباجی کے ساتھ میں بھی بگھی میں بیٹھوں ۔ پھر پرشی کے ساتھ ایک بار میں ہال دیکھنے گیا تھا اور وہاں میں نے صاحب لوگوں کو جھاگ دار شربت پیتے دیکھا تو میرا دل بھی چاہنے لگا کہ میں بھی پیوں ؛

باباجی کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ میں بھی جاؤں ۔ ان کا خیال تھا کہ صاحب کو اچھا نہیں لگے گا لہٰذا انھوں نے کہا کہ میں یا تو پرشی کی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ کر آؤں یا پھر پیدل پرشی کے ساتھ آؤں ! میں نے بڑی مسکینی سے باہر قریب ہی کہا کہ مان گیا ہوں ۔ مگر چپ کر کے ایک موڑ پر بیٹھ رہا جہاں سے اوٹن صاحب گزرنے والے تھے ۔ پھر جب صاحب فٹن چلاتے گزرے تو میں نے ہاتھ اٹھا دیا ، جس کے معنی تھے کہ میں بھی ساتھ چلنا چاہتا ہوں ۔ اوٹن صاحب نے اپنے سائیس کو حکم دیا کہ مجھے اٹھا کر پچھلی گھوڑی کی پیٹھ پر بٹھائے ۔ غالباً انھوں نے یہ مذاق میں کہا تھا ، یہ آزمانے کے لیے کہ میں ڈرتا ہوں یا نہیں ۔ جب میں نے ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا تو انھوں نے مجھے اٹھوا کر اپنے سامنے والی سیٹ پر بٹھا لیا ۔ میرے باباجی جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو وہ مجھے وہاں موجود اور صاحب کا کمبل اوڑھے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے ! پھر گھر سے لے کر میدان تک راستے بھر وہ صاحب سے گٹ پٹ کرتے رہے جو ان کو میری شرارتوں کا حال بتاتے تھے ۔

اور مجھے اس شان سے صاحب کی بگھی میں بیٹھا دیکھ کر رجمنٹ کے تمام

آپس میں گھسر پھسر کرنے لگے۔ جب میچ کے بعد مجھے ایک بوتل لیمونیڈ ملی۔ جبکہ اور
جو میں نے اکیلے ہی پوری بوتل پی لی ۔۔۔ تو مجھے میری فتح بالکل مکمل ہو چکی تھی!

اب گنیش جب کبھی مجھے، دوسرے لڑکوں کے ساتھ پیدل ہاکی میچ دکھانے کے لیے لے جانے کی کوشش کرتا تو میں اسے حقارت سے ٹھکرا دیتا تھا۔ اور اگر والٹن صاحب، اس دن میچ دیکھنے نہ جاتے ہوتے تو پھر صرف جرنیل کی پیشکش قبول کرتا تھا کہ وہ مجھے سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر لے جائے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر بھی میں سپاہیوں کے ساتھ ٹرک میں جانا زیادہ پسند کرتا تھا۔۔۔ ٹیم کے کپتان حولدار پورت سنگھ ایک بار جانے یہاں آئے تھے، جب میں نے ان سے دوستی کا ڈول ڈالا اور اس رشتے سے میں ان کے ساتھ ٹرک میں جایا کرتا تھا۔

مجھے ٹرک میں بیٹھنا بہت ہی بھاتا تھا۔۔۔ اور رفتہ رفتہ رجمنٹ کی ٹیم میں یہ عقیدہ پھیل گیا کہ جس دن میں پہلی بار ان کی ٹرک میں گیا، اس دن وہ لوگ بہت کامیاب رہے۔ میرا جانا نیک شگون ہوا تھا۔ چنانچہ میں مستقل ان کا مہمان ہو گیا اور ہر تقریب پر میری موجودگی ضروری ہو گئی! عجیب بات تھی کہ ایک طرف اگر اسی زمانے میں، میں نے گھر میں نحوست پھیلائی تھی تو دوسری طرف میں سورج دیوتا کا خاص الخاص بیٹا سمجھا جانے لگا۔۔۔ جو ہر وقت ہنستا ہنساتا تھا، نیک قدم تھا، جس کی حرکات سکنات میں تیزی اور پھرتی تھی اور جس کی زبان مسلسل چیں چیں کیے جاتی تھی۔

۱۴

میرا لاڈ پیار اتنا بڑھا کہ میری اتراہٹ کی کوئی حد نہ رہی۔ اب میرا جی چاہتا تھا کہ خوب باہر گھوموں، اور بابی کے دوست مجھے دیکھیں اور مجھے بہترین چیز سمجھیں۔ گھر میں پھر ریجنٹ کے سارے لڑکوں کے سامنے خوب شیخی بگھار سکوں کہ میں بھی کیا ہی شاندار نواب ہوں۔ کیونکہ ریکٹر چھوٹے ہونے کی وجہ سے یہ لوگ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور مجھے اپنے ساتھ کھلانے سے انکار کرتے تھے۔

البتہ ریجنٹ والوں کے لاڈلے کی حیثیت سے مجھے ایک نقصان بھی تھا اور وہ یہ کہ مجھے ہر وقت باقاعدگی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جگ پہ روں والے کھلونے کی طرح اٹھنا بیٹھنا سکھایا جاتا تھا۔ پھر یہ امید کی جاتی تھی کہ باقی وقت میں خاموش رہوں، چپکا بیٹھوں، پڑوں جلوں نہیں جیسے کوئی بہت ہی پیاری سی اور ملاری گڑیا۔

بہرحال مجھے اس پیار میں اتنا مزا آنے لگا تھا کہ روز صبح اٹھ کر میں بابی اور اماں سے پوچھتا تھا: "آج میں کہاں جاؤں گا؟" وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے۔ دل میں تو وہ پرانے وقتوں کے والدین کی طرح لطف لیتے ہوں گے کہ پھر سے ان کا بچپن ہی آ گیا اور وہ اس کا مزا اٹھا سکتے ہیں، لیکن وہ میرے فضول سوالات کو گول کر جاتے —— کیونکہ ماں باپ یا بڑوں کا سامنا جب کسی شیطان بچے سے ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ یہی کرتے ہیں!

ریجنٹ بازار کے پاس اور سڑک کے پار، آگے بیچ دیکھتے جاتا اور

گھومتا جوں جوں بڑھتا گیا، میری نظروں کے سامنے، سڑک کی حد سے آگے،
نئے نئے عالم وا ہونے لگے جنھیں مجھے فتح کرنا تھا۔ اس لیے میں یہ سب کچھ
اور دھیان ہر طرف ہر جگہ کے بارے میں اور بھی شدت کے ساتھ سوالات کرنے لگا
میں نے اپنے آنگن میں بیٹھی عورتوں کو گپ شپ کرتے سنا تھا کہ لاہور کے اندر
اور لاہور کے چاروں طرف بڑی خوبصورت جگہیں ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔
میں ان جگہوں کے ناموں کو اپنی زبان پر دہراتا رہتا تھا کیونکہ ان ناموں میں
بڑی مٹھاس تھی — شاہ عالمی دروازہ، شاہدرہ، نیلا گنبد، انار کلی، شالامار،
شیش محل وغیرہ۔

لیکن میں ان جگہوں میں سے کسی جگہ بھی نہیں لیجایا گیا۔ اور میرا تصور
کوشش کرنے کے باوجود بھی، ان مقامات کے شاندار حسن کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا۔

ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے ایک ہی منظر رہتا تھا، ایک چمکیلا دودھیا
رنگ، دلفریب تصویریں جیسے چاندنی لالٹین ہو یا جیسے دھوپ کی روشن صحرا میں پھیلی
ہوئی، کسی بھینسے کو ایک ہی طرح کی ہر جگہ سے نظر آئے۔

میرا خیال ہے کہ میرے باجی اور اماں دو ایک بار گھومنے کے لیے چپکے
سے شہر چلے گئے، مجھ سے جھوٹ بہانہ بنا کر کہ رشتے داروں سے ملنے جا رہے ہیں۔ بابا
میں نے کبھی انھیں اس بات کے لیے معاف نہیں کیا کہ وہ مجھے ساتھ نہیں لے گئے۔
اماں نے تو "جہیز" والے تھیلے میں سے کچھ پھل یا مٹھائیاں دے کر ہمیں منا لیا، اور
باجی نے وعدہ کیا کہ جب انھیں دفتر سے کافی لمبی چھٹی ملے گی تو وہ ہندوستان کی
مختلف یاتراؤں پر جائیں گے اور ہمیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔ ان کے اس بیان نے

پر اماں کی آنکھیں ایک مخصوص قسم کی مسرت سے چمک اٹھتیں۔ مگر بات یہ ہے یہ وعدہ
بے معنی تھا۔ میں بار بار باجی سے ضد کیے جاتا کہ میں تو نارنگی اور شاہیار دیکھوں گا
اور اس مزے سے ان چیزوں کا نام لیتا کہ باجی کو بھی بڑا لطف آتا اور وہ مجھے
آسمانوں تک لیجانے کے وعدے کرنے لگتے۔

پھر میں خوش ہو کر خوب ناچتا پھرتا۔ اچھلتا اور گول گول چکر کھاتا یہاں تک
کہ باجی مجھے یہ کہہ کر چھپڑیاں کھانے سے روک دیتے اور کہتے کہ یہ حرکت بہت
بُری ہے۔ یہ تو صرف شادی والے کے چوبے کرتے ہیں جو احمق اور بے عقل
ہوتے ہیں۔

ایک دن باجی نے یہ ایک اعلان کیا کہ وہ ہم سب کو ایک بہت بڑی
نمائش میں لے جائیں گے جو لاہور میں لارنس گارڈن کے منٹگمری ہال میں ہو رہی
ہے۔ بڑی بھاری تیاریاں ہوئیں۔ اماں نے میری آنکھوں میں کاجل لگایا اور مجھے
نظر بد سے بچانے کے لیے سیاہی کا ایک ٹیکا ماتھے پر بھی۔ اچھے اچھے کپڑے
پہنائے — مگر قیمتی چیز کوئی اس ڈر سے نہیں پہنائی کہ کہیں چوری نہ ہو جائے
پھر ہم سب تھن میں لد کر نمائش کے ہال میں پہنچے جو ایک باغ کے بیچوں بیچ میں
تھا — باغ پھولوں، بیلوں اور سایہ دار درختوں سے بھرا ہوا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ نمائش بھر میں جو چیز مجھے آج تک یاد ہے وہ ایک
بڑا سا جوتا تھا۔ اتنا بڑا جوتا میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک
بڑے کمرے میں، ایک اونچے تخت پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس جوتے میں گنیش کے
ساتھ آ رہا گیا، اور مجھے یاد ہے میں نے اس حماقت پر واحد قہقہے لگائے

کے لیے اپنے بھائی کو دھکا دے کر الگ رکھنے کی کوشش میں جھگڑا کیا۔ آخر کرزن فورٹ کی بارکوں سے ۔۔۔ اس نمائش میں آنے اور اس حسین دنیا کو دیکھنے کے لیے سب سے زیادہ شدید تڑپ مجھے ہی کی تھی!

باقی مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ بڑے بڑے کمروں میں سے گزرے تھے جہاں جا بجا الماریوں میں عجیب عجیب طرح کے نوادرات رکھے ہوئے تھے جن کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے میں بار بار اُٹھتا رہتا تھا۔ یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ وہاں اپنی بارک کے بعض سپاہیوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میری ماں نے کہا تھا کہ ان سپاہیوں کی آنکھیں حیرت کے مارے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ بھلا کو اللہ دو، جو شیار ہو کے جیسے یادوں میں ان لوگوں نے بھی لاہ کے کو یہ سب دیکھا ہوگا۔

پھر باغ میں، اپنی ماں کی گود میں پڑے پڑے، میں نے برف والی قلفی کھائی۔ اس کا مزہ بھی میں اپنی زبان پر محسوس کر سکتا ہوں۔

قلفی والا ٹین کے گھڑے میں ایک ڈنڈا ڈالتا جو اس کے پاس ہی رکھا تھا۔ فرمائش کے مطابق جست کی بنی ہوئی بڑی یا چھوٹی قلفی نکالتا، اس ڈنڈے کو گھماتا جس سے قلفی کے منہ پر ڈھکنا بند ہوتا، پھر ہاتھ سے قلفی کو اس طرح سہلا دیتا جیسے بکری کے تھن سے دودھ نکال رہا ہو ۔۔۔ اور پھر قلفی کی برف ایک پتوں کی کٹوری میں آ پھسل آتی۔ وہ برف پر تھوڑا سا فالودہ ڈالتا، چاندی کے گلاس نما برتن میں سے چند قطرے عرق گلاب کے اس پر چھڑکتا اور گاہک کے سامنے پیش کر دیتا۔ آہ! قلفی والے کی صدا سن کر آج بھی کس طرح دل اچھل پڑتا ہے! اس کا مزہ، اس قلفی کے مقابلے میں بہترین ولایتی آئس کریم، کوکا کولا وغیرہ

لگی ہوئی آئس کریم بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اسے دیکھ کر منہ میں پانی نہیں بھر آتا۔ اس طرح کا شوق اور ہوس دوسری کوئی چیز نہیں پیدا کر سکتی۔

بعض سپاہیوں نے کہا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ چڑیا گھر دیکھنے بھی گئے تھے اور وہاں جو جانور ہیں وہ بچوں کے دیکھنے والے ہیں۔ اب تو میں نے ضد پکڑ لی اور کسی بات سے نہیں مانتا تھا بس یہی کہے جاتا تھا کہ چڑیا گھر کے جانور دیکھوں گا۔

اماں نے بڑی حقارت سے کہا کہ یہ سپاہی جائیں چڑیا گھر اپنے بچا لی بیٹا [?] ان کو دیکھنے۔ بھلا ہمیں وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ ابا نے کہا کہ صاحب تو دیکھنے میں تنگ ہی بہت جائیں گے، دیر بھی بہت ہو گئی ہے مگر انھوں نے وعدہ کیا کہ پھر کسی دن ضرور آئیں گے۔ اس وعدے پر میں نے زمین سے اُٹھنے کا ارادہ کیا [?] پچھاڑیں منہ کے بل لوٹ رہا تھا اور چڑیا گھر جانے کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ پھر ذرا میری گردن میں گدگدی سی لگی اور میں ہنسنے لگا ـــــ ایسی خوشی ہوئی جیسے میں آسمان پر پہنچ گیا ہوں۔

۱۳

میں اپنے ابا سے وعدہ منوا کر ہی رہا۔ چنانچہ ایک دن صبح ہم لوگ تانگہ [?] چڑیا گھر دیکھنے کے لیے جلدی میں تیار ہو کر روانہ ہوئے۔ میری اماں کا پیٹ اب کافی بڑا ہو گیا تھا اور وہ مجھ کو گود میں نہیں بٹھا سکتی تھیں۔ اس لیے میں ضد کر کے کوچوان کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا جو ذرا اونچی ہوئی تھی اور جس پر سے میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

ہم لوگ اس سڑک پر روانہ ہوئے جس پر جانا میرے لیے منع تھا، جو ہمارے
گھر کے سامنے سے گزرتی تھی اور جس کا گھیر پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی پار ہی نہیں
کیا جا سکے گا، جس پر اونٹوں، خچروں، تانگوں اور بگھیوں کا لامتناہی سلسلہ
ہمیشہ چلتا رہتا تھا ــــ اب میں اس سڑک پر چل پڑا تھا: فٹن چلانے والا
کوچوان بڑا شاندار راجپوت تھا، اس کے دو حصوں میں بٹی ہوئی داڑھی تھی اور
اس نے مجھے بتایا کہ نہر تک ہم جس سڑک پر آئے تھے وہ گرانڈ ٹرنک روڈ کہلاتی
تھی اور اس کے بعد جس سڑک پر چل رہے تھے اس کا نام ٹھنڈی سڑک تھا۔

نہ جانے کیوں اس سڑک کے ماحول کے ساتھ مجھے لفظ "ٹھنڈی" زیادہ
پسند آتا تھا اور لفظ "مال" نہیں۔ اچھا لگتا تھا جو میں نے بعد میں جانا کہ یہ سڑک
دونوں طرف گھنے پیڑوں کے درختوں کی چھاؤں سے اس سکون کا احساس ہوتا
تھا جو درختوں کے سائے میں حاصل ہوتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف بنے
ہوئے بنگلوں کے باغوں سے جو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تھے وہ اس
آرام اور سکون کا پتہ دیتے تھے جو ان بنگلوں اور باغوں کے مکینوں کو حاصل تھا۔

جیسے جیسے ہم چڑیا گھر کے پاس پہنچ گئے، میرا جوش اور اس وقت
بڑھنے لگی۔ چوراہوں پر تو خاص کر زندگی ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چڑیا گھر
تک پہنچتے پہنچتے میں خوشی کے مارے تقریباً مدہوش ہو چکا تھا۔ سیٹ
پر بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہ ڈر ختم ہو چکا تھا کہ اتنے اوپر سے کہیں گر نہ
پڑوں۔ ابا جی نے مجھے اتارا، اپنی انگلی مجھے پکڑائی اور دوسرے ہاتھ سے
ٹکٹیں ہاتھ پکڑا۔ پھر ہم بڑے پھاٹک سے داخل ہو کر چھوٹے چھوٹے

راستوں اور روشوں پر چلنے لگے جن کے پاس لگے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان جانوروں کے کٹہرے اور پنجرے تھے۔ اف وہ کتنے جوش سے میں نے "اپنی برادری والوں سے" ملاقات کی۔ کیونکہ میرے ابی جنگلی جانوروں کو یہی بھائی بند کہہ رہے تھے۔ آہ — وہ حیرت بھری گھڑیاں، وہ تعجب کی ساعتیں!

میرے والدین کو سب سے زیادہ تعجب تو اس بات پر ہوا کہ میں نہ تو شیروں اور چیتوں کے دہاڑنے سے ڈرا اور نہ دوسرے بچوں کے ساتھ ہونے میں ہاتھی پر چڑھنے سے گھبرایا۔ اسی طرح میں نے بندروں کو اپنے ہاتھ سے مونگ پھلی کھلانے میں بھی کچھ خوف ظاہر نہیں کیا۔ وہاں مونگ پھلیاں لے گئی تھیں تاکہ بندروں کو کھلائیں کیونکہ ہنومان جی کی فوج کے سپاہی تھے!

بندروں کے ایک گروہ میں ایک بندریا جٹی اپنے بچے کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی، اور بندر اس کے پیچھے بیٹھا بندریا کے سر میں جوئیں دیکھ رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے بڑا لطف آیا کیونکہ سپاہیوں کی بارکوں میں، میں نے جوانوں کو بھی اسی طرح قطار میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی جوئیں صاف کرتے دیکھا تھا۔

گوریلوں کو دیکھ کر میں تھوڑا سا ضرور ڈرا تھا، کیونکہ وہ انسان سے ملتے جلتے بھی تھے اور پھر بھی ایسے مختلف تھے! وہ اپنا آگے کا دھڑ جھکائے ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں پر چلتے، پنجے پھیلائے، سامنے کی طرف گھورتے ایک پنجرے سے دوسرے میں جاتے اور سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے تو ایسا لگتا کہ بس اب چڑھ بیٹھیں گے!

"ابی — کیا جانور بھی بات کرتے ہیں؟" میں نے ابی سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا ان لوگوں میں بات کرنے کی قوت نہیں ہے ۔ بس تم سے بات کرتے ہیں تمہاری طرح گٹر گٹر۔"

"تو کیا تم سے ہم لوگوں کی سی بولی بولتے ہیں ۔ بابا جی!" میں نے پھر پوچھا

"ہاں بول تو لیتے ہیں ___ پر وہ مجھے نہیں کہ کیا رٹے جاتے ہیں۔"

میں اس جواب پر بہت بگڑا یا ۔ میرے بھیجے بچارے دماغ میں الجھن سی ہوئی کہ میں چاروں طرف سے ایک جال میں گھرا ہوا ہوں اور بے اختیار جی چاہا کہ جو کچھ میں نہیں جانتا وہ سب کچھ مجھے معلوم ہو جائے ۔ مجھے جو جو باتیں تھے ان سے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا اور میں خیالی باتوں کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور تصورات بناتا رہتا تھا ۔ دماغ میں عجیب عجیب شکلیں صورتیں بنتی تھیں جو گٹھڑ کی طرح سر پر جمع ہوتی جاتی تھیں ۔

پھر میں نے ایک ہی گروہ کا اندازہ دیکھا ۔ ایسا کہ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا ۔

ایک کمرے میں لگتا وہ اپنے بچوں کو پیٹ کی تھیلی میں لیے بیٹھے تھے وہ ابھی حقیقت معلوم ہوئے ۔

بھالو تو پرانے دوست تھے ___ وہ دوست جنہیں میں نے مداری کے ساتھ ناچتے دیکھا تھا ۔

خوش قسمتی اور اس کے ننھے ننھے بچوں کو دیکھ کر میرا جی چاہا انھیں پیار کروں اور بچوں میں ان چوزوں سے تو مجھے بہت ہی محبت تھی خاص کر اس عجیب اور پیارے طریقے کو دیکھ کر جس سے وہ اپنے منہ کا دانہ اپنے بچے

بچوں کے منہ میں ٹھونس رہی تھیں، پنجرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اڑ رہی تھیں۔ اور پھر زرد زرد کناریاں اور چڑیاں جو درختوں میں جا بجا ٹنگی ہوئی تھیں، اور ان کے ساتھ جھوم جھوم کر میں اپنا سر ہلانے لگا۔

چلتے چلتے میرا جسم درد کرنے لگا اور دیکھتے دیکھتے ہی تھکن ہونے لگی تو میری اماں نے بابی سے کہا کہ مجھے گود میں اٹھا لیں ۔۔۔ مجھے اپنی اماں اس وقت بہت ہی حسین لگیں، ان کا زرد چہرہ بہت ہی پیارا لگا، جب وہ مجھ پر جھک کے بولیں کہ کیا تم بہت ہی تھک گیا ہوں، کیا گود میں آنا چاہتا ہوں؟

میں اکڑ کے ساتھ چلتا ہی رہا ـــــ جانوروں کو دیکھتا رہا اور اس عجیب و غریب پرانے پیپل کے درخت کو جس کی شاخیں بہت سے پنجروں پر سایہ کئے تھیں، قمریوں کی چیں چیں کرتر کر، فاختاؤں کا کنجوں میں کو کو کرنا، کوئل کا وہ گیت جو میرے لیے مانوس اور جانا پہچانا تھا، یہ سب سنتا رہا اور ہرگز نہیں کہا کہ مجھ اس زمانے میں آنکھوں میں ایک ایسا نور تھا جس کی روشنی بجھتی ہی نہ تھی، جسم میں ایسی قوت تھی جیسے جوالا مکھی ہو جو ابلتا ہی چلا جائے۔

بابی کو احساس ہوا کہ چڑیا گھر کے لمبے لمبے راستوں پر چلتے چلتے میں ضرور تھک گیا ہوں گا، چنانچہ میں کہتا ہی رہا کہ میں بالکل نہیں تھکا ہوں مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور مجھے گود میں اٹھا لیا۔ پھر وہ سمجھ گئے کہ میرے دماغ میں اس وقت بڑی اتھل پتھل ہے اور اس سوال سے گھبرا گئے جو میں بار بار پوچھے جا رہا تھا ـــــ کیا میں بھی یہاں آکر اپنی بہادری والوں کے ساتھ رہ سکتا ہوں ـــــ چنانچہ انھوں نے مجھ سے ایک کہانی کہنی شروع کی۔

"دیکھو ۔۔۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جنگل کے تمام جانور اور سب چڑیاں ایک بڑے سے میدان میں جمع ہوئیں، اور شیر نے جو کہ جنگل کا بادشاہ ہے ان سب کو بتایا کہ آدمی جنگل میں رہنے کے لیے آیا ہے اور وہ یقیناً ان سب کو نگل جائے گا اگر وہ سب اس کو پہلے نگلنے میں چوک گئے۔"

"لیکن وہ کیوں ان سب کو نگل جاتا ہے؟" میں نے پوچھا! مجھے لفظ "نگل" بہت پسند آیا۔

"کیونکہ انسان جانوروں کو بندوق سے مار سکتا ہے اور ان کی جان نکال کے اس طرح ان کو نگل سکتا ہے جیسے تم ٹافی کو چبا ڈالتے ہو اور نگل جاتے ہو۔"

اب مجھے لفظ "نگل" کی گھن گرج سے ڈر لگنے لگا۔ لیکن ہمت کر کے بولا۔ "ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"تو پھر یہ ہوا کہ آدمی پہلے ہی سے جنگل کے بادشاہ کی باتیں سُن رہا تھا تو اس نے بندوق نکالی اور تمام جانوروں کو گولی سے اڑا دیا ۔۔۔ تو تم اگر یہاں آنا چاہتے ہو تو پہلے تمہیں اپنی بندوق لانی پڑے گی ورنہ سب جانور مل کر تمہیں نگل جائیں گے۔"

میں ایک دم سے رونے لگا۔ اماں جھڑکنے لگیں: "بھئی ۔۔۔ کیوں نے ایسی کہانیاں سُنا سُنا کے ڈراتے ہو۔"

ابا ہنسنے لگے اور مجھے چپ کراتے ہوئے بولے: "اچھا اچھا ۔۔۔ بیٹا، اب تجھے نہیں ڈراؤں گا۔"

میں نے خربوزے کا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال لیا۔ ابا جی کی گردن آہستہ
آہستہ چلتے ہوئے، ان کے دانتوں میں جکڑے سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا لگنے لگا
کہ سامنے پھیلے ہوئے باغ میں نہیں ہوں بلکہ بچپنے کا وقت ہے اور کسی گھنے جنگل
کے کنج میں ہوں۔ چاروں طرف سجتے ہوئے، رستوں پر آتے جاتے ہوئے مرد
اور عورتیں، ایک ریشمی، رنگین، پانی کی چادر کی طرح بہتے ہوئے معلوم ہوتے
تھے لیکن میرے کانوں میں جانوروں کے کراہنے، چیخنے اور قہقہوں کی آوازیں
کے سوائے کچھ نہیں سنائی دے رہا تھا۔ اپنا وجود مجھے ہوا کی طرح ہلکا لگ رہا
تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی طرف اُٹھتا چلا جا رہا ہوں۔ پھر شام
کا اندھیرا مجھ پر طاری ہونے لگا اور دھیرے دھیرے آنکھیں بند ہونے لگیں
یوں لگنے لگا کہ ابا جی کی مدھم گنگناہٹ کے ساتھ ساتھ میں آسمان کے
تارے کی طرح اونچا ہوتا جا رہا ہوں اور افلاک سے پرے ایک نئی ایک اجنبی
بستی کی طرف اُٹھتا جا رہا ہوں۔

۱۵

مجھے یاد نہیں کہ ہم ٹھیک ٹھیک کب میاں تابیہ سے روانہ ہوئے
تھے مگر اتنا یاد آتا ہے کہ اس وقت جھٹ پٹی رواگی کی تیاری کر رہی
تھی ـــ اس کا ڈھیروں سامان، کھچڑ پچڑ بھولی کاڑیوں میں لادا کر لا رہا
کنٹونمنٹ کے اسٹیشن سے جایا جا رہا تھا اور میں گھنٹوں سڑک کے کنارے
کھڑا، اس شاہراہ پر اور وقت کے اس شاہ نشیں رستے ہوئے سمندر کو

حیرت سے تکا کرتا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ بعض معمولی تاثرات بڑی شدت کے ساتھ انسان کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتے ہیں، پھر تخیّل ان کو ایسی شکل دے دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سڑک کا بھی یہی ہوا۔ میرے تصور میں یہ پہلی یاد اسی کی ہے۔ اور جب ہم نے میاں میر کو چھوڑ بھی دیا تب بھی اور اس کے بعد سے آج تک وہی سڑک میری سب سے گہری اور واضح یاد ہے۔ میں ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کر کے اس سڑک پر اڑتے ہوئے ایک ایک ذرّے کو دیکھ سکتا تھا جو گاڑیوں، اونٹوں، بکریوں، گھوڑوں اور انسانوں کے قافلے کے چلنے سے اڑا کرتے تھے۔ بیچ میں ابھرا ہوا اس کا وہ حصہ جو بیچ بیچ میں دھوپ کی طرح جلا کرتا تھا، مجھے نظر آتا ہے اور اس کے دونوں طرف سے چلتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جہاں نیم کے درخت نرم آرام چھاؤں کے ساتھ ہوتے اچھے تھے۔ آج تک مجھے اس زندگی کے آثار کا احساس ہوتا ہے جو اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُبلتی چلی جاتی تھی۔ اس سب کے علاوہ میرے سننے سے ذہن کی سطح پر وہ کہانیاں اور داستانیں رقص کرتی جاتی تھیں جو میری ماں نے مجھے سنائی تھیں ان لوگوں کے بارے میں جو اس سڑک پر کبھی کسی زمانے میں گزرے تھے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ سورج دیوتا اس طرف سے ہو کر دنیا میں آئے تھے۔ پھر جب ان کے آنے سے زمین خشک ہو گئی تو بارش کے دیوتا نے پانی برسایا، پھر دنیا اُن کے دیوتاؤں نے اس سڑک کے آس پاس کی جگہ اپنا ڈیرہ جمایا۔

اور پھر ہواؤں کے دیوتاؤں نے بھیجے ہوئے، پھر راجے، بادشاہ اپنے رتھوں پر سوار اس سڑک پر سے گزرے۔ کورو، پانڈو، رام، کرشن، سکندر، وکرما بکرماجیت اور اکبر بادشاہ، ہندوستان کے مقدس مقامات کی یاترا میں گئے ہوئے بہت سے سادھو، اولیا اور فقیر گزرے ایسے رشی جیسے والمیک اور ایسے گرو جیسے نانک اور جگت گرو، مغلوں کی فوجیں کوچ کرتی ہوئی گزریں، سکھ بادشاہ رنجیت سنگھ اور اس کے سپہ سالار ہری سنگھ نلوہ — ان سب کے بعد فرنگیوں کی فوجیں آئیں — جن میں چار، پانچ وغیرہ رجمنٹ بھی شامل تھیں — لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کرتی ہوئی یہ فوجیں، سرجنٹوں اور حوالداروں کی کمان میں چلتی ہی چلی گئیں.... مجھے اپنی نگاہوں سے یہ کہانیوں کے لوگ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وہ بادلوں میں بنتے بگڑتے دیو اور بھوت جنہیں میں آنگن میں سوتے وقت آسمان پر منڈلاتے، بنتے بگڑتے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ مافوق ہستیاں یوں نظر آتیں جیسے ان کے سر کدو کی طرح یا گاجر کی پنڈی کی طرح ہیں۔ اور میں تصور میں حیران، پلک جھپکے بغیر ان کو تکتا ہی رہتا۔ اس سڑک پر سے جو لوگ گزرے تھے ان کا تصور کرتے وقت میرے تخیل کا نہ کوئی معیار ہوتا تھا نہ کوئی حد سوائے اس کے کہ پانچ سال کی عمر تک میں نے جو دیکھا یا سنا تھا اس سب کو ملا کر ان شخصیتوں کے چہروں کی تصویریں بنتی اور مٹتی رہتی تھیں — پھر بھی یہ مزہ کیا کم تھا کہ یوں کہ میری تصورات کی دنیا میں کسی قسم کی الجھن یا پیچیدگی نہیں تھی۔

اس لیے کہ جب بڑوں کی بات چیت میں سے بیچ بیچ کے حصے سن کر

تمام حقیقتوں پر غور کیا کرتا تھا یا پھر اس وقت جب میں باغ میں کنوئیں کے پاس
کھیلا کرتا تھا اور ان دیویوں کی دھن پر جو اس نے مجھے سنائی تھیں سلطنتیں بنایا
اور انھیں غارت کیا کرتا تھا۔ اور سڑک پر کسی کے قدموں کی آہٹ میرے محبوب
کے گیت کو بند نہ کر سکتی تھی اور نہ میری ماں کی آواز "کرشنا، کہاں ہے تو ادھر"
اس میں خلل ڈال سکتی تھی، اور نہ رام دین مالی کی ڈانٹ ڈپٹ کر ترکاریوں کے
پودوں کو خراب نہ کروں، اسے روک سکتی تھی، نہ بابا جی کے چٹکیاں بجا کر مجھے
ہنسانے کے اشارے مجھے منع کر سکتے تھے۔ ایسا تھا گویا مجھ پر سڑک کا زبردست
جن سوار ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان تمام جن بھوتوں کا قبضہ بھی مجھ پر
ہو جو سنی سنائی کہانیوں اور قصوں سے نکل کر، یا گھر یا آپس میں جو خیال
بات چیت کو چپکے چپکے سن کر میرے ذہن میں کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر گئے تھے۔

اور اس غور و فکر کا اثر اتنا گہرا تھا کہ راتوں کو میں ایسے خواب دیکھتا
جن میں میرا مردہ بھائی پرتھوی بہت نمایاں ہوتا تھا۔ اور ایک دوسرے سے
ڈرتے ہوئے دیوؤں کے ڈراؤنے خواب دیکھ کر میری آنکھ کھل جاتی اور پسینہ
چھوٹنے لگتا! یا پھر میں سوتے میں بڑبڑاتا۔

باہر صحن میں تیاریاں ہو رہی تھیں تو شہر و کنٹونمنٹ جانے کے لیے،
اور سڑک چلتی رہی، گویا کبھی سے بھری ہوئی، دھول میں اٹی ہوئی اور بھاری
بوٹوں اور ہندوستانی چہروں سے روندی جاتی رہی، اور کسی نے اس
کی عزت کی نہ پرستش، ہر ایک نے اسے نظر انداز کیا سوائے میرے جو اپنی
نے پر اس کی روانی کو دیکھتا رہا۔ جیسے یہ سڑک مجھ میں اور میری ارد گرد کی

اس ساری دُنیا میں، جو میلوں تک غیر معروف اور انجانے دیسوں تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی حدوں کا تعین میرے دماغ نے کیا تھا... حیرت کی آگ میرے منہ میں تھی۔ میں وہاں کھڑا ہوا تھا اور میری آنکھیں اس بے انتہا تعجب کے مارے پھٹی پڑ رہی تھیں، جو بعد کو اچھی چیزوں اور حسن کی ہوس اور لالچ کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان دنوں اپنا مالک میں آپ تھا، اپنے عجیب غریب تصورات اور ان سے بھی زیادہ عجیب و غریب کی رنگا رنگ سلطنت کا سب سے بلند و برتر حکمراں!

UNIVERSITY LIBRARY
20 JUN 1963
ALIGARH

وہ دریا

"...... دریاؤں کی طرح جو پرانی حدوں اور نشانوں کو توڑ ڈالتے ہیں، بستیوں اور قصبوں اور انسانوں کو اپنی طوفانی لپیٹ میں لیکر تباہ کرتے چلے جاتے ہیں، اور ان علاقوں کو، جو پہلے بنجر پڑے تھے، سیراب کرکے، زرخیز بنانے کے لیے بہاؤ کے نئے راستے نکالتے ہیں اور ادھر ادھر زرخیز مٹی کی پانچ پانچ انچ کی تہیں بچھا جاتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو زمانے کو برا کہا جاتا ہے اور سراہا جاتا ہے۔ لیکن ان دریاؤں کی حرکتوں کو قہر اور جبر پر محمول کرلیا جاتا ہے اور ان کی روش کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے....."

—— نامعلوم

۱

نوشہرہ چھاؤنی میں اپنے کوارٹر کے برآمدے میں گرمیوں کے ایک دن سہ پہر کو میری اماں چرخہ کات رہی تھیں اور میں ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا: "اماں میں تمھیں کہاں ملا تھا؟ میں کہاں سے آیا تھا؟"

اماں نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر وہ مسکرانے لگیں۔ پھر انھوں نے اپنے ہونٹوں کو گول کر کے کچھ مذاق میں کچھ سنجیدگی سے پریوں کی کہانیاں سنانے کے انداز میں مجھے سمجھانے کے لیے کچھ گڑھنے کی کوشش کی۔

"میرا چندا، تو میرے سینے میں تھا، بھید کی طرح چھپا ہوا۔ تو میرے جسم میں تھا، جیسے سیپی میں موتی ہوتا ہے نا، بس اسی طرح۔ تو تو میری عمر بھر کا ارمان ہے اور میں چاہ رہی تھی کہ میرا یہ ارمان پورا ہو جائے۔ میں نے تجھے بہتیرا ڈھونڈا، بڑی تلاش کی لیکن تو کہیں ملا ہی نہیں۔ تب میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ تو مجھے مل جائے۔ اور بھگوان تو تُو جان کہ بڑے دیالو ہیں نا، تو انھوں نے میرے لیے تجھے بنایا اور ہمارے پڑوس والے گھر کی ایک کوٹھریا میں تجھے رکھ دیا......"

"اماں بھگوان کو کس نے بنایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا مجھے نہیں پتہ، تیری والی جانتی ہوگی۔" اماں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ یوں وہ مسکرا تو رہی تھیں لیکن میرے سوال پر چونک سی گئی تھیں۔ پھر ان کا لہجہ پہلے ہی کی طرح جذباتی ہو گیا۔ اور کہنے لگیں۔ "تیری پری جیسی دھرم ماتا۔ بھگوان نے اسے ہمارے گھر بھیج دیا۔ اور اس نے کوٹھریا سے تجھے نکال کر میری گود میں دے دیا۔"

"میری پریوں جیسی دھرم ماتا؟ میری پریوں جیسی دھرم ماتا!" میں بچے ہی کی طرح سوچنے لگا: "اماں میری دھرم ماتا کہاں ہیں؟"

UNIVERSITY LIBRARY
28 JUN 1983
ALIGARH

حصہ دوم

وہ دریا

"..... دریاؤں کی طرح جو پرانی سرحدوں اور نشانوں کو توڑ ڈالتے ہیں، بستیوں اور قصبوں اور نشانوں کو اپنی طوفانی لپیٹ میں لیکر تباہ کرتے چلے جاتے ہیں، اور ان علاقوں کو، جو پہلے بنجر پڑے تھے، سیراب کر کے زرخیز بنانے کے لیے بہاؤ کے نئے راستے نکالتے ہیں اور اس طرح نئی زمینوں پر بھی نئی بستیاں بسا جاتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو شور برپا کیا جاتا ہے اور سراہا جاتا ہے۔ جب ان دریاؤں کی حرکتوں کو تسلیم اور محسوس کرلیا جاتا ہے اور ان کی روش کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے....."

—— نامعلوم

۱

نوشہرہ چھاؤنی میں اپنے کوارٹر کے برآمدے میں گرمیوں کے ایک دن سہ پہر کو میری اماں چرخہ کات رہی تھیں اور میں ان کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا: "اماں میں تمھیں کہاں ملا تھا؟ میں کہاں سے آیا تھا؟"

اماں نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر وہ مسکرانے لگیں۔ پھر انھوں نے اپنے ہونٹوں کو گول کر کے کچھ مذاق میں کچھ سنجیدگی سے پریوں کی کہانیاں سنانے کے انداز میں مجھے سمجھانے کے لیے کچھ گھڑنے کی کوشش کی۔

"میرا چندا، تو میرے جیسے میں تھا، بھید کی طرح چھپا ہوا۔ تو میرے جسم میں تھا، جیسے سیپی میں موتی ہوتا ہے نا بس اسی طرح۔ تو تو میری عمر بھر کا ارمان ہے اور میں چاہتی تھی کہ میرا یہ ارمان پورا ہو جائے۔ میں نے تجھے بہتیرا ڈھونڈھا۔ بڑی تلاش کی لیکن تو کہیں ملا ہی نہیں۔ تب میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ تو مجھے مل جائے۔ اور بھگوان تو تو جانتا ہے کہ بڑے دیالو ہیں نا، تو انھوں نے میرے لیے تجھے بنایا اور ہمارے پڑوس والے گھر کی ایک کوٹھریا میں تجھے رکھ دیا......"

"اماں بھگوان کو کس نے بنایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا مجھے نہیں پتہ، تیری دادی جانتی ہوں گی۔" اماں نے ویسے ہی کہہ دیا۔ یوں وہ مسکرا تو رہی تھیں لیکن میرے سوال پر چونک سی گئی تھیں۔ پھر ان کا لہجہ پہلے ہی کی طرح جذباتی ہو گیا۔ اور کہنے لگیں۔ "تیری پری جیسی دھرم ماتا۔ بھگوان نے اسے ہمارے گھر بھیج دیا۔ اور اس نے کوٹھریا میں سے نکال کر تجھے میری گود میں دے دیا۔"

"میری پریوں جیسی دھرم ماتا؟ میری پریوں جیسی دھرم ماتا؟" میں بچوں ہی کی طرح سوچنے لگا: "اماں میری دھرم ماتا کہاں ہیں؟"

"بیٹا وہ اپنے گھر چلی گئیں۔" میری ماں نے بتایا۔ "وہ سمندر پار، ولایت میں ہیں۔"

"میری پری جیسی دھرم ماتا! میری پری جیسی دھرم ماتا!" میں چیخ کے آہنی شکنجے سے کہیں، وہ اتنا دور بالکل بے خیال میں ہوتا بھی جا رہا تھا لیکن پھر بھی میرے دل میں کر دیا تھا اور میں نے اس طرح کہا جیسے میں ضد کر رہا ہوں کہ چلا جاؤں گا۔

"اماں، میں اپنی پری جیسی دھرم ماتا کو دیکھنا چاہتا ہوں!"

اماں نے میرا دھیان بٹانے کے لیے کہا: "اچھا ہو کے دیکھ لینا جب کل کلاں کو زُست رہا۔ ولایت جانا تو دیکھ لینا۔ اب جا کے سو جا، اور اگر نیند سے سونا نہ چاہتے ہو تو جا، جا کے کھیل۔"

میں اُٹھا اور اس طرح جیسے میں سونے جا رہا ہوں، آ کے ان کی گود میں بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بس ہر وقت ان کے ساتھ گھر میں چڑھا رہوں؛ چاہے وہ دال پکا رہی ہوں، چاہے کھا رہی ہوں، چاہے چرخا کات رہی ہوں۔ اور جب وہ گھر کے دوسرے کام کرتی ہوتیں تب بھی میں ان کی ساڑی کا پچھلا حصہ پکڑے ان کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چُپ چُپ ان کا منہ دھو پیار کروں اور سارے وقت انھیں چمٹائے رکھوں۔ لیکن پہلے کی طرح اب پھر ایسا لگنے لگا تھا کہ میرے چمٹے رہنے سے وہ چڑ جاتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کی وجہ میرا ننھا بھائی شیو ہے، جیسے کہ پہلے میرے بھائی پرتھوی کی وجہ سے ہوتا تھا، جو مر گیا۔ پھر اب میں بڑا بھی ہو گیا تھا، اس لیے

کو میں پانچ سال سے اوپر کا تھا۔ اور اب انھوں نے مجھے الگ رکھنے کے لیے اپنی
چھاتیوں پر مرچوں اور سرکے کا لیپ شروع کر دیا تھا۔ اور وہ تدبیر کارگر بھی
ہوئی تھی۔ لیکن مجھے گودی سے الگ رکھنے کا تو چارہ تھا نہیں، سوائے
خفا کرنے کے۔ کبھی کبھی وہ خفا بھی کرتیں لیکن زیادہ تر میرا لاڈ ہی کرتی تھیں۔
اور اس وقت جو انھوں نے مجھ سے سونے یا پھر جا کے کھیلنے کے لیے کہا تو میں
سمجھ گیا کہ وہ بالکل نہیں چاہتیں کہ میں کہیں کھیلنے چلا جاؤں، بلکہ وہ چاہتی
ہیں کہ ان کی گودی میں سو جاؤں، اس لیے کہ میرا باتیں بنانا انھیں بہت
بھاتا تھا۔۔۔۔ میں لاڈ پیار کا بگڑا ہوا بچہ، بھلا میری آنکھوں میں نیند کہاں۔
انھوں نے سمجھایا۔ "سو جاؤ بیٹے اب سو جاؤ۔" اور مجھے لپٹا کے وہ
ایک بھجن گنگنانے لگیں۔

گیت کی مدھم دکھیاری نے شروع میں تو لگتا تھا یہاں وہاں
تیرتی پھر رہی ہے، جیسے اگر دان میں سلگتی ہوئی لوبان کا دھواں۔ پھر ایسا
لگا کہ پورا کمرہ اس سے بھر گیا، پوری طرح، اتنا کہ سانس بھی لی نہ جائے گی
اور پھر وہ کمرے کے کھلے دروازوں سے نکل کر نیچے مکان کے
دالان اور آنگن میں بھی چھا گئی۔

میں ٹکر ٹکر اپنی ماں کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ
کیا کیا چاہتی ہیں کہ میں سو جاؤں یا یہ کہ بستر اوٹ پلنگ کہیں اور
کیسے کرنے سے خفا ہو گئی ہیں۔ وہ کس حد تک جھنجھلا گئی ہیں اس کا میں کوئی
اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا اس لیے کہ ان کی آواز میں ڈانٹ کے لہجے کے ساتھ

دُلار کی رومانیت بھی تھی۔ اور میں اپنی بڑی بڑی آنکھوں اور چھوٹے چھوٹے گرم گالوں سمیت پورا مُنھ اُٹھائے اُنھیں ایک ٹک دیکھتا رہا۔

اُن کے دہکتے ہوئے رنگ کے چہرے پر ایک خاص قسم کی آب تھی۔ کچھ کھلنڈرا پن کچھ گمبھیرتا اور اس کی وجہ سے ان کا بیضوی چہرہ اور بھی اچھا لگتا تھا۔ اور ان کی مسکراہٹ بڑی عجیب اور شکیلی سی ہوتی تھی جو نچلے ہونٹ سے کہیں زیادہ ان کی ستواں ناک کی پھننگ پر نظر آتی تھی اور جس کے اثر سے ان کے گالوں سے کہیں زیادہ ان کی ٹھوڑی کی نوک کھل اُٹھتی تھی اور جسے دیکھ کر میں ہمیشہ یہ جان جاتا تھا کہ میں ان کا چہیتا ہوں۔ البتہ جب وہ غصّے میں ہوتی تھیں تو پھر مجھے ان کا کالا لمبوترا چہرہ ذرا نہیں اچھا لگتا تھا۔ اس وقت مجھے دیو کی چاچی کا کھلتی ہوئی رنگت کا بیضوی چہرہ زیادہ اچھا لگتا۔ لیکن اماں جب خوش ہوتیں تو آس پاس وہ چین اور اپنا پن ہوتا جس پر میں جان چھڑکتا تھا اور ان کے انگ انگ میں ایک مہک ہوتی تھی جو اُن دنوں ننھی شیشیوں کی مہک کی طرح تھی اور ان کے برتاؤ میں ایک ایسی فطری بے تکلفی تھی کہ میں اپنے کو سات لوگوں سے زیادہ انھیں کے قریب محسوس کرتا تھا۔

ذرا دیر بعد ان کے گیت کی مدھم تان کی کمان ڈھیلی پڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے آخر برسات کی سہ پہر کی اُمس نے ان کو مضمحل کر دیا ہے اور وہ چرخے کے ہتھے پر اپنا داہنا ہاتھ رکھے ہی رکھے اونگھ گئیں۔

میرا جی چاہا کہ میں اپنے ہاتھ سے ان کی آنکھیں پھر کھول دوں۔ جب بھی وہ دن میں سوتی تھیں تو میرا ہمیشہ یہی جی چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ سو جاتی تھیں

مجھے اکیلے پن کا احساس ہونے لگا اور میں چاہتا کہ وہ اٹھیں اور میرے ساتھ کھیلیں۔ لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتی تھیں۔ مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے دریچے سے میں اٹھا اور کمرے کے باہر بھاگ گیا کہ کہیں ان کے بچپن کا جھولن، یا وہ بھوت جو ان کے سر پہ تھا، مجھے پکڑ کر میرا گلا نہ گھونٹ دے۔

میں دالان کے اس کونے میں چلا گیا جہاں ایندھن کی لکڑی بھی جلتی تھی۔۔ وہاں سے میں نے بانس کا ایک ڈنڈا اٹھا لیا جو میرے باجی کی مچھر دانی میں لگتا تھا اور اس پر اس طرح سوار ہو گیا جیسے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور دوڑنے لگا۔

"کرشنا!" میری ماں نے چونک کر پکارا۔

بانس کے ڈنڈے پر سوار ہو کر میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان بڑے گھوڑوں میں سے کسی ایک پر سوار ہوں جن پر بیٹھ کر ہم وہیں کچہری کے اردلی میرے باجی کی ڈاک لایا کرتے تھے، اور میں نے دالان میں ابھی گھوڑ دوڑ شروع ہی کی تھی اس لیے میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کرشنا!" انھوں نے پھر پریشان ہو کر گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا۔ اس لیے کہ شاید ایک ہچکی لینے کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی تھی اور انھوں نے دیکھا ہوگا کہ میں غائب ہو گیا۔

میں نے چونک کے جواب دیا۔ "میں یہاں ہوں" اور ان کی طرف چلا۔

انھوں نے پکار کر کہا۔ "اچھا بیٹے۔ میں بھی پتہ نہیں کہاں چلی گئی تھی کہیں، مگر دیکھو دھوپ میں مت جانا اور ننھے کو مت جگا دینا۔"

لیکن اتنے میں میں اپنے گھوڑے پر شان سے سوار وہیں پہنچ چکا تھا اور اپنے دخول میں آنے پاؤں سمیت اس نیلے زری قالین پر گھوڑا چڑھانے ہی والا تھا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

انھوں نے کہا: "بیٹے جاکے دالان میں کھیل اور مجھے چین سے ذرا دیر اور چرخہ کات لینے دے۔ نہیں تو تیرے ابا کے گھر آنے کا وقت ہو جائے گا۔ جاکے ذرا دیکھ تو تیرے بھائی اور بھابی آرہے ہیں کہ نہیں۔ اتنی دیر ہوگئی، ان لوگوں کو بازار گئے ہوئے۔"

لیکن اب مجھے گھوڑا گھوڑا کھیلنے کی کوئی خاص فکر نہ تھی اس لیے کہ میں کرسی کا پہیہ گھمانے سے روپے کی چرخی کو چلتے اور ان کے ہاتھ کی روئی سے سوت نکلتے دیکھنا چاہتا تھا۔

میری ماں نے ذرا غصے میں زور سے کہا: "جا بیٹا، جاکے کھیل۔"

اس پر میں نے اپنے گھوڑے کو اتنے زور سے موڑا کہ میرے ہاتھ میں جو کوڑا تھا اس سے چرخے پر چڑھا ہوا سوت ٹوٹ گیا اور میں اپنے پیچھے تباہی اور بربادی اور ایک دکھیاری ماں کو چھوڑ کر، جو اپنی انگلی کی روئی سے سوت کو جوڑتے ہوئے مجھے کوستی بھی جا رہی تھیں، فاتحانہ انداز سے باہر آگیا۔

لیکن میں اپنے میدان کارزار، دالان میں پہنچا ہی تھا کہ میں نے بیٹھک میں، جو کہ آنگن کے سامنے والے کمرے میں تھی، قدموں کی چاپ سُنی۔ میں نے اپنے ذہن میں اپنے گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور دوڑتا چلاتا ہوا۔

"بھاپا جی، بھاپا جی!" اس سے تو میں سمجھ گیا تھا کہ میرے بھائی پرتھی اور گنیش آ رہے ہیں۔

لیکن وہ مجھ سے ملنے کے اتنے بیتاب نہیں معلوم ہوتے تھے جتنا کہ میں ان سے ملنے کے لیے تھا۔ یہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب میں اپنے بڑے بھائی کی طرف سے لپٹنے کے لیے دوڑا اور ان کے حواسوں پر سے ہوتے، مجھے بڑی تیزی سے روکنے کے لیے۔ جھنجھلاہٹ اور گھبراہٹ کے الفاظ نکلنے لگے۔ بیٹے، رُک بیٹے، زرد رنگ کا پرتھی کا چہرہ اندر ہی اندر سلگتے ہوئے غصے کی وجہ سے آگ بنا جا رہا تھا۔ اس کا منہ تو نہیں سیدھا ہوا لیکن آنگن میں پاؤں رکھتے ہی میں انہیں بیتابی سے اس کی بانہوں سے لپٹا کہ اس کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا۔

اس نے میرے اس زوروں کے پیار کے جواب میں زبان سے ہوں ہوں کیا جس میں دبا دبا غصہ بھی تھا اور ڈانٹ بھی اور اس نے جھنجھلا کر کہا: "ہٹو بھی بیٹے دو! آنگن اس قدر تپ رہا ہے اور تو ننگے پاؤں جل رہا ہے؟"

میں نے نہ اپنے بھائی کی جھنجھلاہٹ کی پرواہ کی اور نہ پاؤں تلے جلتی ہوئی زمین کی، اس لیے کہ سارا دھیان نشانیوں کا تھا جو وہ میرے لیے ضرور لائے ہوں گے، اور میں نے اصرار کیا: "پہلے مجھے دو! کیا لائے ہو میرے لیے بھاپا جی؟"

"بیٹے ادھر آ، چھوڑ دے اسے!" میری ماں نے کہا۔ جو کچھ گڑبڑ بھانپ کر دالان میں آ گئی تھیں۔

مگر میں بھلا ایسے ماننے والا کہاں۔

انھوں نے یہ سوچ کر کہ خالی خولی بات سے کام نہیں چلے گا، مجھے رشوت کی لالچ دی۔ "بیٹے ادھر آ، تیرے بھائی تیرے لیے کھلونے اور اچھی اچھی مٹھائیاں لائے ہوں گے۔ اندر آنے سے پہلے ہی تو تجھے دیں گے۔"

اماں نے جب یہ اطمینان دلایا تو میں نے ہرش کو چھوڑ دیا۔ اماں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میں ننگے پاؤں ہوں اس لیے ہرش سے بولیں:

"منا کے (ہم سب کو وہ 'منا' ہی کہتی تھیں، ان کی نگاہوں میں ہم کبھی بڑے نہیں ہوئے) اسے گود میں لے کے سائے میں لے آ، تیری بہو اور چھوٹا بھائی کہاں رہ گئے؟"

ہرش نے مجھے بے جھجک پن سے گود میں اٹھا لیا اور ماں کے سوال کے جواب میں سر جھکائے جھکائے، ہونٹ بھینچے بھینچے بڑبڑایا: "وہ نہیں آئے ہیں۔"

جب ہرش مجھے لیے ہوئے دالان میں پہنچا اور اس نے مجھے مستقل کے پلنگ پر دھپ سے اتار دیا تو اماں نے اسے منانے پھسلانے کے لیے کہا۔

"میرے اپنے لال پرے دادی باپ ذرا، تھک گیا دھوپ میں، پیدل چلنے سے؟"

ہرش نے انکار میں سر ہلایا اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ میں آج بھی سوچتا تھا کہ اس وقت تو اس کا موڈ نہیں سمجھ پایا، لیکن اب وہ قصہ یاد آتی ہے جو بڑے ہو کر بہت سی باتیں جاننے کی وجہ سے سمجھ میں آنے لگی ہے۔

ماں نے اس کی طرف پیار اور رحم کی نظروں سے دیکھا۔ یہ تو وہ جانتی تھیں کہ ان کا بڑا بیٹا بچپن ہی سے خاموش طبیعت کا اور من ہی من والا تھا۔ لیکن اس کے بچپن اور لڑکپن کی کم گوئی، اس اطاعت پسندی اور فرمانبرداری کا نتیجہ

تھی جو بیسکر ابالی مسلسل ڈانٹ، پھٹکار، گالیوں، دھونسوں اور کبھی کبھی چھڑی یا کرکٹ کے اسٹمپ سے، زدوں کی پٹائی نے پیدا کر دی تھی۔ البتہ یہ نئی چپ، جس نے ان کے بیٹے کو زرد اور نیلا کر کے رکھ دیا تھا، انھیں بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ایک ایسے دبے ہوئے غصے کا نتیجہ ہے جو اندر ہی اندر اس کا خون کھولائے ڈال رہا ہے لیکن ابل کر سامنے نہیں آتا۔ انھیں حیرت تھی کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ لیکن مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ انھیں سب پتہ تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ سارا قصور انھیں کا ہے؟ اس لیے کہ انھوں نے پندرہ ہی سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی اور وہ بھی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ کر سکی۔

ہریش کہتا تھا کہ اس کی بیوی جاہل اور بیوقوف ہے۔ اسے اپنی بیوی کے کارن سینئر میں اسکول کی پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ اور اب وہ اپنے کندھے کا بوجھ لادے ہوئے گھر آیا تھا اور اس کی ہو نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ بار کیسے سنبھالے۔

اماں کو یہ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ ان سے کون سی ایسی غلطی ہو گئی۔ یہ تو ریت کی رسم ہے کہ سات آٹھ سال کی عمر میں بچوں کی منگنی کر دیتے ہیں۔ ان کے شوہر کا گھرانا تو کافی خوشحال اور کھاتا پیتا تھا۔ اگر بیٹیوں کی پیدائش کے بعد ہی ان کی مانگ نہ آ جاتی تو ڈوب مرنے کی بات ہوتی کہ نہیں! اور کوئی کچھ بھی کہے، اچھا تو یہی ہے کہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں ان کی شادی کر دی جائے۔ اس لیے کہ جوان جوان لڑکیوں کو بھی یہی سمجھاتا ہے کہ اپنا گھر آباد رکھنا ہی، بڑوں کو سکھ چین دیں اور ویسے بھی بیٹوں اور پوتوں کے بغیر کون سے گھر میں برکت ہوتی ہے۔ اور اولاد

کے بجیرس کا نام سنا ہے ۔ ہاں ہاں انھوں نے بجیرسے سُنے ہیں ۔ آجکل کے تعلیم
کو پڑھے لکھے فیشن ایبل لڑکے کچی عمر میں شادی نہیں کرنا چاہتے ۔ بھلا یہ بھی کوئی
بات ہوئی ۔ ان کے گاؤں میں تو غریب کسان اپنے بیٹوں کی شادی اس لیے بھی
جلدی کرتے تھے کہ شادی بیاہ کے لیے ، روپیہ بھی نہیں جوڑنا پڑتا تھا بیچاروں کو ۔
اور اس میں کوئی خرابی تھی بھی نہیں کہ ہریش کی شادی جلدی کر دی گئی ۔ چند سال
کی عمر پڑھے لکھے لڑکوں کے لیے بھی کوئی کم عمر نہیں ہوتی ۔ ان کے گاؤں کے کئی گھر
روکا بھی تو پڑھا لکھا ہی ہے ۔ ساری خرابی کی جڑ ہریش کی بہو ہے ۔ نہ اس کے
لچھن ایسے ہوتے نہ یہ سارا جھگڑا ہوتا ۔

تب جب بڑا ہوا تو مجھے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ اماں کیسی کیسی الجھی الجھی
دلیلوں سے اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتی تھیں کہ انھوں نے تو سب
ٹھیک ہی کیا تھا ۔ اس لیے کہ اس اوپر اوپر سے لگے کی بھولی شادی کی تمام
وجہیں گیوں کا انھیں پورا پتہ تو نہ تھا لیکن انھوں نے جو کچھ جانا تھا کہ گڑبڑ
کیا ہے وہ کافی حد تک ٹھیک تھا ۔ اور اس گڑبڑ میں خود اپنی ذمہ داری کو بھی
وہ سمجھتی ہی تھیں ۔ لیکن بھلے کسان پرکھوں سے انھیں ایک ہٹ دھرمی ورثے میں
ملی تھی ۔ اسی لیے اس بات نے اور بھی آگے کا کام کیا تھا کہ ان کی اپنی شادی
ایک ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو برادری میں "حیثیت والا" تھا ۔ اور اس
ہٹ دھرمی پر وہ قائم رہیں ۔ اپنے نصیبوں کو کوستی رہیں ۔ ان کے اور ان کے
بیٹے کے بیچ میں جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی اس پر کڑھتی رہیں اور اس سب کا الزام
بہو کے سر منڈھ کر اپنے بیٹے کو چاہتی تھیں کہ اپنی طرف کر لیں تاکہ ان کے ساتھ ہو

چونکہ ہر معاملے میں گھر کی اگوا اور اصل مالکن تھیں، اور اگرچہ ان کی غلطی پر پردہ ڈالے اور اس کے لیے سب متحد ہو کر پوری کوشش سے باہر والی، دلہن، کو بُرا بھلا کہیں اور اس کو تختۂ مشق بنائیں۔ اس لیے کہ گھر کے، مشترکہ کنبے کے اتحاد کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ صرف ان کی نرمی اور محبت ہی ہرشیش کی تسکین کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہرشی کی بیوی کے ساتھ نفرت سے برتاؤ، انتہا کر دیا کہ ان کے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

انھوں نے پوچھا: "اور وہ چھتن کہاں ہے؟"

ہرشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کچھ دیر میں لڑکی آ گئی جو واقعی عورت کا ایک چھوٹی موٹی چھتن ہی تھی۔ اس کے آتے ہی گھر کے گنجینہ تھا، نہ دولت، دبلا پتلا جسم، ہاتھوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور عجیب بے ڈھنگے کان۔

اماں نے آنگن میں میری بھابی کی ایک جھلک دیکھی، ان کے نتھنے پھڑکے، اور وہ اسے نفرت کی پوری شدت کے ساتھ دیکھا۔ ان کو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے اس دشمن کو بھسم کر کے رکھ دیں۔ وہ کالے اور پتلے ہونٹ کاٹنے کی طرح سلگتی رہیں جو نہ بجھ سکتا ہے نہ جلا سکتا ہے مگر خود راکھ ہو سکتا ہے۔

میری بھابی آ گئیں اور آنے کے بعد سے کسی طرح چپ سے بیٹھ گئیں۔ وہ ادب سے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھیں۔ اماں نے ان کو گھور کے دیکھا۔ ساس اور بہو کا آمنا سامنا تھا۔ لیکن تماشا جلد ہی ختم ہو گیا۔

اس نے سوچا مکان کے باہر سے باجی کی آواز جانی پہچانی
تو تھی مگر جیسے کسی سے مذاق کرتی ہوئی سُنائی دے رہی تھی۔

اماں بولیں "لو، تمہارے باجی آ گئے"۔

اسی وقت، بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے ہی، میں نے بھی باجی کی آواز
سُن لی تھی۔ میں اب بھی اپنے باجی کے پیار کا مالک، ان کا لاڈلا تھا۔ میں
ان کی آواز سنتے ہی اپنی ماں کی باہوں سے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح
چھڑا کے آنگن میں ہوتا ہوا ہال میں جا پہنچا۔

باجی خوب زور زور سے وہی بے معنی گیت گانے لگے اور دھڑ
سے تھپتھپاتا ہوا سا، ایک لفظ اس سے گونج اٹھا:

منی، منی ——— منی، میرا بیٹا۔
منی، میرا کرشن ——— منی، میرا سونو۔
منی، منی ——— منی، میرا بیٹا، بیٹا، بیٹا۔

مجھے یہ بڑا اچھا لگتا تھا کہ میرا لاڈ کا نام اس طرح گایا جائے۔ اور
بہرحال باجی تو میرے اصل ہیرو تھے ہی۔ میری چلتی تو میں تو پر لگا کے ان کی
باہوں سے پہلے پہنچ جاتا۔

میرے ہنس مکھ، خوش دل، لال لال گال والے باجی نے مجھے گود
میں اُٹھا لیا اور اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے سے مجھے پیار کرتے ہوئے اور
گانے کے انداز میں میرے پیار کے نام سے کھیلتے ہوئے وہ آنگن میں اتو
ایک بچے، بڑے سے لڑکے کی طرح داخل ہوئے۔ وہ سادگی اور بھولپن سے

بیاختہ مجھے پڑ رہے تھے۔

بعد میں جو کچھ میں نے دیکھا اور جانا اس کی روشنی میں جب ان کی یاد آتی ہے تو بے ادھیڑ سے ذرا کم عمر، میانہ قد کے، اور چوڑے پائنچوں کا ڈھیلا ڈھالا پتلون، بکلف دار کالر والی سفید قمیص اور وکٹورین وضع کا خاکی شکاری کوٹ، چاکلیٹ کے رنگ کی گول ٹوپی، سپاہیوں والے ہندوستانی وضع کے جوتے، جو انھیں موٹے بے ڈول کر اونشا ماسٹر جوالا سرن سنگھ نے دیے تھے، پہنے ہوئے وہ کچھ عجیب انگریزی ہندوستانی کا بڑا بھلا نمونہ تھے اور میں ہندوستان کی فیشن ایبل پوشاک کا خاصہ۔ ایسے کہ نہ خالص ہندوستانی ہوتی تھی نہ پلٹے کی نقالی ہوتی تھی بلکہ پتہ نہیں کیوں، ہندوستانی اشکال کے ڈھانچے میں برتر ملاتی انگریزی لباس کی کچھ چیزیں شامل کر کے معززانہ آمیزش کی جو کوشش کی جاتی تھی اس کے باوجود اپنی الگ انفرادی حیثیت سے عاری ہوتی تھی، اور پھر جدید ہندوستان کی کیسی علامت ہوتی تھی جہاں فیشن زدہ یورپ اور جاگیرداری کے مارے ہوئے ایشیا کی پیوندکاری نہ ہوئی تو بات ہی کیا!

وہ اتنے خوش تھے۔ بچے جس بچے سے انھوں نے پیار کیا تھا اس پر اتنا بھروسے ہوئے اور خوش تھے کہ ایک لے کے لیے انھوں نے گھر کے دوسرے باغیوں کو دیکھا ہی نہیں، جو کہ اب سامنے کے رُخ والے دالان میں آ ٹھہرے پہر کی نیند کے بیچ ذرا دم لینے کے لیے اچانک اپنا خر خر کا تانا بانا ہے تھے۔

"بی، بی ——— بی، میرا بیٹا!"

ال کے اوپر سے شروع ہو کر اب یہ گیت انجیر یا بار ختم ہو رہا تھا۔

پھر خوب سا لاڈ پیار کر کے اباجی نے مجھے چارپائی پر بٹھا دیا۔

اس خوشی پر اتراتا ہوا جس کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی تھی، میں بڑی شان سے اپنی اہمیت کے احساس کے ساتھ اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت بھی پیار کیے جانے اور اپنی تعریف ہونے پر میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ یہ عادت بالکل بچپن میں لاہور میں پڑی تھی لیکن اب اس کے ساتھ ہی میرے دل میں ہر ایک کے لیے محبت بھی تھی۔

اباجی نے اپنی ٹوپی کو احتیاط سے پلنگ کے پائے پر رکھتے ہوئے ہرنش سے پوچھا۔ "شہر گئے تھے بیٹے؟"

"ہاں جی" ہرنش نے آہستہ سے کہا اور ہونٹ پھر بھینچ لیے۔ وہ ابھی تک اپنے خیالوں میں گم، رنجیدہ، کبیدہ خاطر اور گرہ کی طرح بندھا ہوا تھا۔

اباجی بظاہر جذبات کی ان بھیدوں کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے تھے۔ وہ رجمنٹ دفتر کے بڑے بابو، یعنی نام کے نہیں تو کام کے کرنل تو وہی تھے۔ اور جب میں بڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ذہنی ڈپلومیسی کے علاوہ فوجی زندگی اور اس کے کھردرے پن نے ان میں ایک ایسا بھولا پن پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل ہی ابتدائی تجربے کی سطح پر بھی تا دیر برقرار نہ رکھ سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ تو وہ جانتے تھے کہ ہرنش دکھی ہے لیکن وہ یہ بات بڑے ہونے کے طور پر سمجھتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کے جذبات کا تجزیہ کر سکتے تھے اور دیکھا جائے تو وہ وقت کی، وقتی فکر نے انھیں اس کی مہلت تو دی نہ تھی کہ وہ اپنے ہی جذبات کا تجزیہ کر پاتے۔ خود انھوں نے دفتر کے انگریزی قاعدوں کو قبول کر لیا تھا

لیکن ضمیروں اور رشتہ داروں کی برادری کے ، بیت زائج پران کا ایمان بھی قائم تھا ۔ دونوں کو ملانے کی انھوں نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ تو سچ ہے کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے تھے اور وہ شہر میں مقامی آریہ سماج کے صدر تھے۔ یہ سوسائٹی بیواؤں کی شادی، ذات پات کی تفریق کو ختم کرنے، شادی کے لیے رضامندی کی عمر کو بڑھانے وغیرہ کی حامی تھی۔ لیکن اس طرح دیکھا جائے تو ان دنوں کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ زبان سے تو کچھ کہتے تھے اور اپنی ذات برادری کے جال میں پھنسے ہوئے اور اَن پڑھ جاہل ہستیوں کے ماحول کے بندھنوں سے مجبور ہو کر کرتے کچھ اور تھے۔ اور پھر وہ ترقی پسند سوسائٹیاں، جن کے اراکین ایسے لوگ ہوتے تھے، عام طور پر فیشن ایبل مجلسیں، سوشل کلب، بلکہ کہیں کہیں تو شراب نوشی، عیاشی اور قمار بازی کے اڈے بن جاتی تھیں، جہاں بار وزگار لوگوں، سفید پوش بھوتے بازوں کو اپنے بڑے کنبوں اور بھاری ذمہ داریوں سے کچھ دیر کو فرار نصیب ہو جاتا تھا۔ بابو جی کو چھاؤنی اور آریہ سماج میں بہت سے لوگ "چاچا" کہتے تھے اور اس لیے وہ ہر چیز کو بے چون و چرا قبول کر لینے میں اپنی مثال آپ بن گئے تھے۔ چنانچہ پڑھنے کو وہ اخبار "ٹریبیون" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" بھی پڑھتے تھے اور اوما تیرتھ کی لائبریری سے لے کر انگریزی کے ناول بھی، لیکن یہ ان کے نزدیک دفتر کی چکّی سے ایک خوشگوار فرار تھا اور بس؛ اور جب کبھی اس کا سوال پیدا ہوتا تھا کہ کنبے، ذات، برادری کے معاملے میں کیا کرنا چاہیے کیا نہ کرنا چاہیے تو پھر وہ تنگ نظری کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے تھے اور مذہب کو بھی۔

ہرشی کے معاملے میں ان کو بس اتنی بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ لالہ ہو کے میٹرک اسکول میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اس لیے کہ اس کی شادی ہو گئی اور وہ ڈپلوما نہ لے پایا۔ اس لیے کہ میرے والد بھی تعلیم کو ایسی ڈگریوں کی صورت میں دیکھتے تھے جنھیں حاصل کر کے کسی سرکاری محکمے میں مستقل نوکری مل سکتی تھی جیسا زیادہ تر لوگ اس وقت سے سوچتے آئے ہیں جبکہ لارڈ میکالے نے ہندوستان کو قدیم ہمارے قوانین اور انگریزی زبان کے ساتھ اپنے زمانے کی برطانوی جنت نشان اقلیم کا تحفہ پیش کیا تھا۔ چونکہ ہرشی کو اس کے سسر اور اس کی بیوی نے مجبور کیا تھا کہ وہ اب آگے نہ پڑھے۔ اس لیے اسے نوکری ڈھونڈنی پڑی ہے۔ وہ ہرشی سے خفا تھے کہ اس نے ان تمام امکانات پر پانی پھیر دیا اور حیثیت منشی بھی ملازم ہوگا۔ وہ تین سال تک کے محنت کر لیتا اور پاس ہو کر ڈاکٹر ہو جاتا تو اسے حاصل ہوتی۔ مگر اب وہ اس سے خود تو بات کرتے نہ تھے۔ ان کے دماغ کے کسی کونے میں اس جرم کا بھی احساس رہا ہوگا کہ آخر بیٹے کی شادی پر رضامند بھی تو انھوں نے ہوئی تھی۔ اور وہ اپنے اس جرم کو تسلیم نہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہرشی کی موجودہ اداسی اور رنجیدگی کا نوٹس لینے ہی سے انکار کر دیا۔

انھوں نے ماں سے پوچھا۔ "لڑکوں نے کچھ کھا لیا؟"

میں بول پڑا۔ "مجھے کچھ دیجیے، ماں مجھے چیز دے دو!"

ماں نے جواب دیا۔ "دم تو بیٹا، دم تو۔ پہلے تیرے بڑے بھائیوں کو کچھ دے دوں۔ وہ بھی بے چارے صدر بازار میں نہ جانے کب سے بھوکے ہیں۔"

میں نے ذرا منھ بنا کے کہا۔ "تو میں کیا خالی بیٹھا ہوں!"

باجی ہنس پڑے اور مجھ سے بولے۔ "ادھر تو آ بچے، تو کیا کرتا رہا سارا دن؟"

اماں نے مسکراتے ہوئے بتایا: "بھوت اُلٹے سیدھے سوال پوچھتا رہا کہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ پوچھ رہا تھا میں تم لوگوں کو کہاں لا ہوں؟"

"ہو ہو، ہا ہا ہا" باجی نے قہقہہ لگایا۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور انھوں نے اُٹھ کے مجھے پکڑ لیا۔

"تو بڑا بدمعاش ہے۔ شیطان کہیں کا، بالکل چھوٹا سا بندر ہے!"

اماں نے مجھے ایک کریم کیک، کچھ اخروٹ اور کشمش دیتے ہوئے ان سے کہا: "بڑا خراب ہو گیا ہے، سارا دن کہیں یہ پوچھ، کہیں وہ پوچھ، ناک میں دم کر دیا اور چرخے کی گت بنائی سو الگ ہے۔"

"جرنیل کی اماں پھر تم نے اسے کیا بتایا؟" باجی نے ہندوستانی رواج کے مطابق بیوی کو مخاطب کیا۔ شاید یہ ایک دوسرے کے احترام کا تقاضا تھا کہ شوہر اور بیوی مخاطب کرنے کے لیے کسی اور کے واسطے سے کام لیتے تھے۔

اماں نے جواب دیا: "میں نے بتا دیا کہ اسے ایک میم ہم لوگوں کے پاس لائی ہے۔ لیکن اس کی کرید اور ضد، توبہ، اب کہنے لگا میں دیکھوں گا اس میم کو، تو میں نے کہا کہ جب خیر سے بڑا ہو، ولایت جانا تو دیکھ لینا۔"

باجی نے خوشی اور فخر کے ساتھ کہا: "بڑا نصیبوں والا بچہ ہے کہ اسے انگریز نرس نے جنایا۔ یاد ہے تمہیں اس کی پیدائش پر ہم لوگوں نے کیسا جشن منایا تھا۔ پشاور کے سامنے خان اور سب صاحب لوگ آئے

تھے۔ بڑا مبارک بچہ ہے۔ جا سکتا ہے ولایت بھی ....؟

اماں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں ہاں بڑا مبارک بچہ ہے۔ تمہیں یاد ہے؟ یہ گیارہ دن کا تھا تو آغا خان پشاور آئے تھے اور میں اسے لیکر گئی تو انھوں نے اسے اپنی گود میں بٹھایا اور پیار کیا اور کہا کہ یہ میرا اچھا پیرو رہے گا۔ بڑا اقبال والا ہوگا ....؟"

آغا خان کا ذکر آنے پر باجی نے ذرا تیوری چڑھائی۔ آریہ سماج میں شامل ہونے کے بعد سے وہ آغا خان کو اپنا روحانی پیشوا نہ مانتے تھے جیسا کہ کشمیریوں اور سناروں کی برادری اور ان کے بھائی بھتیجے سمجھتے تھے۔

ہرش سے بھی چپ نہ رہا گیا "اماں تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو"۔ وہ لاہور کے دیانند اینگلو ویدک اسکول میں پڑھ چکا تھا، جہاں آریہ سماج کا زور تھا۔ "حد ہے یہ تو ترقی کی، آغا خان کی دعاؤں کی اتنی اہمیت ہوگئی"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پھر اپنی گردن جھکالی۔

اس وقفے میں ولایت کے بارے میں جو بات سرسری طور پر کہہ دی گئی تھی وہ، دوبارہ ذکر چھڑنے، اور اس پر میرے والدین کے خوش ہونے کی وجہ سے اور پھر اس خاموشی کی بدولت جو اس بات کے بعد چھا گئی، مجھ جیسے جذباتی اور ہر بات کو ذہن نشین کر لینے والے بچے کے لیے ایک فال نیک کی بازگشت کی طرح بن گئی۔

یہ ان لمحوں میں سے ایک لمحہ تھا جب صرف ایک لفظ جو یوں ہی کہہ دیا گیا ہو، ایک خیال جو بس ویسے ہی دل میں آ گیا ہو، ایک بے تکا سا احساس چاہے

وہ کتنا ہی مضحکہ خیز ہو، خیالوں کو حسن کی ہر کھ سوچ پر مائل ہو واز کر دیتا ہے اور
آدمی روز مرہ کی دنیا سے بالکل مختلف ایک دوسری دنیا کی فضا میں پہنچتا ہے۔
جب انتہائی احمقانہ اور بالکل ہی بے معنی ذہنی کیفیت زندگی بھر کا سب سے غالب
جذبہ بن جاتی ہے۔ اس اہم دن کی اور جو باتیں مجھے یاد ہیں ان میں سب سے
نمایاں یاد ولایت کے بارے میں اس ایک فقرے کی ہے جو میری بعد کی زندگی
کی داستان میں ٹیپ کا مصرعہ بن گئی۔ اس سے کہ جوں جوں میں بڑا ہوا اور میں
بچپن کے چھلبلے پن کی حدوں سے گزر کر اسکول کالج اور وسیع تر دنیا کی کشادہ
حدوں میں قدم رکھا، ویسے ویسے ہی مغرب کی طرف کھنچنے لگا، صرف اسی طرح
نہیں جیسے لوگ، روزی کے جانے پر مجھے کٹھن اور بہت لپٹ کر دینے والے حالات
سے عاجز آ کر برکتوں کے دیس کی طرف دیکھتے ہیں، بلکہ میں ہیٹ، فل بوٹ،
ٹائی، ڈانس، کرکٹ کے بلے، نیکر پتلون، پانسل، سگریٹ، تمباکو، کتابوں،
دیوا اور ادران جیسے مغرب کے دوسرے تحفوں کو، جو کہ جدید ہندوستان کے
اصل پیرو ہیں، دل میں عزت سے زیادہ عزت کی جگہ دیکھ یورپ کی نقالی
کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ابی نے میری ماں سے پوچھا۔ "اے، اس لڑکے سے بھی کچھ کہا یا نہیں؟"
ماں نے چونک کے جواب دیا۔ "میرے دس ہاتھ تو ہیں نہیں۔" بیچاری
وہ پیار کرنے والی ماں سے غذا کھانے والی ساس بن گئیں۔ "مرنے کی بھی تو
پھر سے بھی دیتی ہوں۔" اور پورے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ نفرت کا گہرا
سناٹا، جس میں ہر شخص بھرا اور تنا بیٹھا تھا۔

بابوجی نے شیو کر چھوڑ کر، جیسے وہ بان کی چارپائی پر تھپک تھپک کر
سلائے ہوئے تھے، ہاتھ منہ دھونے چلے گئے۔ وہ صبح شام دونوں وقت پاخانے
جاتے تھے اور وہاں کم سے کم آدھ گھنٹہ بیٹھتے تھے۔ ایک دن پہلے کا سول
اینڈ ملٹری گزٹ پڑھتے تھے جو ڈاک اردلی ان کے لیے افسروں کی میس سے
لاتا تھا۔ اور شاید انھیں رفع حاجت کرنے میں بچوں کی طرح قدرتی مزا بھی
آتا تھا یا پھر اس لیے کہ وہ بواسیر کے مریض تھے۔

جتنی دیر وہ پاخانے میں رہے، گھر میں مکمل خاموشی رہی۔ بچے کو نیند
آ رہی تھی تو ماں نے بیٹھ کے اسے تھپکیاں دیں۔ شاید وہ سو گیا۔ ہرش پہلے
ہی کی طرح گم صم تھا۔ گنیش اپنی اسکول کی کتابوں پر جھکا بیٹھا تھا اور ایسا
بن رہا تھا جیسے بڑی محنت کر رہا ہو، حالانکہ اپنی ذہنی خالی خالی آنکھوں
سے ادھر ادھر تکے جا رہا تھا۔ اور میری بھابی وہ بھی اپنے گھونگھٹ میں
دبکی ہوئی اس چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھی تھیں جس پر شیر سو رہا تھا۔

پھر بابوجی نکل آئے۔

"ہرش، اگر تم بہت تھکے نہ ہو تو ذرا آگ تو دیکھنا" انھوں نے کہا۔ وہ
جانتے تھے کہ ہرش ضرور آئے گا اس لیے کہ آگ کا اسے بڑا شوق ہے۔ "اور
چلو، یہاں تو بڑی محنت کرنی ہے۔ تمھیں ذرا آنا ہو گا ضرورت ہے۔"

"اچھا جی" ہرش نے آہستہ سے کہا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے
ادھر ادھر دیکھا اور پھر ساکت ہو گیا۔

بابوجی نے ایک برتن سے پانی انڈیل کر ہاتھ پونچھ ڈالا اور پھر مٹی سے رگڑ

بگڑ گئے، اس لیے کہ وہ قدرتی صفائی کے قائل تھے اور صابن سے کم ہی ہاتھ
دھوتے تھے، اپنی روشنائی لگی ہوئی انگلیاں صاف کرنے لگے۔ جب وہ ہاتھ
منہ دھو چکے اور تولیے سے خوب رگڑ کے پونچھ چکے تو انھوں نے چاندی کی موٹھ والی
چھڑی اٹھائی اور پریشیں کو ساتھ لے کر چل دئے۔

روز کی بات ہوتی تو میں بھی ان کے ساتھ جانے کو کہتا اور اگر وہ ٹال دیتے
تو ضد کرتا، روتا دھوتا۔ لیکن آج کی شام، بھری خاموشی سے میں ڈرا ہوا
تھا اور میری بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

گنیش البتہ چالاک تھے، کسی طرح دم دبائے ان کے ساتھ ہو لیا۔

جب باباجی کے بیٹے مذاق کرنے، فقرے چست کرنے کی آوازیں آنی
بند ہو گئیں تو اماں اٹھیں اور ایک تھالی میں انھوں نے پھل اور مٹھائی خوب
اچھی طرح سے سجایا اور لیجا کے دروپدی کے سامنے رکھ دیا جیسے کوئی دیوتا کے
سامنے رکھتا ہے۔ پھر وہ شیو کے پاس چلی گئیں، جو کلبلا رہا تھا اور اسے
دودھ پلانے لگیں۔ میں چپ چاپ پائی پر بیٹھا ہوا "سول اینڈ ملٹری گزٹ" سے
بڑی آزادی سے ٹیل چیل چلا رہا تھا۔ ویسی آزادی پھر کبھی مجھے نصیب نہ ہوئی۔

پھر ذرا دیر بعد جب اماں شیو کو دودھ پلا کے اسے پھر سے سلا چکیں
تو وہ اپنی بہو سے مخاطب ہوئیں اور انھوں نے دیکھا کہ دروپدی اپنی جگہ سے
ہلی بھی نہیں اور اس نے کھانے کی چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

انھوں نے کہا: "بیٹی تم کچھ کھاتی کیوں نہیں؟" اور پھر میری طرف دیکھ
کر بولیں: "تمھارے لیے تو یہ بڑی گھٹیا اور معمولی چیزیں ہوں گی؟"

کوئی جواب نہیں ملا، نہ ہاں نہ نہیں۔ اماں اُٹھیں اور اُنھوں نے تالا اُٹھالا۔

اب اُنھوں نے بناوٹی نرمی اور محبت سے کہا۔ "آؤ بیٹی، کمرے میں بیٹھو، برسات کی گرمی میں ایک کونے میں بیٹھے بیٹھے دم گھٹ جائے گا، بیمار پڑ جاؤ گی۔"

وہ ویسی ہی رہیں، نہ اُنھوں نے کوئی جواب دیا۔

اماں ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ "آخر بات کیا ہے؟ کیوں منھ پھلائے بیٹھی ہو؟ بتاؤ! میں تمھاری ساس ہوں، میں ہی تمھارے کام آؤں گی۔"

آہستہ سے آواز آئی۔ "بات تو کچھ نہیں ہے۔ مجھے میرا آدمی چاہیے۔ میں اتنے دنوں بیٹھی تو نہیں رہ سکتی کہ وہ کالج کی پڑھائی ختم کریں۔ انھیں نوکری دلوا دو اور میرے ساتھ کر دو۔"

سب نے یہ سنا تو ہنسنے لگیں، اگرچہ مجھے اس وقت ان کے معنی کا پتہ نہ تھا۔ لیکن برسوں بعد مجھے احساس ہوا کہ پورے ہندوستان میں کسی نئی نویلی دلہن نے اس طرح کا منھ پھٹ مطالبہ کرنے کی بے شرمی نہ کی ہوگی۔ اماں نے شادی کے دن سے اس دن کا خواب دیکھا تھا۔ جب ان کے گھر میں بہو آئے گی۔ اور وہ ساس بن کے بیٹھیں گی۔ اسی لیے اُنھوں نے جرشی کی شادی میں جلدی کی تھی۔ اُنھوں نے ان تمام مصلحتوں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ جو اس طرح کرنے کی ہوئی شادیوں سے پہلے دیکھنی پڑتی ہیں۔ اُنھوں نے بات نکالنے والی آدمی سے لڑکی دیکھ ڈالی تھی۔ پنڈتوں سے جنم کنڈلی پڑھوالی تھی اور ان کو یہ خیال بھی نہ ہوا کہ تھوڑے سے۔ دیہاتی نادان ایک

بدصورت لڑکی کو خوبصورت حد تک بنایا جا سکتی ہے اور یہ کہ نپٹ لوگ ہم جنس نہ لڑکی
قربوں کو ایسا اُلٹ پھیر سکتے ہیں کہ معلوم ہو کہ اس سے زیادہ حیا لڑکی اور حیا لڑکی والی
دلہن دنیا بھر میں اور ہے ہی نہیں۔ لیکن اماں چند توں کی قائل تھیں جو ریت رواج
کے تحت اس کے قائل تھے اس لیے کہ ظاہر ہے جنم جنم سے جو ہوتا آیا ہے اور جسے
خود جیسے بڑے بڑے رشی مہاتماؤں نے چلایا ہے وہ بھلا غلط ہو سکتا ہے!

لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ وہ وہی نہ صرف یہ کہ ست یگ اچھائی کے
دوپہا کے بعد بلکہ تریتا یگ کے بیت جانے کے بھی بہت دنوں بعد کلجگ میں انگریز
کے راج میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اسے پڑھنا لکھنا نہیں آتا یا گیا
تھا اور نہ ہی وہ دین دنیا ہی کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ لیکن آخر جس سوجھ
سے واقف ہوتی تو وہ دھرتی ہی تھی اور یہ ذرا بھی کون نکالتی تھی اور میموں کی طرح آزادی
مانگتی تھی۔ اس کے باپ جگت رام چونکہ باقی ہی کی طرح ضمیر اس کی پیدائش
سے پہلے پیدا ہوئے تھے، پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے تعمیرات نہر کے شعبے میں بابو تھے۔ وہ
چاہتی تھی کہ اس کی شادی کسی ایسے سے ہو تاکہ جہاں کہیں اس کا شوہر تعینات ہو وہیں
وہ بھی چلی جائے۔ اسے یہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ نوکری اور عہدہ کیا ہوتا ہے کیسے
ملتا ہے۔ بس یہ کہ آدمی کو "انٹرنس" پاس ہونا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ
تھا کہ "انٹرنس" کس چڑیا کا نام ہے۔ اس نے سندھی کا قاعدہ پڑھا تھا اس لیے
کہ اس زمانہ میں آغا خان کے مذہبی ادارے کھلوائے گئے تھے۔ ان کا گھر آغا خانیوں کا بڑا
گڑھ تھا۔ لیکن اس نے لکھنا بالکل نہیں سیکھا۔ اس کے ماں باپ سوچتے تھے کہ اچھا
کہ عورتوں کے لیے لکھنا پڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ایک خدا پال سندھی بیوقوف

لڑکی تھی جس میں سے نسائیت تو نام کو نہ تھی۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ وہ ہندوستان کے ابتدائی صنعتی دور کے پیوندی بابو کلاس کی اولاد تھی۔ ہاں اگر اس لڑکی سے یہ توقع رکھتی تھیں کہ وہ مشترکہ خاندان میں ساس کی فرمانبردار بہو بن کر رہے گی اور ان کو سسر جیسا سمجھے گی تو یہ ان کی سادہ لوحی تھی۔

وہ خفتے رنگ کی، نرم و نازک صورت تھیں۔ اس لڑکی سے نفرت کے مارے اندر ہی اندر گھٹتی رہتیں۔ اپنی بہو کے سامنے وہ ہمیشہ گھبرا اور بوکھلا جاتیں۔ ان کی ساری امیدوں اور ارمانوں پر پانی پھر چکا تھا۔ فکر نے ان کی تیوری پر بل ڈال دیے تھے۔ ان کی آنکھوں کے پاس حلقے پڑ گئے تھے۔ ان کی ٹھوڑی پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور انھیں دیکھ کر اب وہ چپ چاپ سی معصوم اور بے بس سا انسان لگتا ان میں نہ تھا۔ ان کا معصوم شکل چہرہ اس طرح ایک سانچے میں ڈھل گیا تھا، جو معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ذرا سی بھی زور دیا تو ٹوٹ جائے گا۔

ان دنوں ہم لوگوں کو اماں بی کبھی کبھی اپنی زندگی کی کہانی سناتیں۔ خود ان کی شادی بہت جلدی ہو گئی تھی۔ اپنے ماں باپ کے دیہاتی گھر میں وہ بڑی بوڑھی تھیں، ننگے سر ننگے پاؤں ادھر ادھر پھرتی تھیں۔ پھر ان پر گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے اور چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری آ پڑی۔ اس لیے کہ وہ بچوں میں سب سے بڑی تھیں۔ پھر ان کو اپنے گھر والوں سے جدائی کا احساس ہونے لگا اس لیے کہ وہ آٹھ سال کی بھی نہ تھیں جب ان کے باپ نے ان کی منگنی کر دی تھی۔ ان دنوں اپنی شادی کی تیاریاں کرنے کی ذمہ داری بھی

داری ہی پر ہوتی تھی۔ انھیں کو اپنے جوڑے ٹھیک کرنے ہوتے تھے۔ لیکن وہ اپنے تمام فرائض کا بوجھ خاموشی سے اٹھاتی رہیں اس لیے کہ ان کا ٹیکہ دینی دھرم کا بن چکا تھا۔ ان کے ماں باپ بڑے سچے سکھ کسان دستکار تھے جو رب کی محبت میں ڈوب گئے تھے۔ وہ مقدس لوگوں کو پاک اپنے یہاں مہمان کرتے اور چونکہ ان کی خاطر مدارات کھلانے پلانے کی ذمہ داری گھر والوں پر ہوتی تھی اس لیے میری ماں نے لڑکپن ہی میں بہت سی گھریلو باتیں سیکھ لی تھیں۔ صاف آسمان کے نیچے لہلہاتے کھیتوں کے پاس ایک دوسرے سے لگے ہوئے، اونچی اونچی کرسیوں اور نیچے نیچے دالانوں والے پکے گھروں کی اس دنیا کا گھریلو ماحول ہی، صبح سویرے جاگنے دودھ بلونے، آنگن کے لیپنے سنوارنے، جھاڑو دینے اور کنویں سے پانی کھینچنے، پکانے، ریندھنے، کھانا پروسنے، چرخہ کاتنے، رنگ چڑھانے اور کپڑے دھونے کا کام ہی ایک ایسا مکمل تجربہ تھا کہ اس کو مقدس ہی بنا کر اسے غلامی اور تنگ دلی کی اکتاہٹ کی سطح سے بلند کیا جا سکتا تھا۔

ان کے باپ نے ان کو نصیحت کی تھی کہ "ساوتری کی طرح بنو۔ گھر والوں کی سیوا کرو، بیوہ مرتے دم تک اپنے شوہر کی وفادار رہو۔" اور ان کی ماں نے دیوی دیوتاؤں کی وفادار بیویوں کی کہانیاں سنائی تھیں۔ ان کی رگ رگ میں ذمہ داری کا وہ احساس رچا بسا تھا جو رواج کے مطابق نوجوان دلہنوں کے ذہن میں پیدا کیا جاتا تھا۔ انھیں اپنے شوہر کے گھر میں اس طرح جانا تھا جیسے مندر میں جاتے ہیں جب وہ آنکھوں سے ساون بھادوں برساتے ہوئے اپنے میکے والوں سے رخصت ہوئیں تو انھوں نے ان نصیحتوں پر عمل کرنے کا عہد کیا تھا۔

اس وقت انھیں ایک ایسا احساس بھی تھا جسے انھوں نے کسی سے نہیں بتایا، ایک ویسے دُلہن کے گھر جانے پر اجنبیت کا احساس جسے وہ جانتی نہ تھیں، جسے انھوں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ ان سے نفرت نہ کریں اس لیے کہ وہ خوبصورت تو تھیں نہیں، اور انھیں اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد چھوڑ دیں۔ اس احساس کو اب تک صرف ان کی ماں کی اس نصیحت نے دبا رکھا تھا کہ وہ کسی بدلے کی امید کے بغیر اپنے سوامی کی سیوا کریں اور اپنے بچوں کو دیکھ کر جئیں، اور اسی کو اپنی خوشی جانیں۔ وہ کب کی بھول چکی تھیں کہ کبھی وہ ایک الھڑ لڑکی تھیں جنھیں پریم کے سکھ بھرے سمے کا چاؤ تھا، اولاد کی تمنا اور اس کے حق کا احساس نہ تھا۔

جب وہ اپنی سادگی اور الھڑپن سمیت ڈھاکا کے صاف آسمان اور کھلے میدانوں سے کوچہ فقیر خانہ کی تنگ گلی میں اپنے شوہر کے چار منزلہ مکان میں آئیں تو پہلے وہاں کے ماحول نے اور پھر ان کی ساس اور شوہر کے برتاؤ نے ان کی ساری خوش فہمیاں دور کر دیں۔ بابا جی اس وقت تک پڑھتے تھے۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر پر ان کی ماں کا راج تھا جو بڑے پکے ارادے کی عورت تھیں، پہاڑوں کی رہنے والی تھیں۔ اور ان کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ جادو جانتی ہیں، اور چونکہ وہ اپنے بڑے بیٹے سے خفا تھیں کہ وہ سناری کا آبائی ہنر چھوڑ کر پڑھنے لگا تھا۔ اور چونکہ وہ اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں اس لیے ان بڑی بی نے اپنا سارا غصہ میری ماں پر چلایا۔ میرے والد کے چھوٹے بھائی پرتاپ چند لاڈلے تھے اس لیے کہ وہ بڑی بی کے کہنے میں تھے

اور انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ اب یہ اور بات ہے کہ انھوں نے ساری دولت عیاشی میں اڑا دی۔ لیکن دادی میرے چچا کے ہتھکنڈوں کا سارا الزام ان کی پہلی بیوی کنگی کی بدصورتی کو دیتی تھیں، جو ان دنوں دق میں مر رہی تھیں۔

پھر بھی چونکہ شادی ان کے والدین نے میرے باجی کی ماں سے طے کی تھی اور چونکہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ والدین اپنے بچوں کا بھلا برا زیادہ اچھا سمجھتے ہیں، اس لیے اماں صبح تڑکے سے لے کر آدھی رات تک اپنی ساس کی ٹہل کرتیں، اور پھر باجی کی مار اوپر سے سہتیں جو وہ اپنی ماں کے جوڑ کانے میں اگر دیا کرتے تھے۔ جب باجی نے پہلی مرتبہ انھیں کرسی سے مارا تو وہ بھونچکا رہ گئی تھیں۔ لیکن پھر انھوں نے اپنے آپ کو بالکل منا دیا۔ جب باجی اتوار کے بارہ گھنٹے کھیل کر واپس آتے اور کھانے بیٹھتے تو وہ بھی گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتیں اور باجی کو پنکھا جھلنے لگتیں۔ لیکن دادی بھلا اپنے بچوں کو چین سے بیٹھے کب دیکھ سکتی تھیں، وہ اماں کو بات بے بات کوسنا شروع کر دیتیں، ذرا سی بات نکال کر ادھیڑ کے رکھ دیتیں اور ان سے کہتیں کہ چلی جائے رسوئی میں کام کرے۔ کھانے کو انھیں ایک سوکھی روٹی اور ایک ذرا سی دال ملتی، اور اگر وہ نظر بچا کے نکال لیں تو آم کے اچار کی ایک پھانک۔

دادی بڑی بے دردی اور سختی سے کام لیتی تھیں۔ وہ بزازوں سے کپڑا لے کے اماں سے اور پرتاپ کی بیوی سے چھلکاری بنواتیں اور اس کے پیسے خود دبا لیتیں حالانکہ ان کے پاس تیلی کے بٹوؤں میں ہزاروں روپے جمع تھے اور ان کے کمرے کے کونوں میں سیکڑوں اشرفیاں دفن تھیں اور

وہ آدھے دام میں مکانوں کا کرایہ وصول کرتی تھیں۔

اماں ان خوبصورت پھلکاریوں کا ذکر کرتی تھیں جو انھوں نے اپنے وقت بنائی تھیں۔ گھر کے بنے ہوئے اور ہاتھ سے کتے سوت سے رنگے ہوئے کپڑے پر سنہری ریشم کا نفیس کام۔ اپنی بنائی ہوئی ایک پھلکاری انھیں خاص طور سے بہت یاد آتی تھی، جسے انھوں نے رنگ برنگے ریشم سے بنایا تھا اور اسے وہ دنیا کی قیمتی چیزیں اپنی ساس سے ڈرتی تھیں اور اسے بازار سے خرید لینے کی اجازت نہ مانگتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں "اب آج کل کی لڑکیاں پھلکاری پہن لیتی ہیں، ہم [illegible] کرتی ہیں۔" اس سلسلے میں ان کو خود اس بات کا فخر بھی رہا تھا اور اپنی بیٹی [illegible] رنگ والی چیز سے نفرت بھی۔" اور اگر کرتی بھی تھیں تو ہوائی ولایتی انگریزی بھڑکیلے رنگے ہوئے کپڑے پر۔

وہ ننھے ترکیب کے اندر جب ہاتھ دوں کی صورت میں کپڑے کو تیل میں تر کر کے سو جتنوں سے رنگ برنگے خوبصورت پھولوں کا رنگ نکال کے پھول بنا سکتی تھیں۔ زمانہ واقعی بدل گیا۔

وہ دادی کا برتاؤ اس سبب سے برداشت کرتی رہیں اور اس کے بعد دعا مانگتی رہیں کہ بڑی بی کچھ نرم پڑ جائیں۔ لیکن دادی کے برتاؤ کی ذکر میں انھوں نے تمنا کی اور نہ ان کی ذرا برداری میں فرق آیا۔ [illegible] کے ابا جی نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور سیالکوٹ کی چھاؤنی میں ۳۰ ویں ڈوگرا رجمنٹ میں، جو کہ نئی نئی قائم ہوئی تھی، بڑے بابو کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ جس سال ابا جی نوکری میں آئے اسی سال میرا بڑا بھائی مہرنشیں پیدا ہوا۔ اماں نے دادی کی گود میں

کچھ دھیمی اور نرمی محسوس کی۔ یہ تو وہ نہ سمجھ سکیں کہ ایسا کیوں ہے لیکن یہ انھوں نے ضرور محسوس کیا کہ بڑی بی پہلے سے زیادہ نرمی سے پیش آتی ہیں، بچے کو پیار کرتی ہیں، اس کے لیے کپڑے بنواتی ہیں اور اس کے لیے تو انھوں نے گہنے بھی بنوائے۔ اس سے اماں بہت خوش ہوئیں اور وہ پہلے سے بھی زیادہ لگن کے ساتھ ساس کی خدمت کرنے لگیں۔ رات کو ان کے ہاتھ پاؤں دباتیں، اس لیے کہ بڑی بی ہمیشہ بیمار رہتیں۔ بڑے بیٹے کے دورے پڑنے کے غم اور چھوٹے کی بری حرکتوں نے ان کو نڈھال کر دیا۔ چھوٹے صاحبزادے روز ایک نئی رنڈی لاتے اور دوکان کے اوپر والے کمرے میں محفل جماتے اور نیچے ڈیوڑھی میں ان کی تپ دق کی مریض بیوی پڑی کھانستی رہتی۔

پھر مہینوں کی بیماری اور گھٹنے کے بعد بڑی بی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ لوگ کہتے تھے کہ انھوں نے جب اپنی روح ایک بی کے کان میں پھونک دی، تب جا کے وہ اپنی جان چھڑا پائیں۔ تھوڑے ہی دنوں بعد کشتی بھی سدھار گئیں۔ انھیں تو ان کی ساس کی اس ازلی خواہش نے کہ گھر پر اُن کا راج رہے، اور ان کے شوہر کی لاپرواہی نے مار ڈالا۔

اماں تھوڑے دنوں اس گھر میں رہیں اور انھوں نے پرتاپ کی شادی ان کی موجودہ بیوی دیوکی سے کروا دی، حالانکہ پرتاپ نے اس لڑکی اور بڑی خود اماں اور باپ کی کوئی نہ دیا کہ پیچھے سے گھر کی ساری جائداد پر قبضہ کر لیا اور اس کا بڑا حصہ سال بھر میں رنڈی بازی اور شراب نوشی میں اڑا دیا تھا۔

جب اماں غیر قدر پر چھاؤنی میں باپ کے ساتھ رہنے کے لیے گئیں تو جب

ان کی تجینت کی بولی ہوئی تھی، تب گنیش پیدا ہوا۔ میں دو سال بعد پشاور میں پیدا ہوا۔ میرے سال بھر پیچھے پربھتی پیدا ہوا جو لاہور میں چار سال کی عمر میں مر گیا تھا۔ تنہا شیو سب سے چھوٹا تھا۔

کسی نے بتایا کہ وہ پچی کی ماں نے اس سے پوچھا تھا کہ "کیا تیری ماں کے یہاں پھر خوشی ہونے والی ہے؟ تو تیرے شوہر کا حصہ اور بھی تھوڑا ہو جائے گا۔"

سُننے میں تو یہ آتا تھا کہ وہ پچی کے میکے والے اماں اور ان کے بال بچوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیا کرتے کہ یہ سب بچے تو فضل سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ ہر وہ پاؤں بھاری ہونے پر وہ بچے گرا تو سکتی نہ تھیں۔ اماں کہتیں: "کتیاں اچھی ہیں، اچھوری گتیاں! میں ایسی نادان تو نہ تھی، میں نے بچے بچے جان کے پیدا کیے ہیں۔ ان کی اپنی اولادیں ان کے شرابی کبابی خصم کے نطفے کا نتیجہ نہیں ہیں؟ بچے تو فقیروں کی پیداوار! میرا نام و عزت ہی بنت، اس لیے کہ ہم لوگ رب کا دیا کھاتے ہیں، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے نہیں جاتے۔ اور اب تو میں نے اپنا رحم نکلوا ہی دیا۔" اور اس طرح بچے چھوڑنے کے بعد وہ اس غیر حقیقت کو بالکل نظرانداز کر جاتی تھیں کہ ان کے اور گروہ کے دوسرے لوگوں کے بچوں کی طرح ان کے بچے بھی لاپرواہی کا نتیجہ تھے اور انھوں نے اپنے شوہر کے ہر وقت کے تقاضوں کا نتیجہ بھگتنے کے خیال سے عاجز آ کر آپریشن کروا لیا تھا۔ وہ ننھے منے کے لال پیلی ہو کر کہتیں: "ذرا میرے خاندان کے بارے میں زبان کھولنے کی ہمت تو کریں، ایک ایک کو کچا چبا جاؤں گی!" اور وہ زندگی کو سکھ چین اور ہر طرح کے آرام آسائش کا رنگ دینے کی کوشش

میں، کمیوں اور خامیوں کو نظر انداز کر جائیں اور خوبیوں کو اجاگر کریں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا کنبہ پھلے پھولے۔ یہ بڑی آسان بات تھی اس لیے کہ باپو جی کی روپیہ جوڑنے کی زبردست خواہش اور ایک بڑے پریوار میں اماں کے کھو بن جانے کی وجہ سے ان کے اور باپو جی کے درمیان عقل سلیم کی ایک مضبوط بنیاد بن گئی تھی اور چونکہ طلاق کا کبھی ان لوگوں کو خیال بھی نہ ہوا تھا، اس لیے کہ ہندو دھرم میں اس وقت طلاق جیسی کوئی چیز تھی ہی نہیں، اور اس لیے بھی کہ انتہائی بے میل جوڑے بھی اپنے آپ کو بہلا لیتے تھے اور تقدیر کے لکھے کو مانتے تھے جس نے انھیں اکٹھا کیا تھا۔ اماں اور باپو جی نے بھی اس قید کو قبول کر لیا تھا جس میں وہ پڑ گئے تھے اور وہ دونوں کچھ ایسے بے جوڑ بھی نہ تھے۔ وہ اپنے سوامی اور پتی کا حکم مانتی تھیں اور باپو جی ان کی خدمت کو قبول کرتے تھے کہ خدمت تو بیوی کا دھرم ہی ٹھہرا۔ چنانچہ اماں پوری کچی غلامی سے بچ کر ایک طرح سے فرضی تخت پر بٹھا دی گئی تھیں۔

تو باپو جی بس نام کے مالک تھے اور سوامی تھے۔ اصل میں گھر کے اندر تو اماں کا راج تھا، حالانکہ کہنے کو باپو جی کی حیثیت ایک من موہن دیوتا کی سی تھی جو جب کبھی اماں حد سے گزرنے لگتیں تو برس پڑتے اور سارا گھر اس طرح سر پر اٹھا لیتے کہ دیکھتے بنے۔ اماں اور باپو جی باری باری سے مالک اور داس بنے۔ بنتے تھے، کبھی تو باپو جی کا حکم چلتا اور کبھی اماں ہی سب کچھ ہوتیں۔ پھر بھی اگر ان کی ازدواجی زندگی کا حساب کتاب کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ باپو جی زیادہ تر ایک بچے کی طرح اماں کی بات مان لیا کرتے تھے اس لیے

دنیا میں ہندوؤں سے زیادہ ذہن مُردہ اور کوئی نسل ہے ہی نہیں۔

اب یہ لڑکی، وہ، دیدی، بہو، وقت سے پہلے ہی آ دھمکی تھی اور اس نے گھر کے سارے منصوبے تہس نہس کر ڈالے تھے۔ اماں یہ سمجھے ہوئے تھیں کہ کم عمری کی شادی ایک طرح کی منگنی ہوتی ہے اور رخصتی تو جوانی میں پہنچنے کے چار سال بعد ہوتی تھی۔ جب تک میں ہر شپ سینڈیل اسکول کی پڑھائی ختم کر لیتا۔ لڑکے اور لڑکی میں کسی جذباتی لگاؤ کے ہونے یا نہ ہونے کا خیال بھی انھیں نہ ہوا تھا اسی لیے اب ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس شادی کا کیا کریں، کیا سوچیں اور کیا کہیں۔ وہ خود اپنے کسانوں والے تنگ نظریات کے دائرے سے باہر نکل سکی تھیں۔ اور انھوں نے آزمایا تو وہ بھی تو ان کے گاؤں کی لڑکیوں سے بھی زیادہ اونچی اور ادبی نکلی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی اور اپنے گھنے کی برتری کی اور بھی قائل ہو گئیں۔

وہ کہتیں، "اس غیر کے آ جانے سے میرے خاندان میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ اپنے بیٹوں کے لیے اگر کسی طرح وہ اپنے ہی گھرانے سے بہوئیں لا سکیں تو وہ ایسا ہی کریں گی اور تیری میری لڑکیوں کو تو ہرگز اپنی بہو بنا کر نہ لائیں گی۔ ان بہوؤں سے وہ بس بچے چاہتی تھیں جو ان کے پوتے ہوں۔ لڑکیوں کی انھیں رتی برابر بھی پروا نہ تھی۔ کوئی بھی تو گھنٹوں کی یاد منانے جانے کی ضرورت تھی، بس منہ کھولنے کی دیر تھی اور دکھ تو انھیں جھیلنا ہی چاہئیں نہیں تو یہ کیسے سمجھیں گی کہ زندگی ہوتی کیا ہے؟ خود انھوں نے کون سے پاپڑ نہیں بیلے! اور اب اس سب کا پھل مل رہا ہے۔

اس لیے کہ ان کے بیٹے ان کے آگے ہیں۔ اب ان کا نام چلے گا اور پنڈ دان چڑھے گا۔ ٹھیک ہے کہ انھوں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں بڑے بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ ڈانٹ پھٹکار بھی سہی، مار بھی کھائی، لیکن ایسے ہی دیکھا جائے تو پھر خوشی سے ہی کیا؟ ......

رجمنٹ کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگیں اور سنکھ بجے اور سپاہیوں کے منتر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آسمان پر اِکا دُکا مدھم ستارے نکل آئے تھے۔

برآمدے سے ہوتے آنگن کے ایک کونے میں اماں نے اپنے برتن بھانڈوں کے بیچ میں چٹائی پر بیٹھے ہی بیٹھے آنکھیں بند کر لیں، سر جھکا لیا اور ہاتھ جوڑ لیے۔

اور کچھ اشلوک پڑھنے لگیں۔

مجھے اس بات سے بڑی ہی گھبراہٹ ہوئی اس لیے کہ وہ مجھ سے الگ ہو کر، دور چلی گئی تھیں۔ جیسے وہ دوپہر میں سوتے وقت بھی چلا جایا کرتی تھیں۔ ذرا دیر تو میں نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے سفید گالے جیسے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ اور چاندوں کی مدھم شکلیں پہچاننے کی کوشش کی، لیکن پھر میں اکتا گیا۔ میں نے اماں کو دیکھا، لیکن وہ اب تک کچھ خالی خالی سی آنکھوں سے تکے جا رہی تھیں۔

میں کھسک کھسک اور نیند میں ڈوبی آواز میں منمنایا۔ "اماں"

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اتنے میں دور سے پاجی کی آواز پھر آنے لگی۔

اماں نے اپنا دھیان توڑ دیا اور چولھے پر چڑھی ہوئی زہر مہرے کے رنگ کی سنی کی ہانڈی میں سے چمچ کی ڈوئی ڈال کر یہ دیکھنے لگیں کہ دال گل گئی ہے یا نہیں۔

اور خود ہی خود بڑبڑائیں:

”بگھارنے لائق ہو گئی ہے۔“

اور انھوں نے چولھے سے لکڑیاں باہر کھینچ لیں کہ آنچ کم ہو جائے اور روٹیوں کے لیے گندھے ہوئے آٹے کو دیکھنے لگیں۔

میری بھابی اب بھی گوشت بھنانے کرنے میں لگی بیٹھی تھیں، شاید وہ رو رہی تھیں۔

ابا شہر جاتے ہوئے اندر آئے، میرے دونوں بھائی ان کے پیچھے تھے اور دور سے گونجتی ہوئی آوازیں، انھوں نے پوچھا:

”ہریش کی ماں کھانا تیار ہے؟“

اماں نے اطمینان سے جواب دیا: ”ہاں، دال ہو گئی ہے، بس بگھار کے بس چپاتیاں ڈالتی ہوں، تم نہا کے آ جاؤ۔“

”اچھا ہم ابھی نہا کے آتے ہیں۔“ ابا نے خوش ہو کر کہا۔ ”چلو گنیش، آؤ ہریش، ہم لوگ باہر کنویں پر چل کے نہا آئیں۔ ارے کرشنا! کہاں ہے تو؟ میری لاڈلی بٹیا کدھر ہے؟ چل تو بھی..... ہریش کی ماں، میں بچوں کے لیے ایک بڑا سا تربوز لایا ہوں۔ وہ دوپہر کی کھانے کی شوق سے۔ ہے کہاں وہ؟ لیکن..... اس طرح منہ لٹکائے کیوں بیٹھی ہے؟ تم اس سے کچھ کہتیں کیوں نہیں؟

کمرے سے نکل کے ذرا ہوا میں بیٹھیے؟ وہاں تو بڑی گھٹن ہے اور کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے۔"

"بہو رانی خفا ہیں۔" اماں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کہا تم نے؟" ابا زور سے گرجے۔ اس میں انھیں گرمی کی جھلک ہی تھی، وہ بہو کے بارے میں ویسے بھی فکرمند تھے اور ایک کان سے اونچا بھی سنتے تھے۔

"خفا ہیں۔" اماں نے دوہرایا، ایک ایک لفظ پر زور دے کر۔ انھوں نے ایسا لہجہ بنایا جیسے وہ اس سارے قصے سے عاجز آ گئی ہوں اور بہو رانی خفا ہیں تو ان کی جوتی سے۔

"خفا ہیں؟" ابا نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ "آخر کس بات پر؟"

"کہتی ہیں کہ ہم لوگ ان کے خصم کو ان کے حوالے کر دیں۔" اماں نے اطلاع دی۔

مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ کاہے کی بات ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی میں کان لگائے رہا اور مجھے تناؤ کا احساس تو تھا ہی۔

ابا جب رسوئی میں ٹاٹ پر کھانے بیٹھے تو اماں ان کو گھر اور باہر کی دن بھر کی خبریں سناتیں۔ اس طرح ابا کو وہ بہو سے بات کرتے پائے، مجھے بغیر ہی پوری طرح معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بہو کیا سوچ رہی تھی۔ جب سارے معاملے نے ان کے دماغ میں گرمی پیدا کی، اور انھیں گھر کے ماحول میں تناؤ کا اندازہ ہوا تو وہ غصے سے بھنّائے، ان کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ وہ چلا پڑے۔ "تو کیا اسے اپنے شوہر کی لگی ہے۔ میں تو اپنا فرض پورا کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ اب اس کی بہو یہ نہیں چاہتی تو نہ سہی۔ میں نے تم سے بتایا نہیں کہ کرنل صاحب کی

صرف تمہیں ڈپارٹمنٹ کے انسپکٹر جنرل صاحب نے ہرشی کو نائب جیلر کی نوکری دینے کے لیے کہلوا دیا ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ہرشی یہ نوکری کرے گا۔ تنخواہ تو تھوڑی ہی ہے، وہ بھی مہینہ ہی کا ہے لیکن اس میں عزت بہت ہے۔"

ماں چپ رہیں۔

پاپا نے غصے ہی میں مڑ کر ہرشی سے پوچھا۔ "کیوں ہرشی، تیرا کیا خیال ہے؟"

ہرشی اس وقت بھی چپ رہا۔ اور دالان میں جا، پائی پر سر جھکائے تھا، ماں کے گھٹنے سے جھکائے اندھیرے میں چھپا بیٹھا رہا۔

"میرا جو فرض تھا، وہ میں نے کر دیا۔" پاپا نے کچھ دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد اداس ہو کر ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اب لڑکی کو بیاہ، جب میں شکل تو ہوگا ہی اور وہ ہرشی کی پڑھائی ختم ہونے تک۔ اپنے میکے میں بھی نہیں۔ جتنا چاہتی تو اچھا یہی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ اس نوکری پر چلی جائے جو میں نے اس کے لیے ٹھیک کر دی ہے۔"

سب لوگ چپ تھے۔ عجیب سناٹا تھا۔ بات کے سناٹے میں بس ایک جھینگر کی آواز آ رہی تھی یا پھر تو کا، یوں کے اس کھیت میں سے، جو پاپا نے گھر کے پیچھے اس جگہ بنا رکھا تھا جہاں نل کا پانی بہہ کر جاتا تھا۔ مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز آ رہی تھی۔

"چلو بیٹی، جا کے سو جاؤ" پاپا نے سگریٹ پینے کے لیے بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اور کرشنا کو بھی اٹھا لے۔ اسے بھی پتا ہے؟" پتا نے کے نام پر ہی میں سوتا بن گیا تھا۔

گنیش نے اگلے دن اسکول جانے کی تیاری میں بڑے دھوم دھڑکے سے
اپنا بستہ ٹھیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ گرمیوں اور برسات میں ہم لوگ رات کا کھانا
کھا کے سو جایا کرتے تھے اور اسے صبح سویرے ہی اٹھ کر اسکول جانا ہوتا تھا۔
بیٹھک سے اٹھ کر ابا کچھ دیر تک اس کے پاس کھڑے رہے اور پھر گویا کوئی
اور بات پھیر کر اس جھنجھٹ سے اپنی جان چھڑانے کے لیے انھوں نے کہا:
"بیٹے، اگلے ہفتے سے کرشنا کو بھی اپنے ساتھ اسکول لے جانا...... میں سمجھتا
ہوں اب وہ سمجھو کافی بڑا ہو گیا ہے، اسے اسکول جانا چاہیے۔"

۲

جب میں اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے بھائی گنیش کی انگلی پکڑے اور اپنے
بائیں ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں ڈالے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا تو بڑا
خوش تھا۔ مجھے خوب نہلا دھلا کر نئے لٹھے کی شلوار اور خاکی ڈوریئے کی قمیص
پہنائی گئی تھی، سر پر رنگ برنگا پشاوری ریشمی رومال بندھا تھا اور نئے گلے
جوتے، جو میں نے برش کے بیاہ میں پہنے تھے اور اس کے بعد خاص موقعوں
کے لیے رکھ دیے گئے تھے، پاؤں میں تھے کہ راستے میں کانٹے کنکر نہ چبھیں۔ میں
واقعی بہت خوش اور جوش میں تھا۔

اس لیے کہ اسکول جانا سال بھر سے میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔
روز میں اپنے بھائی کو اسکول جاتے دیکھتا اور خود بھی اسکول جانے کے لیے مچلتا۔
میں نے سُن رکھا تھا کہ اسکول جانے اور اسکول سے آنے میں راستے بھر گنیش اور

درختوں کے دوسرے راستے پیچھے مزے کرتے تھے۔ بیریں کھاتے تھے، ڈنڈے اور گولے پکڑتے تھے اور طرح طرح کے کھیل کھیلتے تھے جن کے نام سن کر ہم دنگ رہ جاتے تھے اور میرے اندر تجسس اور ان سب ہنگاموں میں خود بھی شریک ہونے کی خواہش نے مجھ میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ میں ہمیشہ سے بابا جان کہا کرتا تھا کہ مجھے اسکول بھیجیں۔

وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے: "بیٹے تو تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔" اور میں ان سے طرح طرح کی دلیلیں دے کر بحث کرتا کہ نہیں، اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں دل میں جانتا تھا کہ میں بڑا نہیں ہوں اور من ہی من میں دعا کرتا: "ایشور، مجھے بھی میرے بڑے بھائی جتنا بڑا کر دیں۔ البتہ مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ اگر میری دعا قبول ہو گئی اور میں راتوں رات گنیش جتنا بڑا ہو گیا تو کہیں اس کی طرح میری ٹانگ بھی ٹیڑھی نہ ہو جائے، کان اسی جیسے بے ڈھنگے ہو جائیں اور اس کی طرح اوپر کے بڑے دانت بھی نکل آئیں۔ لیکن میں نے ایشور سے اپنی دعاؤں کے نتیجے میں اپنے قد میں کوئی خاص فرق نہیں دیکھا اور میں روٹھ گیا۔

اباجی نے کہا تھا: "ابھی وہ دن دور ہے کہ تجھے اسکول بھیجا جائے، ذرا ٹھہر جا۔ اسکول بھیجا گیا تو پھر تو ہی روئے گا کہ تجھے گھر ہی پہ بٹھا دیا جائے۔"

میری سمجھ میں نہ آتا کہ بھلا ایسا کیوں ہو گا۔ اور میں نے بالکل دوسرے ہی طریقے سے اپنی ضد پوری کرانے کی تدبیر کی۔ گنیش جب شام کو ابا کے پاس بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرتا تو میں بھی دہراتا جاتا۔ اس کی کتاب، سلیٹ اور کاپیوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا اور ہر چیز میں اس کی نقل کرتا۔ جب میں گنیش کے ساتھ ساتھ

توتے کی طرح ۔ ۔ وہ کی پہلی پرائمر یا گنتی پہاڑے دوہراتا تو ابا خوب ہنستے اور جب کہیں میرا بھائی بھولتا یا اٹکتا تو میں فوراً بڑی شان سے لقمہ دیتا۔ ابا خوش ہوتے، مجھے پیار کرتے اور میری خوب تعریفیں کرتے اور میرا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا۔

ایک دن ابا نے کہا کہ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے جتنا پڑھنے کا شوق ہے اتنا ہی میرا حافظہ بھی اچھا ہے اور انھوں نے مجھے گھر پر پڑھانا شروع کر دیا۔ چند ہی مہینوں میں میں نے پہلی پرائمر ختم کر لی اور اپنے بھائی کی دوسری کی کتاب بھی شروع کر دی۔ اب گنیش کو جلن ہونے لگی اور گنیش نے صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے اپنی کتابوں کو ہاتھ بھی نہ لگانے دے گا اور ہم دونوں میں خوب نوچ کھسوٹ، دانت کٹول، چیخنا چلانا اور رونا دھونا ہوا۔

اس کا علاج یہی تھا کہ مجھے اسکول بھیج دیا جائے۔

لیکن جب میں صبح کو تیار ہو کر چلا تو میرا منجھلا بھائی مجھے لیجانے پر کچھ زیادہ خوش نہ تھا۔ اس پر وہ بہت کڑھا ہوا تھا کہ میری ذمہ داری اور دیکھ بھال اس کے سر ڈال دی گئی۔

جیسے ہی ہم لوگ گھر سے اتنی دور ہوئے کہ ہماری آواز گھر تک نہ پہنچ ویسے ہی اس نے چلا کر کہا۔ ''تیز چل۔ سور، تیز کیوں نہیں چلتا؟'' اور یہ کہہ کر کے اس نے اپنی انگلی میرے ہاتھ سے چھڑا لی۔ میں نے جھلا کے اور اپنے پیچھے منہ کو بند کر کہا۔ ''ذرا اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کو پھرتی سے اٹھا، وہ دور، بے ویسے ہی دیر ہو گئی ہے۔''

میں اس پر چونکا۔ پر کٹ کے رہ گیا۔ بھائی کی تو کوئی بات وقتی تھی گنیش نے جو اپنا ہاتھ چھڑا لیا تو مجھے ایسا لگا جیسے اس نے "کٹی" کر لی، میرے ساتھ دھوکا کیا! مجھے ایسا لگا کہ یہ مجھے چھوڑ جائے گا اور میں بھٹک جاؤں گا۔ اسکول تک پہنچ ہی نہ پاؤں گا۔ اسکول جانے کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ میں رونے لگا اور میرے کان بجنے لگے۔ اور روتے سسکتے میں اپنے بھائی کے پیچھے بھاگا۔

اس ڈر کے مارے کہ کہیں میرے رونے چلانے کی آواز وہ سن لیں گنیش ذرا دیر کو رک گیا۔ لیکن مجھے آتا دیکھ کر پھر چل پڑا۔ میں چند گز تو دوڑا لیکن جو میں نے دیکھا کہ گنیش بھی بھاگ رہا ہے تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں نے اس کو پکارا۔ "بابی!"

گنیش نے مڑ کر دیکھا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ گھر بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے اور اب میری چیخ پکار وہاں تک نہیں پہنچے گی۔

میں گنیش کا دماغ ٹھیک کرنے کے لیے مٹی میں لوٹنے ہی والا تھا لیکن میرے بھائی کا تو کہیں پتہ نہ تھا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں اور زور لگا کر گنیش کے پیچھے بھاگا۔ اس بار میں نے اسے پکڑ لیا۔ میری سانس نہیں سما رہی تھی اور پسینہ بہنے لگا تھا۔

"نہیں ....!" میں نے گنیش کی انگلی پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے گالی دی۔ "مجھے کیوں چھوڑ کر جا رہا ہے!"

گنیش نے احتجاج کیا۔ "چھوڑ مجھے جانے دے، مجھے مت پکڑ!" مارے غصے کے اس کے گال لال ہو رہے تھے۔ "مل اور دوسرے لڑکے پیچھے گئے ہوں گے

اگر تو نہ ہوتا تو میں ان کو پکڑ لیتا۔" اور اس نے پھر ہاتھ جھٹک کر اپنی انگلی چھڑا لی اور دوڑنا شروع کیا۔

"ارے ٹھہر جا، مجھے بھی ساتھ لے چل۔" میں مایوس ہو کر سسکیاں بھرنے اور پورا زور لگا کر دوڑنے لگا اس لیے کہ میری خوب گھیردار شلوار میں ہوا بھر گئی تھی۔ میں چلّایا۔ "ارے ٹھہر جا، سور، کتے، شیطان!"

جب گنیش کوئی پچاس گز مجھ سے آگے نکل گیا تب شاید اس نے علی کو اپنے گھر میں جاتے دیکھ لیا۔ پہلے وہ بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ اب گنیش رک کر میرا انتظار کرنے لگا۔

میں روتا بسورتا ایک تنگ گلی کے نکڑ پر پہنچا جس کے ایک طرف بارکوں کی کچی پکی چاردیواری تھی اور دوسری طرف ایک کمرے والے نیچے نیچے گھروں کی پوری قطار تھی جن میں بینڈ والے اور کچھ شادی شدہ سپاہی جنھیں بال بچوں کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مل گئی تھی، اور رجمنٹ کے ساتھ رہنے والے دھوبی، نائی، موچی اور بھشتی رہتے تھے۔

"علی کی ماں، علی اسکول چلا گیا؟" گنیش نے بچے گھر کے دروازے پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے کو اٹھا کر پوچھا۔ یہ ایک طرح سے اندر آنے کی اجازت مانگنی تھی اس لیے کہ مسلمان بینڈ مین اپنی عورتوں کو پردے میں رکھتے تھے۔

اندر سے علی کی ماں کی کرخت آواز آئی۔ "نہیں، ابھی بھیا یہ حرامی ابھی تو سو کے اٹھا ہے اور جا کے دھوپ میں بیٹھ گیا۔ اسکول کی کسے پرواہ ہے؟ آجاؤ بیٹا۔ اس نکھٹو کے [illegible] جاؤ۔"

گنیش کو کچھ اطمینان ہوا۔ علی کے ساتھ تو اسکول جانے میں اسے اپنے اوپر بڑا بھروسہ ہو جاتا تھا۔ کمزور طبیعت کا تھا نا، اس لیے اکیلے دیر سے اسکول پہنچنے اور ماسٹر جی کی قمچی کھانے سے بہت ڈرتا تھا۔ اگر جینت کے دوسرے لڑکوں کی بھی پٹائی ہو جائے تو ایک دوسرے کی نظر میں ان کی ہیٹی نہ ہوتی تھی۔

میرا بھائی آگے آگے گھر میں داخل ہوا۔

میں اس کے پیچھے تھا۔ ایک اجنبی گھر میں داخل ہونے پر جھجکا اور شرمایا ہوا لیکن ایک خوش رنگ مرغا دیکھ کر، جو گھر کی دیوار پر ککڑوں کوں کر رہا تھا، میرا سارا ڈر دور ہو گیا اور جب میں نے اس ایک کمرے والے گھر کے بیچ آنگن میں دالان کے آگے صحن کے مرغی خانے میں درجنوں چھوٹے چھوٹے چوزے دیکھے تو میرا سارا شرمیلا پن بھی جاتا رہا۔

میں نے گنیش کی قمیص کھینچتے ہوئے کہا: "دیکھو دیکھو۔ ذرا ان ننھے ننھے چوزوں کو دیکھو۔" اور میں ایک کو پکڑنے لپکا۔ چوزوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مرغیاں کٹ کٹاتی ہوئی گھر بھر میں دوڑنے لگیں اور ان کے پیچھے پیچھے چوزے۔

علی کی ماں کرخت آواز میں مگر خوش مزاجی سے ہندوستانی میں چلائیں: "ارے انھیں نہ دق کرو۔ تم ہندو لوگ چوزوں کو مار کے کیا پاؤ گے۔ انھیں تو مسلمان کھاتے ہیں۔" بہرحال میں دالان کی دہلی پر کھڑا رہا اور چوزوں کو صحن کے دوسری طرف والے کمرے میں بنے ہوئے ڈربے میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔

گنیش کھڑا علی سے باتیں کر رہا تھا جو زمین پر بیٹھا ہوا ایک ٹونٹی والے

میرا سب سن کا دھن اپنے ہاتھ اور منہ پر چھینٹے ڈال رہا تھا جیسے پانی سے ڈر رہا ہو۔ جو بدقسمتی سے واقعہ تھا اس لیے کہ مسلمانوں کے یہاں وضو کا نہانا مذہب کے فریضوں میں تو ہے نہیں۔

”آؤ گنیش“ علی کے باپ احمد نے کہا، جو ایک موٹی سی چکٹ رضائی میں لپٹے ایک بڑی سی چارپائی پر بیٹھے گڑگڑی پی رہے تھے۔ جس چارپائی پر وہ بیٹھے تھے وہ چھوٹے سے اندھیرے کمرے کے آدھے سے زیادہ حصے پر چھائی تھی اور یہی کمرہ پانچ پانیوں کے کنبے کے لیے بیٹھک بھی تھا، سونے کا کمرہ بھی، رسوئی بھی اور گودام بھی۔

گنیش اور میں کمرے میں آ گئے اور چارپائی کے پایوں تک آ کر کھڑے ہو گئے۔ علی اب اپنی بہن عائشہ اور اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ بیٹھا تھا، اور تینوں ایک بڑے سے پیالے میں گوشت کا گرم گرم سالن اور چنگیر بھر چپاتیاں بیچ کھانے میں جٹے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دہنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے روٹی کا نوالہ توڑتے، سالن میں ڈبوتے اور منہ میں بھر لیتے۔ علی کو جلدی تھی اور اس لیے وہ اپنے منہ میں گوشت اور روٹی ٹھونسے جاتا یہاں تک کہ اس کا ایک گال پھول کر کُپا ہو جاتا اور پھر وہ سب کا سب چبائے بغیر ہی نگل جاتا۔

بچے تو ماں نے سلیقے اور آداب کا کچھ بھی نہیں سکھایا تھا۔ اماں کو ویسے بھی صفائی ستھرائی کا خبط تھا۔ چنانچہ میں اس چپاتی کی کانے سے منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اُدھر چولہے میں دھوئیں کے زبردست بادل اُٹھ رہے تھے اور علی کی ماں

اس کے پاس بجھی ہوئی لکڑیوں کی جھکنی میں سے اپنا سارا دم لگا کے پھونک رہی تھیں جل کے آیا جو لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے وہ گیلی تھیں اور جلنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں اور فضا میں پیاز اور لہسن کی تیز مہک بسی ہوئی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔

علی کی ماں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ نا"۔ مجھے اپنے کپڑوں کا خیال تھا اس لیے میں ہچکچایا۔

علی کی اماں بھی گئیں اور انھوں نے ایک چھوٹی سی چٹائی میری طرف سرکاتے ہوئے کہا: "لو میاں ستھرے، بیٹھو۔" پھر انھوں نے گنیش کو اس کے پیار کے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔ "ہروٹ، تو بھی بیٹھ جا۔"

ہم دونوں بیٹھ گئے، شرماتے ہوئے خاموشی سے اور کہ "اچھے" بچوں کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

میں یہاں پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور مجھے خاص طور سے اس بات سے دلچسپی تھی کہ ہمارے گھر اور اس جھگی نما گھر میں کتنا فرق تھا۔ ہمارا گھر تو ایک جونیر ہندوستانی افسر کا کوارٹر تھا جس میں دو بڑے بڑے کمرے تھے، رسوئی تھی، غسل خانہ تھا، پاخانہ تھا اور بڑا سا صحن تھا۔ یہ گھر میرے ابا کو اس لیے دیا گیا تھا کہ "کام کے کرنل" تو وہی تھے اور ان کی حیثیت کمیشن افسر سے کم تھوڑے ہی تھی۔ اس گھر میں پیتل کے برتن تو تھے ہی نہیں۔ زیادہ تر برتن مٹی کے تھے اور ایک دو المونیم کے جبکہ ہماری اماں کی رسوئی تو پیتل، کانسی اور چاندی کے برتنوں سے جگر جگر کرتی رہتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو ان لوگوں سے بہتر محسوس کیا اور ان کے لیے میرے دل میں حقارت پیدا ہو گئی اس لیے کہ ...

کر ہائے ابا اماں "نچ دیکھیے!" کہا کرتے تھے۔

"تم لوگ کچھ کھاؤ گے؟" علی کی اماں نے اپنے گول مٹول جسم کو بل دیتے ہوئے پوچھا۔ سر سے پاؤں تک وہ شوخ رنگ کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی اور چاندی کے گچھوں پاتوں، بڑے بڑے جھمکوں، بلاق اور کیل، طوق چوڑیوں اور پازیبوں سے لدی پھندی تھیں۔

"نہیں، ہم لوگ کھانا کھا کے آئے ہیں۔" میں نے اور گنیش نے ایک ساتھ ہی کہا۔ اس لیے کہ ہم کو تاکید تھی، خاص طور سے بڑا گوشت کھانے والے مسلمانوں کے یہاں کھانے کو کچھ دیا جائے تو یہی جواب دینا سکھایا گیا تھا۔

"اب تمھیں پان بھی نہیں دے سکتی، اس لیے کہ تم بھول جاتے ہو۔" علی کی اماں نے بھیگے کپڑے میں سے دل کی شکل کا ہرا پتا نکالتے ہوئے کہا۔ اس پر انھوں نے چھالیہ تانبے کی ایک گول کٹیا میں سے ایک سفید چیز اور پھر ایک لال سی چیز لگائی اور پھر منھ میں جو چھالیہ کا پان تھا اس کی لال پیک دیا، پھ تھوک کر انھوں نے تازہ پان کو اپنے منھ سے بچے ہوئے دانتوں کے بیچ میں ٹھونس لیا۔

"پھر بھی..." اور پان میں بھی پانی تو ہوتا ہی ہے اور تمھارے ان کو اگر معلوم ہو گیا کہ تم نے پانی والی کوئی چیز ہمارے یہاں کھائی ہے تو وہ خفا ہوں گے۔" لیکن انھوں نے طشتری بھر کے جلیبی، کریم کیک اور گلاب جامن نکالیں اور بولیں: "لو، لے کھاؤ، یہ تو سوکھا ہے۔"

ہم نے سر ہلا کر اپنے روایتی انکار کا اظہار کیا۔

میں پان ضرور کھاتا، لیکن ایک تو منا ہی اور دوسرے اپنے سامنے دیا اور

ہو پہلے ہی کھیر دیکھ کر مجھے گھن آ رہی تھی۔

علی کی ماں نے ذرا برا مان کر کہا: "اچھا اچھا، شروع ہو تو بند ہو گا؟"
ماں کے اس طرح صاف صاف کہنے پر مجھے بڑی الجھن ہوئی اور میں نے
یہ محسوس کیا کہ وہ شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کھیر دیکھ کر مجھے متلی سی ہونے لگی تھی۔ مجھے یاد آیا
کہ اماں نے نشیش و فراس تو، پر علی کے گھر کچھ کھانے سے منع کیا تھا۔ اب یہ تو پتہ
نہیں کیوں، لیکن اس وقت میرے منہ میں پانی آ رہا تھا اور علی کے سامنے جو
گوشت کا سالن رکھا ہوا تھا وہ کھانے کو میرا جی چاہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں
نہیں آتا تھا کہ اماں نے کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی چیز کھانے اور ایسی چیز کو جسے
کسی مسلمان نے استعمال کیا ہو، جو فرق بتایا تھا وہ کیا تھا۔ آخر مسلمان کے ہاتھ
سے آدمی کیوں نہیں کھا سکتا؟ کیا اس لیے، جیسا کہ اماں کہتی تھیں کہ مسلمان
گائے کا گوشت کھاتے تھے یا اس لیے کہ وہ جوتے پہنے پہنے رسوئی میں گھس
جاتے تھے؟ کل حالانکہ ... آنگن میں مرغیوں کی بیٹ روندتا پھرا تھا اور پھر
وہیں پاؤں دھو کر کھانے بیٹھ گیا۔ یہ تو گندی بات ہے۔

رہی گوشت کی بات، تو یہ مجھے پتہ چلتا ہے کہ گوشت کھانے کو ہے یا بکرے کا
شاید اماں کو مسلمان سے چڑ تھی اس لیے کہ وہ سب ساتھ ایک ہی تھالی میں اور ایک
ہی پیالے سے کھا لیتے تھے اور کھانے سے پہلے ہاتھ بھی نہیں دھوتے تھے۔ علی کی
ماں نے جو پلیٹ کی کھیر ڈالی تھی اسے میں شیشے کی طرح گھورنے لگا، دھوئیں کے
ساتھ بچے اور چولھے پر چیونٹیوں کی قطار کی صورت گرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سارا مسئلہ
حل کر دیا۔ یہ بڑی بات تھی۔ میری ماں، پتا بھی ذکر تیں۔ وہ غسل خانے میں بھی

منجن کرتی اور منہ دھوتی تھیں اور بیٹے راجا دوزیج کو گھر سے باہر جا کر مسواک کرتے تھے۔ ملّو کی ماں نے اپنے بیٹے کو زور سے ڈانٹا۔ "جلدی کر، منڈی کی اولاد!" بھاگ لگا کر، وہ خفا تھیں اس لیے کہ میں نے اور گنیش نے ان کی دی ہوئی مٹھائی کھانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنا غصہ اپنے بیٹے پر اتار رہی تھیں۔ پھر انھوں نے اپنے بیٹے کو ایک پونڈ دیتے ہوئے کہا۔ "لے یہ لیتا جا، کھانے کی چھٹی میں کھا لیجیو، ان بندروں نے تو کھائی نہیں۔ اور آج تجھے دینے کو پیسے میرے پاس پیسہ بھی نہیں ہے۔

میں ان کے ایک ایک لفظ کو سن رہا تھا اور ان کے ایک ایک اشارے کو دیکھ رہا تھا اور اپنی ماں کی باتوں سے اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اماں نے مجھے اسکول بھیجتے وقت کہا تھا کہ بچے کھانے کی چھٹی میں الا بلا کھانے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ انھوں نے کہا تھا کہ گھر کے باہر مٹھائی مٹھائی پر پیسے پھینکنا اچھا بات نہیں ہے۔ جب تم واپس آؤ گے تو میں تمھیں اندر مجلس سے نکال کر چیز دوں گی۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اُن کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ابا کے پاس بہت سے پیسے تھے اور خاص طور سے آخر مہینے میں جب وہ تنخواہ لاتے اور میز پر رکھ کر روپے گنتے تھے تو کتنے پیسے ہوتے تھے۔ ان پیسے تو اماں ابا دونوں کے پاس تھے۔ وہ تو دھوبن، بھنگن، مینوں، جھگیوں اور سپاہیوں کے چاندی کے گنجے گن دیں رکھ کر انھیں اُدھار دیا کرتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ملّو کا باپ بھی ابا سے روپے ادھار مانگنے آیا تھا۔ میں نے سوچا ملّو کی اماں غریب ہوں گی لیکن اپنے بیٹے کو وہ کتنا دل کھول کر پیسے دیا کرتی

تھیں اور پہلے اماں ابا کتنے کنجوس تھے جو ہم لوگوں کو اُلٹے سیدھے بہانے کر کے ٹال دیا کرتے تھے۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ خرچ کرنے کے لیے نہیں، تو جوڑنے ہی کے لیے میرے پاس بھی ایک ڈبل ہوتا۔

علی نے روٹی کے کچھ ٹکڑے توڑ کر منہ میں ڈال لئے جن میں گھی کی تھی چپاتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ ٹک ٹک کرتا ہوا ہاتھ میں مٹھائی کی پوٹلی لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چھوٹے سے سر پہ لال رنگ کی ٹوپی مڑی ہوئی تھی، ایسی ہی سوتی قمیص اور اُسی کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنے ہوئے تھا جن کی بیونت بھی بے ہنگم تھی اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ گھر ہی پہ سئے گئے ہیں۔

"جلدی کر نہیں تو دیر ہو جائے گی۔" اس کی ماں نے جھنجھلا کر کہا۔ علی نے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈتے دیکھ لیا تھا۔ "آخر تو ڈھونڈ کیا رہا ہے، بتاتا کیوں نہیں؟ بستہ! آج پھر تو نے کھو دیا کمبخت! نمک حرام کہیں کا! اسکول سے آتے ہی اس طرح، وہ بستہ پھینکے گا تو پڑھ لکھ چکا۔ جا، پلنگ کے نیچے دیکھ، جا نا!"

علی نے گھٹنوں کے بل جھک کے اپنا سر چارپائی کے نیچے کیا اور اندھیرے میں ایک آدھ منٹ تک دیکھتا رہا۔ اس سے کچھ کام نہ بنا تو پھر وہ سیدھا بیٹھ گیا اور اپنی ماں کو بہت بے تمیزی سے تکنے لگا۔

وہ پھر چلائیں: "اسے پیچھے کے کونوں میں دیکھ، چوہے گھسیٹ لے گئے ہوں گے!"

علی پھر پلنگ کے نیچے رینگ گیا، اور پیٹ کے بل لیٹ کے اس نے زمین

پر اپنے ہاتھ سے ٹٹولا اور آخر کار سوتی کپڑے کا ایک تھیلا نکال لایا جس میں کتابیں، سلیٹ اور تختی ٹھنسی ہوئی تھی۔

”بچو ہوں نے کترے تو نہیں، دکھ دیا؟“ اس کی ماں چیخیں، اور یہ دیکھ کر کہ اس کی قمیص اور پاجامے پر مٹی لگ گئی ہے وہ برس پڑیں۔ ”ابھی تو یہ تیرے کپڑے آج ہی میں نے صبح کے دھوئے ہیں اور پیچھے دیر نہیں ہوئی کہ تو نے مٹی میں سان دیا!“

علی نے پکڑے ہوئے جانور کی طرح انھیں دیکھا اور چیخنے لگا۔ ”بھپ وہ ٹھنیا، ، ڈنڈی!“

وہ چولھے سے ایک جلتی ہوئی لکڑی ہاتھ میں لے کر اسے کوستی، گالی دیتی ہوئی، اس کے پیچھے دوڑیں، لیکن علی بھاگ کے آنگن میں اور پھر گھر کے باہر پہنچ چکا تھا۔

میں اور گنیش بھی چل دیے۔ اس گاؤں گھومنے نکلے پچا، پورا بیچ ہوئے، اور ہم جاتے جاتے خود تیز اور ادب سے کام لینا نہیں بھولے۔ ہم نے علی کے ابا کو سلام کیا جو سامنے وقت اس سب ہنگامے سے بے نیاز بیٹھے تھے، اور ہم نے علی کی ماں کو بھی سلام کیا حالانکہ ذرا ڈر کے اور جلدی سے۔

”جگ جگ جیو بیٹا۔“ علی کی ماں نے جواب دیا۔ ان کی غصّے بھری آواز کا لہجہ اب ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ بہت تھکی ہوئی ہوں اور انھوں نے آگے کہا: ”میرا تو جینا پانی کر دیا، اس حرامخور نے!“

باہر دھوپ میں نکل کر میں نے چین کی سانس لی اور پھر اس حقیقت نے
مجھے بڑا سہارا دیا کہ میں واقعی اسکول جا رہا تھا۔ لیکن نوکروں کے کوارٹروں کے
پیچھے کو آنے والے گندے نالی کی گڑھیا کے پاس کچھ بیٹھے میں دھوپ کھا رہے تھے۔
ان میں مولا بخش تھا، جسے ہم "کالا بھوت" کہتے تھے، مسیح تھا جو پہلے
گھسیارہ تھا پھر عیسائی ہو گیا اور اب سیکسوفون بجاتا تھا، اور گلیشن تھا وہ
کیل مچھلی سی صورت والا جو فلوٹ بجاتا تھا اور جو بینڈ کے شوقیہ ماہروں میں
حوصلوں سے پارٹ کرتا تھا اور جو بیرسٹر کا بڑا دوست تھا اور جب بھی اس کی
ڈیوٹی دفتر میں اردلی کی ہوتی تو وہ جب گھر آ کر "جی" بتاتا تھا۔ ان لوگوں نے
مجھ کو دیکھتے ہی چھیڑنا شروع کیا: "او بی۔ اے۔ کی میرا بیٹا" میں نے ہاتھ پاؤں
جھٹک کر اپنے آپ کو ان کے پنجے سے چھڑایا، اس لیے کہ اب میں اپنے آپ
کو بہت بڑا اور عزت کے قابل سمجھ رہا تھا اور میں نے ایسا انداز اختیار کیا
جیسے میں ان لوگوں کو جانتا ہی نہیں۔ حالانکہ پہلے میں بڑی خوشی سے ان
لوگوں کی تفریح کا سامان بن جاتا تھا۔

تھل جا کر جب ماسٹر کے لڑکے عبداللہ کو پکارنے لگا، اور گلینش ہی چاہتا
گئے درزی رمضان کے لڑکے اختر کو بلانے، لیکن دونوں مایوس لوٹے کیونکہ وہ
دونوں پہلے ہی اسکول جا چکے تھے۔ مجھے ساتھ لے کے ان لوگوں نے تیز تیز
چلنا شروع کیا۔

کچھ دیر تک ہم تینوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

لیکن وہ شاید مجھ سے چڑ رہا تھا کیونکہ ان کی آپس کی بات چیت میں ایک اجنبی آ گیا تھا۔

اور دوسری ندی تک پہنچتے پہنچتے، جو رجنٹ لائن اور قصبے کے بیچ میں پڑتی تھی، میں تھک گیا تھا اور میرے بھائی کو مجھے گھسیٹنا پڑ رہا تھا۔

سورج کو آسمان پر اوپر چڑھتے دیکھ کر گنیش نے سمجھا کہ ہمیں اسکول پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے۔ اور اس نے اور لال نے ہر موڑ پر کیوڑی کے ڈاکر گھسیٹے رام کے لڑکے پیارے لال اور مگر ستری سدا دین کے لڑکوں رحمت اللہ اور صحت اللہ کے پاؤں کے نشان دیکھنے شروع کیے۔ اگر راستے کی دھول پر ان کے پاؤں کے نشان صاف تھے تو پھر ابھی ابھی گئے ہوں گے اور زیادہ دیر نہیں ہوئی ہوگی۔ اگر نشان سرے سے تھے ہی نہیں تو پھر وہ ابھی نہیں گئے اور ابھی کافی وقت ہے۔

جب میرے ساتھیوں کو پاؤں کا کوئی نشان نہ دکھائی دیا تو ان کو خیال ہوا کہ شاید یہ لوگ بہت دیر ہوئی جا چکے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے قدم تیز کر لیے اور میرے پاؤں ہی نہیں اٹھ رہے تھے اور میری نگاہیں چٹیل سینے کنڈوں کے اس پار سوات کی پہاڑیوں کی لال پیلی چٹانوں پر بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ چڑھتے ہوئے سورج کی شعاعیں تیز دھوپ میں تپتا ہوا منظر جہاں اکا دکا ملوہ یا ناگ پھنی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مجھے بے انتہا بڑا، خالی اور ویران لگ رہا تھا اور میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا اور اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

"تیز چل ستو" گنیش کوئی سو گز آگے ایک پیڑ کے پاس رک کر چلایا۔

"پتہ بھی ہے کہ ابھی دیر ہونے پر ہماری ٹھکائی ہوگی۔"

"چھوڑ سالے کو یہیں": علی نے مجھے گالی دیتے ہوئے کہا۔ خیر میری کوئی بہن تھی ہی نہیں۔ اس لیے اس کا تو کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی شادی علی کے ساتھ ہوتی اور میں اس کا سالا بنتا۔ مگر اس گالی سے میں چڑ گیا تھا۔

میں نے ذرا تیزی دکھائی، لیکن پھر کچھوے کی چال چلنے لگا۔ میرے سامنے سے ریت، پتھر اور ریل کا پل، جب پرے ہو کر ریل گاڑی نوشہرہ سے پشاور جاتی تھی، بیری کی جھاڑیاں ایک خیالی تصویر کی طرح گزر رہی تھیں لیکن میں ان کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

جب وہ لوگ کھنڈری کی نال کے پاس بنی ہوئی چپٹی چھت والی اینٹوں کی نئی عمارت کے پاس پہنچے، جسے میرے ابا نے، جب میں کسی اردو کے کنٹ سے پڑھا، ہو کر ان کے ساتھ نوشہرہ صدر آنا رہا تھا تو بتایا تھا کہ اسکول ہے، تو وہ لوگ رُک کر گھبرائے ہوئے سے دکھائی دینے لگے۔ اس لیے کہ اسکول کے کمپاؤنڈ میں سناٹا تھا اور اس سے یہ لوگ یہ سمجھے کہ گھنٹی بج چکی ہے اور ان کو دیر ہو گئی ہے۔

مجھے تو کوئی ڈر تھا نہیں، میں پیچھے پیچھے آ رہا۔

علی اپنی جان کی خیر مناتا بھاگنے لگا۔

گلشیر مڑ مڑ کے میری طرف دیکھ لیتا اس لیے کہ میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میرے لیے اسے فکر تھا اس لیے کہ اسے اسکول میں میرا داخلہ کروانا تھا۔

اس نے مجھے پکارا، "آؤ چھوٹے بھیا، جلدی کرو۔"

میں جانتا تھا کہ اب یہ اس لیے بڑی نرمی سے بول رہا ہے کہ اسے میری

طرف سے ڈانٹنے کی بات چیت کرلی تھی اور چونکہ اسے ہیڈ ماسٹر صاحب کو دادا کا خط دینا تھا۔ اور پھر اس بات کو وہ اپنے ماسٹر سے دیر ہونے کی وجہ بتا کے مار کھانے سے بچ جائے گا۔ اب میں اس کے لیے مصیبت نہیں تھا بلکہ اسے مجھ سے ہمدردی تھی۔

"تم نے مجھے پیچھے کیوں چھوڑ دیا تھا؟" میں نے اس کے برابر پہنچتے ہوئے کہا۔ اور میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے میں وہیں ہڑتال کرنے والا ہوں۔

"چلو چلو، تم تو میرے چھوٹے بھیا ہو، ہے نا؟" اس نے کہا اور اپنی انگلی میری طرف بڑھائی۔

لیکن گھر کے لاڈ پیار نے مجھے خوب بگاڑ رکھا تھا اور اب جب میں اسکول پہنچ گیا تھا تو مجھے اس کی کوئی پروا بھی نہ تھی۔ خاص طور سے اس لیے کہ دادا کا خط تو میری ہی جیب میں تھا۔

"اچھا چل مجھے معاف کردے۔" گنیش نے روہانسے ہو کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ تب میں نے اس کی انگلی پکڑ لی اور وہ مجھے لیے ہیڈ ماسٹر کے دفتر کے سامنے چپراسی کے پاس گیا۔

گورنمنٹ پرائمری اسکول کے خاکی رنگ کی وردی پہنے ہوئے بوڑھے چپراسی پوشے خاں نے وہ خط لے لیا جو دادا نے لکھا تھا۔ جو بابا جی نے لکھا تھا اور چپکے سے ننگے پاؤں ہیڈ ماسٹر عبدالستار خاں کے دفتر میں گھس گئے، جنہیں باہر ہی سے میں نے دیکھا کہ ایک میز کے اس طرف اونچی سی کرسی پر بیٹھے تھے۔

فوراً ہی وہ واپس آگئے اور ہم لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

گنیش نے جب فوجی انداز میں ہیڈ ماسٹر کو سلام کیا، جو اس نے سپاہیوں کو سلیوٹ کرتے دیکھ کر سیکھا تھا، تو وہ بڑا ڈرا ڈرا لگ رہا تھا۔ مجھے جغرافیے کے اس بڑے سے نقشے سے زیادہ دلچسپی تھی جو دیوار پہ ٹنگا ہوا تھا۔ مجھے سلام کرنے کا ہوش ہی نہ رہا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب کو سلام کرو،" گنیش نے عادت کے مطابق ذرا ہڑبڑا کر کہنی مارتے ہوئے پیچھے سے میرے کان میں کہا۔

"سلام ماسٹر جی،" میں نے زور سے کہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسی وقت بابو جی کا خط پڑھنا شروع کیا تھا جو چپراسی ان کی میز پہ رکھ گیا تھا۔

"سلام،" انھوں نے خوش ہوتے ہوئے اپنی باریک مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ لمبے چوڑے رعب دار پٹھان تھے۔ قبول صورت، علاوہ خوش مزاج بھی تھے اور ان کے سر پہ مور کی دم جیسا کلّہ نما طرّہ۔ کلف لگے ہوئے کرتے پتلون، قمیص اور انگریزی وضع کا کوٹ دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ جیسے وہ بڑے آدمی ہیں اور ان سے بات کرنا آسان نہیں ہے۔

لیکن مجھے ان سے ڈر نہیں لگ رہا تھا اور میں بالکل بے خوف ہو کر برٹش سرکار کے وائسرائے کی تصویر دیکھ رہا تھا جو ہیڈ ماسٹر کی کرسی کے پیچھے دیوار پہ لگے ہوئے کلنڈر پہ چھپی تھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے چپراسی سے کہا: "اس بچے کو ماسٹر دین گل کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو رجسٹر میں اس کا نام لکھ لیں۔" پھر وہ گنیش سے بولے: "کیا تم نے کچہری میں چھٹی لی؟ آج تو ان بابو صاحب کے لیے میرا خط لے جانا۔"

گنیش نے بڑے احترام کے ساتھ سر ہلا کر حامی بھری، پھر اس نے فوجی انداز میں سلام کیا، جو مجھے برا لگا، اور مڑ کر چپراسی کے پیچھے ہولیا۔

ہیڈ ماسٹر دروازے تک آئے اور جھک کر انھوں نے میرے گال کھینچتے ہوئے کہا، "تو اپنے بھائی کی طرح بڑوں کا ادب نہیں کرتا۔ کیوں؟ بتاؤں گا تیرے باپ سے؟"

مجھے معلوم تھا کہ عبدالغفار خاں بیگ، بابا جی کو جانتے تھے۔ اس لیے کہ دونوں کا تعلق نوشہرہ کے قصبے میں پڑھے لکھے لوگوں کی چھوٹی سی برادری سے تھا۔ میں اس خاص عنایت پر پھولا نہ سمایا اور مسکرا کر دوڑتا ہوا چپراسی کے برابر پہنچ گیا۔

گنیش پانڈے کے دوسرے درجے کے سامنے جان بوجھ کر دیر کر رہا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ مجھ سے پوچھ لے کہ میں ٹھیک رہوں گا نا؟ تاکہ اس کے ماسٹر اس کو ایک ضروری کام کرتے دیکھیں اور اس کے سب قصور معاف کر دیں، دیر میں آنے ہی پر نہیں بلکہ دن میں بھی اگر وہ کوئی غلطی کرے تو اس کی سزا نہ دیں۔

چپراسی مجھے پانڈے کے پہلے درجے کے کمرے میں لے گیا۔ لیکن ماسٹر دین گل ہی اور کچھ دوسرے لڑکوں کو دیر سے آنے پر قمچیاں لگانے میں مصروف تھے۔ دین گل بڑی وجیہ صورت والے آفریدی تھے، سر اور داڑھی منڈی ہوئی تھی، لمبی نوکیلی مونچھیں تھیں، آنکھیں عقاب جیسی تھیں، البتہ ان کی ناک ان کے قبیلے کے دوسرے لوگوں کی طرح تو کھڑی اور اوپر کو اٹھی ہوئی نہ تھی۔ وہ گھر کے بنے ہوئے کھدر کی

قمیص اور اسی کپڑے کی شلوار پہنے ہوئے تھے۔ ان کے چمڑے کے جوتے، جن کی نوکیں اوپر کو مُڑی ہوئی تھیں اور جن کے تلووں پر موٹی موٹی کیلیں جڑی ہوئی تھیں، وہیں نیلی دری کے پاس ہی رکھے تھے جس پر وہ بیٹھے اور ان کی موٹی کھردری کملی میں لپٹے بیٹھے تھے اور کسی درخت کی ہری ٹہنی کی چھڑی پٹنے والے لڑکوں کو ... رہے تھے جو اُن کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔

مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں کمرے کے سناٹے میں کھڑا لڑکوں کو پٹتے دیکھتا رہا۔ اب علی کی باری تھی اور وہ غریب دُبلا پتلا سا لڑکا، اور عمر کی سی شکل سے ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اپنی ہتھیلیوں کو بغل میں چھپائے ہوئے تھا اور مارے ڈر کے چھڑی پڑنے سے پہلے ہی رو رہا تھا۔

"الو کے بچے کی اولاد، ہاتھ دکھا!" ماسٹر نے چلا کے کہا۔

"مجھے معاف کر دیجیے، مجھے چھوڑ دیجیے، ماسٹر جی میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں اب کبھی ایسا نہ کروں گا!" علی زور زور سے رونے لگا اور اپنے ہاتھ اس نے اور کس کے بغلوں میں چھپا لیے اور اپنے جسم کو اس طرح سکوڑنے لگا جیسے کوئی معجزہ ہو گا اور پھر وہ یکدم غائب ہو جائے گا۔

دین گل نے پھر گرج کر کہا: "ہاتھ دکھا، ولد الحرام!" لیکن علی مارے ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔

اب تو ماسٹر صاحب جھنجھلا کر اپنی کملی سے باہر نکل آئے اور پیچھے کھسکتے ہوئے علی کے دونوں ہاتھوں، پنڈلیوں پر، رانوں پر، ٹخنوں پر، بازو پر اور گردن پر شڑاپ شڑاپ چھڑیاں برسانے لگے۔ اور سارے وقت چیختے رہے: "دکھا ہاتھ

ہاتھ دکھا، گدھے کی اولاد!"

آخر کو لڑکے نے اپنی انگلیاں ذرا سی کھولیں لیکن قمچی کے ڈر کے مارے خود ہی پھر کھینچ لیں۔ اس پر وین گل نے اسے پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے مارا اور پھر زبردستی پکڑ کے اس کی ہتھیلیاں ایک کے بعد ایک پھیلائیں اور انگلیوں کے سرے پر سے پکڑ کر اس پر زور زور سے کئی قمچیاں لگائیں۔

"جا اور جا کے اپنا سبق یاد کر!" انھوں نے گرج کے کہا۔ لڑکا اپنی جگہ کی طرف چلا، ہاتھ اب بھی بغل میں دبائے ہوئے۔ مارے درد کے اس کا چہرہ زرد ہو کر سیاہی کی طرح کا ہو گیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔

"کل کا آموختہ دہراؤ، میں ابھی سنتا ہوں!" وین گل نے اپنے بیچے کے لڑکوں سے کہا جو قطار لگائے ہوئے زمین پر بیٹھے تھے جس پر کوئی فرش نہ تھا پھر وہ میری اور چپراسی کی طرف مڑے۔

چپراسی نے ہیڈ ماسٹر کا پیغام ماسٹر وین گل کو سنایا اور چلا گیا۔

"ادھر بیٹھ جاؤ!" ماسٹر نے ڈانٹ کر اپنے داہنے ہاتھ کو خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے اپنے سامنے پڑا ہوا ہرے رنگ کا رجسٹر کھولا اور چینی مٹی کے ایک ہرے رنگ قلمدان میں سے کوک کا قلم نکال کر انھوں نے گھور گھور کے دیکھا اور پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے، ابے بتا دے؟"

"کرشن چندر" میں نے جواب دیا۔

وین گل نے رجسٹر میں نام لکھ لیا۔

"تمھارا بستہ کہاں ہے؟" انھوں نے پھر پوچھا۔ "اور تمھاری پرائمر؟ ذرا میں جانچ تو لوں کہ اتنی دیر میں تم درجے میں داخل کیے جانے کے لائق بھی ہو کہ نہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "ماسٹر جی، ابھی تک میرے پاس پرائمر نہیں ہے۔ میرے ابا جی نے کہا ہے کہ اس ہفتے مجھے خرید دیں گے۔ لیکن میں نے اپنے بھائی کی پرانی پرائمر میں سے اپنا سبق یاد کر لیا ہے، مگر وہ پھٹی ہوئی ہے۔"

وین گل نے کہا: "اپنے ابا جی سے کہنا کہ تمھیں نئی پرائمر خرید دیں نہیں تو یہاں مار پڑے گی۔ اب اپنے بغل والے لڑکے کی کتاب میں دیکھو اور یاد کرو۔ میں ابھی سنتا ہوں۔"

لڑکوں نے ماسٹر کے کہنے پر کل کا آموختہ رٹنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ سیدھے پڑ گئے تھے اور ان کے ذہن دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈروں، ڈائناسوروں، نقشوں، خرگوشوں، چوہوں، کتوں، گھوڑوں، مرغوں وغیرہ کی تصویروں اور دوسرے تعلیمی چارٹوں سے الجھنے لگے تھے۔ ماسٹر نے اپنی چھڑی اٹھائی اور اپنی دری کے آگے پڑی ہوئی چٹائی پر چٹاخ سے مار کر گرد اڑائی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے کوئی بٹن دبا دیا ہو، اور لڑکے چلا چلا کر اونچی آواز سے اپنا آموختہ یاد کرنے لگے، آگے پیچھے ہلتے اور شور ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کتنی توجہ سے پڑھ رہے ہیں۔ وین گل کچھ لکھنے لگے۔

لیکن ان کو لڑکوں پر سے نظر ہٹائے ہوئے ایک ہی لمحہ ہوا ہوگا کہ لڑکوں کے سر ہلنے بند ہو گئے اور شور بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ ماسٹر نے پھر چھڑی

چٹائی پہ پٹخی۔ پھر دھول اُڑی اور بچوں کی زبانیں پھر چلنے لگیں۔

لیکن ماسٹر کو لکھنے میں مصروف ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمرے کے اس سرے سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دو بڑے بڑے لڑکے ایک دوسرے سے یوں گتھے ہوئے تھے جیسے بھینسے سینگ ملا کر لڑتے ہیں۔

ماسٹر صاحب ننگے پاؤں ہی کونے کی طرف لپکے اور دونوں بدمعاشوں کی گردن پکڑ کے اپنے سامنے کی کھلی جگہ میں لے آئے۔

انھوں نے چلّا کر کہا: "مرغا بنو، گدھو" ان کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ دونوں لڑکے مرغا بن گئے۔ جلد ہی ان کے منہ لال ہو گئے اور اس تکلیف دہ آسن کی وجہ سے ان کے ماتھے کی رگیں پھول گئیں اور پسینہ بہنے لگا۔ ایک گز کے فاصلے پر دونوں مرغا بنے ہوئے تھے اور ابھی چند منٹ پہلے ایک دوسرے کو کھانے دوڑ رہے تھے، لیکن اب ایک طرح سے ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمخوار بن گئے تھے۔

ماسٹر نے چلّا کے کہا: "اپنی اپنی کتابیں بند کرو، حرامزادو، اور تم دوست محمد — کھڑے ہو جاؤ، خان کی اولاد، اور کل کا سبق سناؤ۔ اور ذرا دھیان سے سنانا اس لیے کہ تیرا تحصیلدار باپ یہاں آ کے تجھے میری چھڑی سے نہ بچا سکے گا۔"

تعلقدار کے سر پہ والا لڑکا کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ اچانک پیلا پڑ گیا۔ اُس نے نظم کی پہلی لائن تو دُرست پڑھ دی، لیکن دوسری لائن اس کے ذہن سے اُتر گئی اور پھر چھڑی کے ڈر کے مارے کسی طرح نہ یاد آئی۔ اور چونکہ سر ہلانے والا

سوم تو ماسٹر گوردکی سننے کے لیے تھا اس نے نظم کی باقی لائنیں یاد ہی نہیں تھیں جو وہ سُناتا۔

"چل ادھر مرغا بن، گدھے کا تخم۔" ماسٹر دین گل نے اطمینان سے کہا، اور پھر انھوں نے دوسرے لڑکے کو شروع کرنے کا اشارہ کیا۔

بے قد کا اور اچھے کپڑے پہنے ہوئے، دوست محمد جھجکتے ہوئے اٹھ آیا اور ان دو شیروں کی برابر آ کر جن کو آ پہنچا، یہ نہ پڑھنے کی سزا دی گئی تھی مرغا بن گیا۔

دوسرا لڑکا اٹھا اور گم سم آنکھیں بچائے منہ ہی منہ میں کچھ کہنے کی کوشش کیا کرتا رہا۔ لیکن وہ پہلی لائن بھی نہ سُنا سکا۔ اس نے سبق شاید پڑھا ہی نہیں تھا۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد وہ مایوس ہو گیا اور گویا اپنے جرم کے اقبال میں بغیر کہے ہی وہ اس جگہ میں آ کر مرغا بن گیا۔

تیسرا لڑکا ماسٹر کی چھڑی کے اشارے پر کھڑا ہوا۔ پھر جیسے کسی دیو کے ڈر سے اس نے تین لائنیں سنا دیں مگر چوتھی پر اٹک گیا۔ وہ بھی آ کے مرغا بن گیا۔

پھر چوتھا، پھر پانچواں اور پھر اگلا...... پھر ایک سے ایک دو یا زیادہ سے زیادہ وہ تین لائنیں سنائیں اور پھر چپ ہو رہے۔ صرف ایک لڑکے کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ اس نے نو لائنیں سنا دیں، لیکن اور کوئی اس کے برابر بھی نہ پہنچ سکا۔ نو لائنیں سنانے والے اس لڑکے کے علاوہ سب آ آ کے مرغا بنے جو پہلے سے مرغا بنے تھے وہ اپنے ہی چوتڑوں کے بوجھ سے کانپ رہے تھے۔ اور کچھ تو رونے لگے تھے اور ان کے پسینے کے ساتھ ان کے آنسو بھی مل گئے تھے۔

میں بیٹھا اپنے ساتھیوں پر ترس کھا رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو

بیٹھے ہی رہتے تھے، ان سے ہمدردی کی وجہ سے نہیں بلکہ ماسٹر صاحب کے ڈر سے کہ
ماسٹر صاحب نے اچانک کہا۔ "چل تو دال کھانے والے، بابوجی کی اولاد سُنا
نظم، تو تو کہتا ہے کہ تو نے گھر پر سبق یاد کیا ہے۔" میں چونک پڑا اور سوچنے لگا
کہ شاید ماسٹر صاحب بھی [illegible] ہیں۔

جب سے میں نے گنیش کی نقل کرنی شروع کی تھی تبھی سے ماں اور بچے
کی وہ نظم مجھے یاد تھی اور جب سے بابوجی نے مجھے پڑھانا شروع کیا تھا تب سے
میں نے وہ نظم سُنا سُنا کے سب کے کان پھاڑ ڈالے تھے، لیکن میرے دل پر
ایسا ہول بیٹھا تھا کہ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

ماسٹر نے سندرلال سے کہا۔ "چلئے بابوجی، آپ بھی مرغا بن جائیے۔"

اب تو جیسے اپنے آپ کو بچانے کے فطری جذبے نے مجھ میں جان ڈال
دی۔ میں نے ماسٹر سے کہا کہ مجھے یاد ہے اور میں نے سُنانے کی کوشش کی۔
ایک دفعہ جو میں نے شروع کر دیا تو پھر تو کھٹا کھٹ میں نے اس طرح ایک ایک
لفظ سُنا دیا جو گھر کے لاؤنسے مجھے سکھایا تھا۔ تین لائنیں میں کھا گیا، مگر ماسٹر جی
نے غور نہیں کیا۔ لفظوں اور فقروں کی ادائیگی صاف نہ تھی اور میں نے بہت
جلدی جلدی بھی پڑھا، مگر میں نے سُنا دی پوری۔

ماسٹر دین لال نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود اُٹھے اور اپنا کیلیں لگا
بھاری جوتا لیکر "مرغوں" کے پاس پہنچے۔ "چوتڑ اٹھاؤ گدھو" کہنے کے حکم
اور جن لڑکوں نے چوتڑ نہیں اُٹھایا ان کو انھوں نے ایک ایک پھر دھکا لگایا۔
میں تو چین کی سانس لیکر بیٹھ گیا۔ ایک سے لے کے بیے تو میں نے اپنے علاوہ

کچھ دیکھا ہی نہیں۔ میں گویا اپنی کامیابی پر غرور میں بہکنے میں آ گیا تھا اور شکر کر رہا تھا کہ ماسٹر جی نے یہ نہیں غور کیا کہ میں تین لائنیں کھا گیا ہوں اور جواب مجھے یاد نہیں تھیں۔ میں صبح کی ساری تکلیفیں، آزمائشیں اور کھٹنائیاں بھول گیا تھا اور جوش اور فخر کی لہروں میں ہچکولے لے رہا تھا۔

"ادھر آ ہندو بچے" ماسٹر نے بلایا۔ میری اپنی اہمیت کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا اور مجھے فخر اور شان کی اس موہوم سی خوبصورت دنیا سے، جہاں میں پہنچ گیا تھا، واپس کھینچ لیا۔

میں ڈرتے ڈرتے اٹھا۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کون سی نئی مصیبت آنے والی ہے۔

"حکم لا۔ ہر ایک لڑکے کو لگا پانچ پانچ چانٹے، جاؤ لڑکو سب اپنی اپنی جگہ پر جا کے بیٹھو۔ یہ دال کھانے والا تم کو شرم دلائے گا تاکہ کل سے تم لوگ اپنا اپنا سبق یاد کر کے آؤ۔"

میں ذرا جھجکا۔ مجھ کو تو بے خوشی تھی کہ لڑکوں کو طمانچے لگا کے میری اہمیت بڑھ جائے گی لیکن میں ڈر بھی رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کو چانٹا نہیں لگایا تھا۔ الٹے گھونسے اور کبھی کبھی ضد کرنے پر ماں کے طمانچے کھاتے تھے۔

ماسٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "جا لگا طمانچے۔"

میں دوست محمد کے پاس گیا لیکن اتنے بڑے لڑکے کو طمانچے لگانے کی ہمت نہ پڑی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میرے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

ورینہ گل گرجے۔ "مار" میں نے پہلے لڑکے کے منہ پر مارا، ایک، دو

تین، چار طمانچے۔ اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

"پانچ" ماسٹر نے چلا کر کہا۔ "گنتی آتی ہے کہ میں بتاؤں پھر؟"

میں نے لوٹ کر دوست محمد کو ایک اور طمانچہ لگایا۔ پھر میں اس کے بعد والے لڑکے کے پاس آیا اور اسے بھی پانچ طمانچے لگائے۔ پھر اس کے بعد والے کا جو حال تھا، اس لیے کہ درجے میں لڑکے اپنے قد کے حساب سے بٹھائے جاتے تھے۔

"دھیرے دھیرے مارو!" علی نے چپکے سے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ درخواست تھی اور کچھ دھمکی۔

میں نے چاہا، تو اسے ہلکے ہلکے لگائے لیکن پانچواں بھرپور کرارا اس کے اس کی آنکھ پر لگ گیا۔ پھر میں اگلے لڑکے کے پاس گیا اور پانچ اسے لگائے۔ لیکن اب میرا ہاتھ دکھنے لگا تھا اور میں سب لڑکوں کے گالوں پر اپنی ہتھیلی پھیرتا جا رہا تھا۔

اچانک ماسٹر نے مجھے پکارا۔ "بس کرو، ادھر آؤ۔"

میں ماسٹر کی طرف یہ سوچتا ہوا گیا کہ مجھے اس فرض سے چھٹکارا دے دیا گیا۔ لیکن ماسٹر دین محمد کے کچھ اور ہی ارادے تھے۔ چٹاخ چٹاخ انھوں نے میرے گالوں پر دو طمانچے لگائے اور بولے۔ "اب میں تجھے بتاؤں کیسے مارا جاتا ہے زور کا طمانچہ۔"

میں زور سے چیخا اور ماسٹر کے پاؤں کے پاس گر گیا۔ آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا اور منہ پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس جگہ پر جلن ہوتی تھی جہاں

ماسٹر کی آنکھیں انگارہ بن گئی تھیں ، وہ نفرت اور غصّے سے میرا خون کھول رہا تھا۔

"ہائے ماں ، ہائے میری مَیّا !" میں بڑے زور سے چیخ رہا تھا ، اتنے زور زور سے کہ ماسٹر دین گل بھی گھبرا گئے ، اس لیے انھوں نے مجھے کان پکڑ کر اٹھایا ، مجھے میری جگہ کی طرف دھکیلا ۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے ، تیری ماں مر نہیں گئی ہے جو یوں دہاڑیں مار رہا ہے !"

پھر انھوں نے اُٹھ کر ان لڑکوں کے طمانچے لگائے جنھیں ان کا حصّہ نہیں ملا تھا ۔ کچھ ہی دیر میں سارا کمرہ سسکیوں ، آنسوؤں اور چیخوں سے بھر گیا ۔ ماسٹر نے دھمکی دی ۔ "رونا بند کرو نہیں تو ابھی ہر ایک کو تین تین پھر لگا دوں گا ۔ اور آج کا سبق لو ۔"

اس دن جب چھٹی کی گھنٹی بجی تو لڑکے دربے سے نکلنے کی جلدی میں معلوم ہوتے تھے ۔ لیکن دین گل کے جانے سے پہلے باہر جانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا ۔ ان کا پیٹھ پھیرنا ہوتے ہی سب جھٹ سے کمرے سے باہر نکل آئے ۔ میں دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا کہ گنیش آئے تو اس کے ساتھ جاؤں ۔ علی بابا سے میں دوست محمد اور گنی دوسرے بڑے لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا ۔ اور اس نے وہیں سے مجھے للکارا ۔ "نکل سامنے ، دال کھانے والے ، آج تو اسکول سے باہر نکل تو بتائیں تجھے کہ اپنے ساتھیوں کو طمانچے مارنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ؟"

اس غیر متوقع دھمکی پر میری تو جان ہی نکل گئی اور میں پھر بھاگ کر اندر چلا گیا اور گنیش کا انتظار کرنے لگا ۔ لیکن علی اور اس کے ساتھی سامنے ہی

گھورتے تھے اور مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اس جال کے میں پھنس گیا ہوں اور میں منانے لگا کہ گنیش جلدی ہی آ جائے۔ ان کی دھمکی کا ڈر میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ ڈر اور ان سب سے نفرت۔ میں نے منی کا کیا بگاڑا ہے جو ایسا غیر بنا جل رہا ہے! میں نے تو ماسٹر کے کہنے پر ان لوگوں کو طمانچے لگائے تھے اور نہ دوست بنا سکنے پر اُلٹے مجھے چانٹے پڑے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ منی اصل میں وہ میاں میر والے قصے ہی سے مجھ سے خار کھاتا ہے۔

میں نے دل میں سوچا۔ "خیر گنیش تو یہاں جلدی ہی آ جائے گا اور پھر وہ مجھے بچا لے گا۔ پھر یہ خیال ہوا کہ گنیش بھی تو منی کا دوست ہے۔ آج ہی تک تو اس نے مجھے اس بات پر گالی دی تھی کہ اسے ڈر تھا کہ منی اسکول چلا جائے گا اور اسے اکیلے جانا پڑے گا۔

میں نے دل میں طے کیا۔ "آج کسی طرح گھر پہنچ جاؤں تو اسے مزہ چکھاؤں۔ بابا سے کہوں گا کہ گنیش نے مجھے گالی دی ہے اور منی مجھے مارنے کی فکر میں تھا۔ اور ماسٹر کی بھی شکایت کروں گا۔ ہاں، میں ان سب کی شکایت کروں گا اور اب میں اسکول بھی نہیں آؤں گا!"

دو بچے نے پیچھے آ کر مجھ سے ہمدردی کرنے لگے۔

ان میں سے ایک نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ تم ہم لوگوں کے ساتھ چلو!" اس بات پر ظاہر ہے کہ مجھے رونا آ گیا۔

اسی وقت گنیش آ گیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی سسکیاں لینی شروع کیں۔ گنیش نے پوچھا۔ "ارے بات کیا ہے؟ ہوا کیا؟"

ان بچوں میں سے ایک نے اطلاع دی۔" ماسٹر جی نے اس سے کہا تھا کو سب لڑکوں کے طمانچے مارے اس لیے کہ وہ لوگ اپنا سبق نہیں سنا پائے تھے اس نے ان لوگوں کو زور زور سے نہیں مارا، اس لیے ماسٹر نے اسے بھی چانٹے مارے اور اب لڑکے انتظار میں ہیں کہ اس سے بدلا لیں گے۔"

"چلو" گنیش نے دھیرے سے کہا۔ وہ بھی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ میں اور اس کی انگلی پکڑ کر اپنی آنکھیں ملتا ہوا جو رونے سے سوج گئی تھیں، اس کے ساتھ چل دیا۔

علی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ گنیش نے مجھ سے جلدی چلنے کو کہا اور سمجھایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

مجھ سے ہمدردی کرنے والے بچے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ میں نے اور گنیش نے عبدالرحمن کی کلاس کی ٹال پار کی جو اسکول کی داہنی طرف اس رستے کے سرے پر تھی جو رجمنٹ کی بارکوں کی طرف جاتا تھا۔

جیسے ہی ہم صاف برابر میدان میں پہنچے، علی، دوست محمد اور دو دوسرے پٹھان لڑکے ہمارے اوپر ٹوٹ پڑے۔ یہ لوگ چھپے بیٹھے تھے اور انھوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔

علی نے جھٹکے سے مجھے گنیش سے الگ کر دیا اور پوچھا: "تو نے ہم لوگوں کو طمانچہ کیوں مارا؟"

میں نے چیخنا شروع کیا اور اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ علی نے میرے منھ پر ایک زور کا ہاتھ مارا۔ ایک پٹھان لڑکے نے دوسرا طمانچہ

مارا۔ میں نے علی کی ٹانگ میں پورا زور لگا کے دانت کاٹا، جس کے لیے میں پہلے ہی بچوں میں بل ڈاگ مشہور تھا۔

علی اچھل کے رہ گیا، مگر اس نے گھوم کر میرے منہ پر زور کا مکا لگایا اور دوست محمد نے پیٹ میں گھونسا مارا۔

اس آخری وار پر میں چکرا کر گر پڑا۔ ایک پٹھان لڑکے نے کہا: "ایک اور لگا سالے کو!"

علی میری طرف بڑھا تو لیکن گنیش نے اسے روک دیا: "مار ایک اور، ایک اور سالے کو!" دوسرے لڑکے چیخ رہے تھے اور علی کھڑا ہوا اپنے غصے کے دانت پیس رہا تھا۔

گنیش ہاتھ جوڑ کے بیچ میں پڑ گیا تھا، خوشامد کر رہا تھا اور منع کر رہا تھا۔ لال کرتی (انگریزوں کی بارک) کی طرف سے ایک اردلی لالٹین لیے لائن کی طرف جا رہا تھا جہاں ہماری رجمنٹ تھی۔ اس نے میری چیخیں سنیں تو دوڑ آیا۔ علی اور اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

اردلی نے مجھے اور گنیش کو پہچان لیا اس لیے کہ وہ دفتر سے بابا جی کے پاس پیغام لے کر آیا کرتا تھا۔ اس نے میرے کپڑے جھاڑے اور مجھے گھر لے چلا۔ گنیش پیچھے پیچھے تھا اور اس نے اردلی کو جو اطلاع دی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری حالت پر بہت دکھی ہے۔

ہمدردی پا کر میں کچھ زیادہ ہی چیخا چلایا، لیکن پھر سپاہی کے کندھے پر سوار ہو کر جانے کا مزا آنے لگا۔ جلد ہی دن بھر کی تھکن سے میں سو گیا۔

۳

اسکول میں پہلے ہی دن مجھے جو صدمے پہنچے تھے انھیں بھلانے اور ان پر
قابو پانے میں کافی دن گزر گئے۔ لیکن اس بیچ میں بابا جی نے مجھ سے وعدہ کیا کہ
وہ مجھے دلی لیجائیں گے اور اس خوشی میں اسکول کی تلخیاں میں آسانی سے بھول
گیا۔ بابا جی اپنی [illegible] ڈونگا ریجنٹ کے ساتھ شاہ انگلستان و قیصر ہند جارج
پنجم اور ان کی ملکہ میری کے کارونیشن دربار میں سلامی لینے کیلئے دہلی جا رہے تھے۔
بابا جی نے مجھے اپنے ساتھ لیجانے کیلئے چنا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول
میں تکلیفوں کا سامنا کرنے کے علاوہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ دلی اور پرشکوہ دربار
کو دیکھ کر ولایت اور صاحب لوگوں کی دنیا کی طرف میری طبیعت اور زیادہ مائل
ہو جائے گی۔ اس سے کئی دن سے میری اماں نے باتوں باتوں میں میری
میری پھوپھیوں کے بارے میں، جو ولایت چلی گئی تھیں، میرے دل میں
کریدا پیدا کر دی تھی، اس دن سے انگلینڈ کی طرف میرا میلان بڑھتا جا رہا تھا۔
ایک بچے کا اثر قبول کرنے والا جذباتی دل اور دماغ ہر اس چیز میں
رنگ آمیزی شروع کر دیتا ہے، جس کا دھندلا سا بھی اندازہ ہو
اور جس کے بارے میں وہ طرح طرح کی خیال آرائی کرتا رہا ہو۔
تیم چھاؤنی کے بڑے احاطے پر جیسے بڑے صاحب لوگ چھٹے ہوئے تھے جو
قلعہ نما بنگلوں میں امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، جہاں اونچی جھاڑیاں
انھیں دھول، مکھیوں اور کالے لوگوں کی زد سے دور رکھتی تھیں اور جہاں

یہ صاحب لوگ نفیس تراش والے عمدہ کپڑے پہن کر کبھی کبھار نکلا کرتے تھے، جو گلابی اور لال داغوں کی طرح خاموش اور پراسرار لگا کرتے تھے۔ ایسے عناصر جنھیں دیکھا جاتا تھا نہ جانا جاسکتا تھا، جن کے بارے میں ساری معلومات اور دلچسپی بیروں اور دوکانداروں کی گپ شپ تک محدود تھی۔ میں بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ایک شوخ و شریر، ذہین اور منہ پھٹ بچے کی ازلی منطق مجھے صاحبیت کے اوپرے پن کو سمجھنے میں مدد دے رہی تھی۔

ہمارے گھر سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک پورچ کے سائے میں رجمنٹ کے بینڈ کا پورا دستہ، صبح دوپہر اور شام کو مشق کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں انگریزی موسیقی کا بے معنی شور مجھے عجیب لگتا تھا۔ پھر جب میں نے کیپٹن کو کسی نہ کسی طرح اس بات پر راضی کر لیا کہ جن کتابوں کو دیکھ کر وہ فلیوٹ بجایا کرتا تھا ان کے ٹیڑھے میڑھے نشان اور علامتیں پڑھنا مجھے سکھائے اور جب ڈرم میجر نے مجھے اپنے ہاتھ سے ڈرم بجانے دینے کا شرف بخشا تو جلد ہی میرے پاؤں "آنورڈ کرسچن سولجرز" کی دھنوں پر کسی وحشی جانور کی طرح مست ہو کر تال دینے لگے اور "ہوم سویٹ ہوم"، "اِٹس اے لانگ وے ٹو ٹپریری" اور "گاڈ سیو دی کنگ" کی لے پر میرا جسم لہرانے لگا۔ یہی دھنیں رجمنٹ بینڈ کے پروگرام کی خاص چیزیں تھیں۔ اور کلارینٹ، سیکسوفون اور بگل اور ڈرموں کے دوسرے ساز اتنے اچھے اور اتنے چمکیلے لگتے تھے اور ہندوستانی عیسائی بینڈ ماسٹر شاہ جونس، جو ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنے سامنے لوہے کے اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ورقوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے عصا کو اوپر نیچے دائیں بائیں اور ٹیڑھے میڑھے چلاتے ہوئے اتنے متکبر نظر آتے اور ہم بھی اتنے

لیے اور ہندستانی گھروں نے ان سب چیزوں کو اپنے کھیلوں کا حصہ بنا لیا تھا
گزشتہ صدی میں گاؤں چوپال میں بیٹھنے والے قصہ خوانوں اور منشی کے قصے کہانی کا ذکر بھی
کے بیچ ایک اور قصہ "داستان" سنا تھا اور جانا تھا۔ بے گھر والوں کی داستان
سننی پڑتی تھی۔

اور پھر وہ جانے کہ کیسے ہی جیتا جاگتا دنیا کے میدان میں انگریز صاحب
اور ہندستانی پیدل سپاہیوں کو انگریزی اور ہندستانی میں جانیں
سننے کو پیدا کرتے اور میں روز صبح کو دور سے ایک جھلک صاحب لوگوں
کی دیکھ لیتا جو پریڈ کو سامنے کرتے رہتے تھے۔ میں روز صبح کو اپنے ابا جی کے
دھوپ کی سینکنے کے لیے اپنے گھر کے باہر کھڑا ہو جاتا اور سپاہیوں کو پریڈ
اور چاند ماری کرتے دیکھتا۔

جس طرح سے قمیص اور نیکر پہنے ہوئے نوجوانوں اور آدمی رنگروٹوں سے
سینہ تنوایا جاتا اور سر اونچا کروایا جاتا اور اگر ان سے غلطی ہو جاتی تو پنڈلیوں پر
ٹھوکر یا منہ پر چانٹا لگایا جاتا اس سے مجھے ڈر لگتا اور میں ایک خرگوش کی طرح
دبکے ہو دیکھتا رہتا۔ میری آنکھوں کے سامنے جو پیری دکھائی جاتی تھی اس کی
عجیب کشش تھی۔ ایس۔ پی۔ اور ڈان کیشنڈ "تیسرے آدمی" "شینا کی بیٹی"
"شریف آدم" "آوارہ باپ" "سنگم" "[illegible]" پر پلٹن شاٹ کیا جانا
کی نئی قسم کی حرکت سے لگاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتی کہ میرا بھی جی چاہتا کہ میں بھی سپاہی بن جاؤں۔
"ہولڈ" پچھلی بسنتی اور اس کے شاگردوں کی باہر اندر دوڑ کو دیکھ کر جو
کچھ سب سفید نیکریں اور پتلون پہن کر ہاتھ میں ڈنڈے اور پیر لا رہے تھے بکثرت کرتے تھے۔

بہت ہی بھلا لگتا تھا۔ ان لوگوں کی انگریزیت اسدباذار کے قریب کے اکھاڑے والوں
کے مقابلے میں اتنی اچھی لگتی تھی اور ان لوگوں کی کسرت پروفیسر رام مورتی کے سرکس والوں
کے کمال کی طرح، جسے دکھلانے کے لیے میں ایک بار لے جایا گیا تھا، اتنی شاندار،
اور اتنی ماہرانہ لگتی تھی، کہ میرا بھی کسی سرکس میں شامل ہو جانے کو جی چاہنے لگا۔

اور ان صاحب لوگوں سے زیادہ رعب دار اور شان دار تو اور کوئی چیز
ہو ہی نہیں سکتی ہو گی۔ وردی اور فوجی ہیٹ پہنے ہوئے یا پھر سفید، نیلے یا ہلکے بھورے
رنگ کے سوٹ اور فلیٹ ہیٹ میں ملبوس بائیسکل یا بہت بگھی پر آتے اور ریشمی
رومال سے اپنی پیشانی اور گردن کا پسینہ جذب کرتے اور جہاں سے گزر جاتے
وہاں تمباکو کی مہک چھوڑ جاتے۔ لال چہروں اور نیلی آنکھوں کو قریب سے دیکھ کر
حیرت اور پسندیدگی کا وہ جذبہ پیدا ہوا کہ جیسے جو ڈر لگتا تھا وہ جاتا رہا۔ اس
لیے کہ دھیرے دھیرے باتیں کرنے اور مسکراتے ہوئے معلوم ہونے والے یہ لوگ
نیک اور مہربان لگتے تھے۔ ابا جی نے ہم لوگوں کو تاکید کی تھی کہ ان لوگوں کے
سامنے یا ان کے پاس ذرا سا بھی شور نہ کریں اس لیے کہ ان لوگوں کو شور و غل
سخت ناپسند ہے، بلکہ انہیں دور سے سلام کریں اور ہٹ جائیں۔ ہمارے اپنے
لوگوں، میرے والدین، سپاہیوں، بینڈ مینوں، رجمنٹ کے ساتھ رہنے والے
درزیوں، دھوبیوں، نائیوں، بازار کے بنیوں اور قصبے کے دوکان داروں کے
مقابلے میں انگریز صاحب لوگ کچھ اتنی دور کی چیز ہو جاتے۔ وہاں انگریز بچے کر
جلد ہی میں ولایت جانے کے اور ان کے ساتھ ساتھ انہیں لوگوں جیسا بننے کی
فکر کرنے لگا۔

سب سے الگ اور مختلف ہونے کے اسی جذبے کے تحت ایک دن میں اپنی ماں کے پاس آیا اور میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھی وہ صاحب لوگوں والی ٹوپی دلا دیں۔ اماں نے اپنے بچوں کی بے تکی باتوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ انھوں نے بڑی سنجیدہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں ان کی جان چھوڑوں۔ اور جا کے اپنے بابا جی سے کہوں۔ جب بچے کے دل میں کوئی بات سما جاتی ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ بابا جی دفتر سے گھر لوٹ رہے تھے تو میں نے انھیں راستے ہی میں جا لیا اور اپنی مانگ ان کے سامنے رکھی۔ بابا جی ہنس پڑے اور انھوں نے کہا کہ اگر کبھی کوئی صاحب اپنی ٹوپی دفتر میں بھول گیا تو وہ مجھے لا دیں گے۔ انھوں نے ایک مبہم سا وعدہ کر کے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔

انگریزی ٹوپی کی خواہش پیدا ہونے کے ساتھ ہی میں نے اپنے دل میں انگریزیت کی ایک تصویر بنا لی۔ دلی میں میری گھریلو زندگی کی چھوٹی بڑی سادہ سی باتیں، ایک خوشحال متوسط گھرانے کی روزمرہ کی رنگینیاں، زندگی کا نمونہ معلوم ہوتی تھیں جس میں کچھ رنگین رنگ میموں کی ان چند کرنوں سے مل جاتی تھی جو ہمارے گھر میں کبھی کبھار دیکھی تھیں۔ بمبئی، کلکتہ اور لندن سے انگریزی اخبار کے ساتھ آنے والے السٹریٹڈ ویکلی اور دوسری فرموں کے جو کیٹلاگ ہر ڈاک میں آتے تھے، ان میں بابا جی کو ٹونک اور دلی کے بیچ ڈاک چھانٹتے وقت ہم لوگوں کے کھیلنے کے واسطے رکھ لیتے تھے ان میں رنگین چھپے ہوئے انگریز دولہا دلہن سے کپڑے پہنے بوڑھی میموں اور اسکول کا بستہ لیے ہوئے انگریز بچوں اور انگلو

انڈین زندگی کے دوسرے تمام لوازمات — پینٹ، جوتے، ہیٹ، پستول، چمڑے کے
لانے، بائیسکل، موٹر سائیکل، کرکٹ کے بلّے وغیرہ کی تصویریں دیکھ دیکھ میں
انھیں کے بارے میں سوچتا رہتا۔

مغربی تہذیب کی ان عجیب و غریب پیداواروں نے میری خیالی دُنیا کو
اتنی شدت کے ساتھ روشن کیا کہ میں نے اس خرافات کی بنیاد پر اپنے خوابوں کے
ولایت کی تعمیر کرلی اور انگریزی نمونے کے کٹے ہوئے کوٹ کے لباس پہن کر میں
کوٹھی کے چیلوں کو اس طرح حکم دیتا پھرتا جیسے میں واقعی پورا پکّا صاحب ہوں۔
ان ابتدائی خواہشوں کا جوش جیسے دماغ کی ہواؤں میں بیٹھ گیا۔ اس نے
خیال و دل کے اس رنگ میں مجھے سر سے پاؤں تک رنگ دیا اور مجھ پر اس طرح
سے چھا گیا کہ بعد میں زیادہ شعوری رجحان ہو گیا لیکن پھر بھی خوابوں کی دنیا کی
ان اولین تیروں نے ناگزیر طور پر یہ طے کر دیا کہ میری زندگی کی آئندہ روش کیا ہوگی۔

جاننے بوجھنے اور شکر پیری کو دیکھنے کے لیے ابا کے ساتھ دہلی جانے کے
امکان کے بارے میں سوچ سوچ کر جو خوشی ہوتی تھی وہ انھیں خوابوں کی وجہ سے
تھی اور انھیں کی وجہ سے روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ دہلی جانے کی ساری
تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

ابا نے جو بہت ہی کم — کلرک، حوالدار کی وردی پہنتے تھے، جس کا انھیں
اپنے عہدے کی رو سے حق تھا، اپنی لال جیکٹ نکال کر پہنی اور ایک بہت
ہی خوبصورت پگڑی باندھی جس میں ۳۰ روپے والی زرنفت کے زرد اور نیلے رنگ تھے۔
نکال اور انھیں صحیب دکھائی، اور انھوں نے اپنی وردی پہن کر گھر والوں کو

دکھا دیا اور ہم لوگوں سے کہا کہ وہ اسے ۔ رکھے گئے ہیں کہ انھیں ہمیشہ وردی پہنی پڑے
اور اس تنظیم ہونے پر کام گزاری دکھانے کے لیے سامنے شگون نیک تھے ۔

مجھے پاپا جی کی اس وردی پر بڑا فخر ہوا تھا ۔ اور حالانکہ اپنے لیے میں
انگریز لڑکوں جیسا سوٹ چاہتا تھا ۔ لیکن مجھے بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کر لیا گیا
کہ میں اس موقعے پر نیچے کی خوبصورت اچکن ، جس پر سنہرا کام تھا ، اور شلوار کا
اور دل کے جوتے پہنوں جو ہرش کی شادی میں میرے لیے بنوائے گئے تھے اور
تب سے پہنے نہ گئے تھے ۔

لیکن جس دن وہ سب کچھ خیال تھا اس سے ایک دن پہلے پاپا جی کھانسی کی وجہ
سے بیمار ہو گئے اور پاپو ڈاکٹر [illegible] نے فضل سے تشخیص کی کہ نمونیہ
ہو گیا ہے ۔ اس رات کو پاپا جی بہت سخت بیمار پڑ گئے اور ان کی جان کے
لالے پڑ گئے ۔ [illegible] والا وقت ان کے بستر پر ہی چلا گیا ۔ بہرحال خوش قسمتی سے
نے پاپا جی کو ایک نئی دوا دے دیا جو ہر بیماری کے لیے [illegible] تھا اور
سارا زہر نکل گیا ۔

اس سے بڑی خوش قسمتی یہ ہوئی کہ پاپا جی جلد ہی اچھے ہو گئے اور اس تقریب
میں وردی پہننے کے لائق ہو گئے جس میں نوشہرہ بریگیڈ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ
نے اپنے اسٹاف کے ساتھ [illegible] سے ایک دن پہلے [illegible] ہونے والے تھے ۔ مجھے نوکروں
کے ڈبے میں ایک اردلی کے حوالے کر دیا گیا کہ کہیں [illegible] پاپا جی کی خلاف ورزی
کا پتہ نہ چل جائے کہ جس گاڑی میں [illegible] صاحب جا رہے تھے اسی میں ایک ہندوستانی
بچہ بھی سفر کر رہا ہے ۔ دہلی جانے کے شوق نے ، اور پاپا جی کی بیماری کی وجہ سے

پیدا ہونے والے اس ڈر سے کہ ممکن ہے میں نہ جا سکوں اور آخرکار، جانے کے اچانک فیصلے نے مجھے ذہنی طور پر اس قدر تھکا دیا تھا کہ میں رات بھر بے خبر سوتا رہا، اور صبح کو وہ اردلی، جس کے سپرد مجھے کیا گیا تھا، مجھے بار بار کیل اٹھا دیتا اگر کہیں کوئی صاحب مجھے دیکھ نہ لے۔ اس پہلے سفر کے اثنا میں مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں "جرنیل" اور "کرنیل" صاحبوں سے بہت ڈرنے لگا تھا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ دہلی کی سیر کی مجھے کوئی نہ کوئی ہراس اور دہشت ہی یاد ہے۔ مجھے رجمنٹ کے دستے کے پڑاؤ پر نہیں لیجایا گیا جو دلی کے چاروں طرف میلوں تک پھیلے ہوئے خیموں کے سفید شہر میں کہیں تھا، کیونکہ بابا نے یہ سوچا کہ میں نچلا تو بیٹھوں گا نہیں اور دلی شاندار دربار میں تقریب میں ایسا فسادی غصہ دلانے پر صاحب لوگ بابا کی خبر لیں گے۔ میں بہت سے انگریز بچوں کو اپنی آیاؤں کے ساتھ خوشی خوشی ادھر جاتے دیکھتا تھا لیکن مجھے تو یہ سکھایا گیا تھا کہ انھیں اپنے سے اونچا سمجھے صاحب لوگ سمجھوں جنھیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا کہیں ان کے کپڑے نہ میلے ہو جائیں یا کسی بیماری کا چھوت نہ لگ جائے۔ قدرتی طور پر سفید شہر میرے لیے دیوتاؤں کی ایک نگری بن گیا جہاں بس صاحب لوگ اور ان کے بچے اور خادم لوگ ہی جا سکتے تھے۔ اور جبلی طور پر مجھے بابا کے سب چھوٹے دوست، بابو لوگ سخت ناپسند تھے، جو سیکرٹریٹ میں کلرک تھے اور جن کے سپرد مجھے کیا گیا تھا اس لیے کہ یہ سمجھا گیا کہ گورا رجمنٹ کے سپاہیوں کے مقابلے میں ان کے یہاں کا ساتھ میرے لیے زیادہ اچھا رہے گا۔

ان غیر انجانے لوگوں کے ساتھ مجھے جس اجنبیت کا احساس ہوا اس نے کورونیشن والی دہلی کے سیر تماشوں کی ساری خوشی چھین لی۔ حالانکہ ہر چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کی میری جیسی زبردست خواہش مشکل ہی سے پوری طرح کبھی ہو سکتی ہے جب میں جاڑوں کی سنہری کھلی دھوپ میں بابو ہری رام کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر چکنی سپاٹ سڑک پر جس پر دو رویہ ہری گھاس کے تختے اور گل داؤدی کے پھول لگے تھے اور اُدھر نوابوں کے کیمپوں کے اتنے بڑے اور شاندار خیمے تھے جن سے زیادہ عالیشان پرشوکت اور بڑے خیمے میں نے پھر دیکھے ہی نہیں، تو میری سب کچھ دیکھنے والی آنکھوں نے جو کچھ بھی دیکھنے دیکھتی تھیں، انگریز اور افسروں کے خوب لمبے اور بڑے بڑے سجائے ہوئے خیموں کی سیر کی۔

ہم لوگ شہر کی طرف جا رہے تھے کہ کہیں دور سے بہت سی توپوں کے چلنے کی آواز آئی۔ بابو ہری رام نے مجھے اطمینان دلایا کہ شاہی سلامی دی جا رہی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔

میں نے پوچھا۔ "جیسے ہمارے شہر میں جرنیل صاحب کو سلامی دی جاتی ہے ویسی ہی؟"

"بالکل ویسے ہی لیکن یہ سلامی دنیا کے سب سے بڑے جرنیل بادشاہ جارج پنجم کو دی جا رہی ہے۔" انھوں نے بتایا اور پھر اس خیال سے کہ میں کہیں ڈر نہ جاؤں اشارہ کر کے کہا۔ "دیکھو وہ دور اُس ٹیلے میں توپیں لگی ہوئی ہیں۔" میں نے اُدھر دیکھا جدھر بابو ہری رام نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن خیموں کے شہر پر ایک ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی اور میری سواری کے پاس سے کاریں نکل رہی تھیں اور بڑی دھول اُڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دھند چھٹ گئی اور قلعہ دکھائی دینے لگا۔

"میں نے تمہارے بھائیوں کو وہاں اسکول بچوں کے ساتھ چھوڑ دیا۔" بابو جوالی رام نے شہر کے دروازے پر پیلی اور گلابی اور ہری اور نارنجی پگڑیوں کی بھیڑ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "میں تمہیں بھی انھیں لوگوں کے پاس پہنچا دوں گا، تم انھیں لوگوں کے ساتھ گھر آجانا؟"

تانگہ رکا تو بابو جوالی رام نے ایک سنتری کو پاس رکھا یا اور مجھے ایک گلی سے لیکر چکردار سیڑھیوں پر سے ہوتے ہوئے چھاؤنی کے اوپر اپنے لڑکوں کے پاس لے آئے۔ ان کے دو بیٹے تھے، شمبھو، بارہ سال کا کالا سا لڑکا جو عینک لگاتا تھا، اور میرا ہمنام کرشنا، چھوٹے چھوٹے کانوں والا بدصورت لڑکا جو تقریباً میری ہی عمر کا تھا۔

بابو جوالی رام پر مجھے جو جمالیاتی اعتراض تھا اس نے ان لڑکوں کے بارے میں نفرت کا روپ دھار لیا، خاص طور سے اس لیے کہ اپنی گلابی پگڑیوں پر اتنے اترا رہے تھے کہ انھوں نے میرے ساتھ تو گھٹیا درجے کے اجنبی کا سا سلوک کیا جیسے ان کے لیے میں خواہ مخواہ کی مصیبت ہوں۔ خوش خوش، چٹر پٹر باتیں کرتے ہوئے رنگین بچوں کی بھیڑ تھی، وہاں میں کھڑا ہوا، میں اپنے آپ کو بہت اداس اور اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ بھوک اور بابا سے الگ ہونے کی وجہ سے میری بے چینی اور بڑھ گئی، اور میں رو دیا اور اس طرح چیخنے لگا جیسے میں نے پہلے کبھی کم ہی کیا تھا۔

شاہی جلوس بہت پہلے ہی چل پڑا تھا اور گلابی پگڑی والے بچوں کے انچارج ماسٹر صاحب نے میرے پاس آکر مجھے ڈانٹا کہ میں چلاؤں نہیں، بلکہ سب بچوں کے ساتھ مل کر جھنڈا ہلاؤں۔ اس ڈانٹ کی وجہ سے میں اس نازک

سو میں پھر اور بھی زور سے رونے لگا۔ جبکہ ہر شخص کو سکڑا ہوا چہرہ دکھتا تھا۔ اسکول ماسٹر ڈر گئے اور انھوں نے مجھے ایک اچھی جگہ لے جا کر بٹھا دیا، جہاں سے میں ٹھیک سے دیکھ سکوں۔ لیکن میں پھر بھی سسکیاں لیتا رہا۔ آنسو بھری اور بھی تھکی ہوئی آنکھوں سے کچھ لمحے بعد میں نے عظمت و جبروت کے جلوس کو شاندار۔ چوکوں میں سے ہو کر گزرتے دیکھا جنھیں سنہری اور روپہلی رنگین کاغذ اور جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا پہلے مارچ کرتے ہوئے پیدل سپاہی آئے، پھر توپوں کی گاڑیاں اور گھڑسواری کے دستے ہوئے چاق چوبند گھوڑے اور پھر ایک بگھی، جس کے دکھائی دیتے ہی کانا پھوسی ہونے لگی۔ اسکول ماسٹر نے بچوں کو تالیاں بجانے کا اشارہ کیا لیکن مجھے کسی نے نہ کہا تھا کہ کیا کرنا ہوگا اور ویسے بھی میں پھول والے ٹوپ لگائے ہوئے افسروں کے بیچ میں، جو اپنے منہ زور گھوڑوں کی لگامیں کھینچے ہوئے ہاتھ سلامی میں اٹھائے ہوئے تھے، اس بڑے جرنیل یا بادشاہ یا جو بھی تھا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں انھیں دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن انگریز عورت کے سر تک پہنچا ہوا رانی میری کو میں نے دیکھ لیا جو رنگ برنگے پھولوں سے بنی ہوئی ایک رنگین ٹوپی جیسی پہنے ایک گھوڑا بگھی میں بیٹھی تھی اور گول مٹول سا ہے وہ کوچوان فیروزی پگڑیاں باندھے اور لمبے سفید داڑھی والے، شکیل گھوڑوں پر سوار تھے جن پر لگے پھندنے کی زین کسی ہوئی تھی۔

جب جلوس ایسا لگا کہ پلک جھپکتے میں گزر گیا تو اسکول ماسٹر نے پوچھا،

'یہ جو لائی کون ہے؟'

'یہ جو ہری رام کے ڈنگے چیلا یہ بتا سکے گا کہ وہ مجھے جانتے ہیں۔' اپنی بکل کیوں

کرواتے۔ انھوں نے تو یہ کیا کہ جب ماسٹر صاحب بچوں کو لے کر نیچے دروازے کی طرف گیا جہاں مٹھائی اور کارڈ، پوزیشن میڈل مل رہا تھا تو یہ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں پہلے سے بھی زیادہ زور سے سسکیاں لینے لگا۔ ایک تو یہ لوگ چھوڑ کر چل دئے۔ دوسرے سب لوگ میری طرف انگلیاں اُٹھا رہے تھے کہ یہی رو رہا تھا۔

کچھ دیر تو میں وہیں کھڑا رہا پھر مجھے احساس ہوا کہ اگر میں نے نیچے جا کے اپنے بھیرے بھائیوں کو نہ ڈھونڈا تو میں بابو جی رام کے گھر کبھی پہنچ ہی نہ سکوں گا۔ بوکھلا کے میں ان کی تلاش میں بھاگا۔ مٹھائی اور میڈل بانٹنے والے نے میرا حصہ دیا۔

میں نے لے کر جلدی سے نیچے جانے لگا۔ لیکن بڑے بڑے لڑکوں کی بھیڑ کے ساتھ زیادہ جلدی اُترنا ممکن نہ تھا۔ سیڑھیوں پہ اندھیرا تھا اور کوئی میری مٹھائی جھپٹا مار کر لے گیا۔ خالی دونا میرے ہاتھ میں رہ گیا اور میں پھر رونے لگا۔ کچھ اور لڑکوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا اور سیڑھیوں پہ رونا دھونا ہو رہا تھا کہ اب کیا کیجیے۔ لیکن ایک اسکول ماسٹر ڈانٹتے ڈپٹتے آ گئے اور سب بچے گرتے پڑتے چیختے چلاتے جلدی جلدی سیڑھیوں پر سے اُتر گئے۔

سڑک پر آ کر میں ادھر اُدھر بھاگا پھرا۔ ایک ایک لڑکے کی صورت دیکھی کہ ان میں شمس اور کرشن کہاں ہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں سے زندگی میں پہلی بار میں بس ابھی تھوڑی دیر ہوئی ملا تھا۔ انھیں ڈھونڈنا بالکل ناممکن تھا اس لیے کہ لوگوں کے ہجوم غفیر میں ادھر اُدھر جانا ہی آسان کام نہ تھا۔ دھکے کھاتے ہوئے کالی ٹانگوں اور بڑے جسموں والے دیہاتیوں کے پاؤں تلے روندا نہیں گیا یہی غنیمت ہے۔ میں ایک اجنبی دُنیا میں کھو گیا تھا۔ سب میرے دشمن تھے اور میں پھر رونے لگا۔

پولیس کے ایک سپاہی نے مجھے پکڑا اور پوچھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں اور میرے باپ کا کیا نام ہے۔ میں نے اسے جو کچھ بتایا اس سے وہ کچھ بھی نہ سمجھ پایا۔ اگرچہ ہندوستان میں ہر آدمی ہر ایک آدمی کو جانتا ہے۔ لیکن اس پولیس والے نے نہ تو ڈونگرگڑھ جنکشن کے بابو رام چند کا نام سنا تھا اور نہ وہ دہلی اور شملے والے بابو حویلی رام کو جانتا تھا۔ پھر بھی وہ کچھ دیر مجھے ادھر ادھر لیے پھرتا رہا۔ اس نے مجھے پوری اور حلوہ کھلایا، بہلایا، پھسلایا۔ میرے کپڑوں کی تعریف کی اور میرے گہنوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ پھر اس نے مجھے ایک صرّاف سنار کے سپرد کر دیا اور چلا گیا۔ میں اتنی دیر میں تھک کے چور ہو گیا تھا اور بہت رنجیدہ بھی تھا۔ مجھے سنار کی دری بچھی ہوئی اور گدے سے لگی ہوئی دکان پر نیند آ گئی۔

صبح کو بابو حویلی رام جو اس پریشانی میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے اور بازار میں پوچھتے پوچھتے سنار کی دکان پر آئے۔ سنار نے مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ نیند سے میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اور بابو حویلی رام مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ میرے لیے دوپہر سے ہی کھانا رکھا ہوا تھا وہ میں نے گھر پہنچ کر خوب مزے سے کھایا اور چونکہ بابو حویلی رام کی بیوی گھر میں نہیں تھیں اس لیے ان کی لڑکی نے میرا ہاتھ منہ دھلایا اور مجھے اپنے ساتھ کھیل میں لگا لیا۔

میرے چچیرے بھائی بھی بہت اچھی طرح پیش آئے اور مجھے خوش کرنے کے لیے انھوں نے طرح طرح کے کھیل دکھلائے۔ لیکن میں بہت تھکا ہوا اور رنجیدہ تھا اور سانپ سیڑھی کے بیچ ہی میں مجھے نیند آ گئی اور پھر دوسرے دن صبح میری آنکھ کھلی۔

صبح کو باجی کا نام سنتے ہی میں فوراً اٹھ گیا، گرم گرم چائے پی اور بسکٹ کھائے اور چچا ہری رام اور اپنے چچیرے بھائیوں کے ساتھ دربار دیکھنے چل پڑا۔

رنگ برنگے کپڑے پہنے پُر ترتیب، کھمبیوں کو سجانے کے لیے ہزاروں بھانتی بھولی صورتیں، ویج بازاروں میں سے ہوتی ہوئی چلیں اور جھانکیوں اور محرابوں کے نیچے سے، جو کل کے جلوس کے بعد اُجڑے بکھرے لگ رہے تھے، گزر کر ہم لوگ ایک ایسا منظر دیکھنے پہنچ گئے جو میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک اونچے شنٹ پر، جہاں ایک ہموار میدان میں شیشے کی طرح چپڑے نقارے وہ بڑے بڑے ایسی قسم بنائے گئے تھے جن کی شکل ایک بہت بڑے دائرے کی تھی۔ اس کے ایک طرف ایک شاندار شامیانہ تھا جس کے سامنے سٹیج کا دو کھڑکی تھی۔

اچانک بگل بجنے لگے اور نقاروں پر چوٹ پڑی جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی، اس لیے کہ ان آوازوں سے میں اپنے بچپن ہی سے مانوس تھا۔ اور دور سے گرد اڑتی ہوئی چھولداریوں کی طرف سے فوجوں کے دستے آنے لگے۔

میں نے اپنی جگہ پر سے تقریباً اچھل کر کہا: "میرے باجی بھی انھیں میں ہوں گے"؛ لیکن میرے چچا ہری رام نے مجھے پکڑ کر بٹھا لیا اور اپنے بچوں کو بھی چپ رہنے کو کہا جو جلوس کی طرف اشارہ کر کے طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے۔

میں گھوڑ سواروں کو جن کے نیزے دھوپ میں جگ مگ جگمگ کر رہے تھے
اور پیدل دستوں کو جن کی بندوقوں کے جھنڈے صبح کی ہلکی ہلکی ہوا میں لہرا رہے تھے
اور ان کے پیچھے خوش رنگ اور بھڑکیلی وردیاں پہنے آفیسروں والوں کو دیکھتا رہا
عام لوگوں کے پویلین کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور انسانی چہروں کے اس ہجوم میں
مارتے ہوئے سمندر میں بہتے ہوئے، آنکھیں پھاڑے، نظریں جمائے ہوئے، فوج
کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس بات پر فخر محسوس
کر رہا تھا کہ میرے راجہ بھی انھیں میں ہیں۔ انھیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا
اور مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی، جو میرے لیے آج کے اصل ہیرو ہیں، جلدی
دکھائی دیں گے، اس لیے کہ وہ تو سرداروں کے سردار تھے۔ کاش اتنا اونچا
کر میں بھی وہیں کہیں شامیانے کے پاس کھڑا ہوتا، جہاں انگریز بیٹھے گھوم رہے
تھے۔ میں اتنا بھولا تھا کہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میرے راجہ ایک معمولی این سی او
ہیں اور بلند مرتبہ صاحب لوگوں کے ساتھ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ راجے مہاراجے آئے، مخمل اور ریشم
کے درباری لباس پہنے ہوئے، سر سے پاؤں تک ہیرے جواہرات اور بیش قیمت موتی
سے لدے ہوئے، اور عام لوگوں کی بھیڑ میں ایک منھ سے دوسرے منھ تک
یہ خبر پھیلتی رہی کہ کون سے راجہ کہاں کے ہیں اور ان کے زنان خانے میں کتنی رانیاں
اور فیل خانے میں کتنے ہاتھی ہیں۔

لیکن راستے میں ہندوستانی فوج کا پورا بینڈ آ گیا اور اس کی مارچ کی
دھن میں کانا پھوسی کی آوازیں ڈوب گئیں اور اس نے گویا وائسرائے کی آمد

نے بیے سب کو ہوشیار خبردار کر دیا۔ یہ دیوتا بھی آ گئے۔ ان کے بانے کا پچھلا
حصہ کم عمر شاہزادے سنبھالے ہوئے تھے جن کی زرتار اچکنیں اور پگڑیاں سورج کی
رنگارنگی کرامات کرتی تھیں اور ان کے لپ جھپ بانے کی شان ان تمام بچوں سے
بڑھ چڑھ کر تھی جو ہم نے زندگی میں کہیں بھی دیکھے ہیں۔

اب سارے لوگ دم سادھے ہوئے چشم براہ تھے اور فضا اشتیاق و دید
سے بوجھل تھی۔

ہوا کی لہر کی سی خاموشی سے ایک شاہی گاڑی آئی جسے چار گھوڑے کھینچ
رہے تھے اور جس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے قرمزی وردیاں پہنے گھوڑ سوار
تھے، جس جگہ بڑے بڑے صاحب لوگ، مہاراجے اور اعلیٰ حکام بیٹھے تھے
وہاں کچھ تالیاں بجیں، اور عام لوگوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ "بادشاہ اور ملکہ!"
ایک تماشائی نے کہا۔ "ان کے سروں پر سنہری چیزیں ہیں جیسے پرانے زمانے
میں دیوتاؤں کے سروں پر ہوتے تھے!"

دوسرا بولا۔ "میرے بچنے ہوئے ہے!"

تیسرے نے کہا۔ "اور گھٹنوں کے نیچے تو کچھ پہنا ہی نہیں ہے!"

لیکن توپوں کی گرج میں یہ باتیں ڈوب گئیں اور دو شخصیتیں، جو دودھ سے
اجلی بچوں کی چھوٹی ڈونگی رہی تھیں، میدان میں داخل ہوئیں۔ مجمع نے کھڑے
ہو کر سلام کیا اور خواص نے تالیاں بجائیں۔

بادشاہ اور ان کی بیگم نے جھک کر مجمع کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ
فوارش کے پاس آ کر رکے اور فوراً ہی ہوں اور جوتی کی مدد سے بڑا سا یونین جیک

(برطانوی ریاستی جھنڈا) بلند کیا گیا اور جب وہ کھل کر لہرانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے جادو ہو گیا۔ پھر سے میدان میں سلامی میں توپیں گرجنے لگیں اور بینڈ باجوں کے باجوں سے وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

"دوسرے صاحب لوگ ننگے سر ہیں تو یہ کیوں اپنی ٹوپی لگائے ہیں؟" میں نے اس نرالی دھج کو دیکھ کر پوچھا۔

"شش۔ شش:" بابو جیالی رام نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے چپ رہنے کی تاکید کی۔

بگل بجے اور میرے دل میں اور بھی دہشت بیٹھ گئی۔

اور پھر بینڈ کے باجوں سے بہت سے نغمے بجے کہ ایسی عجیب قسم کی آواز آئی جیسی کہ میں نے تو شہر میں ایک انگریز صاحب کے دفتر میں سنی تھی۔

بادشاہ، جو بیٹھے تھے، اب تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔

لیکن ان کے بیچ بیٹھے اور گورے تھے ہوئے انگریزی بولنے کو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بھیڑ میں پھر کھسر پھسر ہونے لگی۔

ایک سکھ نے بابو جیالی رام سے کہا۔ "اس کی ٹوپی میں جو وہ لعل ہے وہ کوہ نور ہے۔ یہ پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا تھا۔ پھر انگریزوں نے اس دال میں ... اس بادشاہ کی دادی نے مہاراجہ دلیپ سنگھ سے، جو رنجیت سنگھ کے بیٹے تھے اور جنہیں اس نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، یہ لعل چھین لیا....."

بابو جیالی رام نے کہا۔ "یہ انگریزی راج سب سے بڑا اور قیمتی ہیرا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"شش..." بابو جیون رام نے مجھے چپ کرا دیا اس لیے کہ مجھے چپ رہنے اور ادب سے بیٹھنے کی تاکید کرنے کے لیے بہت سے پولیس انسپکٹر گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

جارج پنجم کی گونجدار تقریر ختم ہو گئی اور ایک ذرا سے توقف کے بعد عوام نے پھر تالیاں بجائیں۔

اس کے بعد راجے مہاراجے ایک کے بعد ایک آ آ کر اپنے شہنشاہ کو نذر گذرانے لگے۔

اس طرح دربار سے مجمع کُھل گیا اور مکمل خاموشی پھر گپ شپ اور ویسی ہی باتیں شروع ہو گئیں اور انھیں پولیس انسپکٹر بھی نہ روک سکے جو اپنے گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ہندوستانی قوم کو خاموش رکھنا بڑا مشکل ہے۔ جب میں بڑا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ دہلی دربار میں مجمع کی بے تہذیبی سے انگریزی سرکار پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ سننے میں آیا کہ عام لوگ تو عام لوگ، ایک راجہ مہاراجہ بڑودہ نے بھی بادشاہ و قیصرِ ہند کی شان میں گستاخی کی، اس لیے کہ وہ اپنے تاجدار کے سامنے تعظیم تو بجا لائے لیکن واپس آتے وقت انھوں نے دس قدم تک، دیر تک ٹھہرے بغیر، بادشاہ کی طرف پیٹھ کر دی اور اپنا سر بھی اٹھائے رکھا۔ بابا جی نے بتایا کہ دربار میں جو بد تہذیبی ہوئی اس پر تو جی انگریز خاص طور سے بہت ناراض تھے۔

آخر کار بادشاہ نے شامیانے سے باہر آ کر مجمع کو درشن دیا۔

مجمع میں کھسر پھسر ہوئی۔ "روشن، جلوہ" اور تماشائیوں نے گردن اُٹھا اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔

بینڈ نے ایک بلند آہنگ سنگیت چھیڑا۔

اور اس کے ساتھ وہ ڈھول اور بگل اور نقارے بجتے رہے۔

پھر ایک بار بگل گونجے۔

پھر کسی نے کہا۔ "لاٹ صاحب، وائسرائے تقریر کر رہے ہیں۔"

"کیا؟" ایک تماشائی نے کان لگا کر سننا چاہا۔

"کہہ رہے ہیں۔" "راجدھانی کو کلکتے سے دلی منتقل کر دیا جائے۔"

"آراضی کی سمائی؟ کیا کہا؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کچھ سنائی نہیں دیتا!"

پھر باتوں کی آواز اونچی ہونے لگی۔ کانا پھوسی ہوئی اور چپکے چپکے سوالات ہوئے۔ کچھ تماشائیوں نے اپنی اپنی گردنیں اُٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا اور پیچھے والوں نے اس پر شور مچایا۔ کرید اور دلچسپی مجمع کے ادب اور تہذیب پر غالب آگئی تھی۔ ایک بچے کی حیثیت سے مجھے اس سب میں بڑا مزا آرہا تھا۔

وائسرائے نے اپنی تقریر ختم کی اور بینڈ نے "گاڈ سیو دی کنگ" کی دھن بجانی شروع کی اور باتوں کا شور دب گیا۔

میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں اپنے ابا کو دیکھنے۔ وہیں تو ہیں وہ؟"

لیکن قبل اس کے کہ میں اچھل کر قانون کے پنجے میں جا پڑوں بابو حویلی رام
نے مجھے پکڑ لیا۔ اور میری ضد اور شوق سے مجبور ہو کر انھوں نے مجھے بابوجی
کے ڈیرے میں لیجانے کا فیصلہ کیا..... جیسے ہی انھوں نے مجھے اٹھایا اُن
کی بھیگی آنکھیں بیسکوپ جیسے ہاتھوں پر پڑ گئیں۔ سونے کے کڑے غائب تھے۔
بابوجی نے ان سے کہا تھا کہ کڑے اتار کر اپنے پاس رکھ لیں اور کل اپنے بچوں کے
پاس پہنچاتے وقت وہ اتارنا بالکل بھول گئے تھے۔

"تیرے کڑے کہاں ہیں؟" انھوں نے ڈر کے مارے کانپتے ہوئے کہا۔
اب وہ مجھ سے خاصے عاجز آچکے تھے۔

میرا جی ڈوبنے لگا۔ میں نے سوچا کہ بابوجی اسی طرح مجھے کوٹیں گے جیسے
انھوں نے بھنگیوں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر ورشا کو لاہور میں مارا تھا۔
میں اس وقت کے خیال ہی سے ڈرنے لگا، جب میرا اور بابوجی کا سامنا ہوگا۔
اب مجھے ان کے پاس جانے کا کوئی شوق نہ تھا۔

لیکن جانا تو مجھے تھا ہی، اس لیے کہ بابو حویلی رام اپنے آپ کو بڑا
ذمہ دار سمجھتے تھے۔

"اور جب مجھے دیکھ کر بابوجی نے، جو آج کے جشن میں شریک ہونے پر
پھولے نہ سماتے تھے، بڑی خوشی کا اظہار کیا، مجھے پیار دلار کیا اور وہی الفاظ
گیت دوہرانے لگے۔ "بی بی... بی میرا بیٹا" تو مجھے اور بھی ڈر لگا لیکن
جب بابو حویلی رام نے انھیں الگ لیجا کر بتایا کہ کڑے گم گئے ہیں، تو ان کا منہ
لٹک گیا۔

سارا فخر، ساری خوشی، ساری مسرت، جو انھوں نے اس بات پر محسوس
کی تھی کہ ان کی جنت تاجپوشی کے جشن میں شریک ہوئی ہے اور اس سے ان کی
عزت بڑھ گئی ہے۔ یہ سنتے ہی یکدم کافور ہو گئی جو بیسیکوں ہاتھ سے سونے کے کڑے
اتر گئے۔ مجھے اپنے ساتھ لانے پر وہ خوب پچھتائے۔ کچھ تو اس لیے کہ وہ اپنی
وزیر خزانہ، میری ماں، سے ڈرتے تھے۔ جن کا خیال یہ تھا کہ بابجی روپے
پیسے کے معاملے میں لاپروا ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ تھوڑی آمدنی کے آدمی تھے
اور اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کو دبا کر جو پیسہ جمع کرتے تھے اس کو بڑی اہمیت
دیتے تھے۔ اور پھر کچھ اس لیے بھی کہ ساری ذہنی اور معقول دلیلوں کے باوجود
ان کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ نقشیر کا بڑا اثر ہے جس کی چھاؤں میں سے جنم لیا ہے
چنانچہ انھوں نے اس بات کو فال بد سمجھا اور یقین ہو گیا کہ جلد ہی کچھ اور
مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں۔

لیکن اس خصوصی وقار نے، جو بابجی کے خیال میں اعلیٰ حضرت بادشاہ
شہنشاہ کی خوشنودی کا رکن ہونے کی وجہ سے انھیں حاصل ہوا تھا، معجزہ کر دکھایا۔
اس لیے کہ انھوں نے مجھے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کبھی بہلا پھسلا کر اس
عورت کی پوری روداد سنی جب میں کھو گیا تھا اور انھیں ایک لٹا ہوا شبہ ہوا
کہ کس آدمی نے کڑے اتارے ہیں۔ قریبی راستے میں سے سپاہیوں کی ایک ٹولی
ساتھ لے کر وہ اس دکان پر پہنچے جہاں پولیس کانسٹیبل نے مجھے چھوڑا تھا۔ اور
لالہ جی سے پوچھا کہ وہ اس کانسٹیبل کو جانتے ہیں جو مجھے ان کے حوالے کر گیا تھا
لالہ جی کو پولیس والوں کے تیوری ڈالنے والے طریقوں کا تو شاید تجربہ ہو

لیکن انھیں مزاج والوں کے پیچیدہ ذہنی طریقے کا بالکل کوئی اندازہ نہ تھا۔ باجی کے سوال کا وہ جواب ہی نہ دے پائے تھے کہ سپاہی ان پر پل پڑے۔ ان کے تو اوسان خطا ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ وہ پولیس والے ہیں کہ اس آدمی کو پہچان سکتے ہیں اس لیے کہ وہ اسے شہر کے دروازے پر روزانہ ڈیوٹی پر دیکھا کرتے تھے۔ ہندوستان میں فوجی عملے کو پولیس سے اونچا سمجھتے ہیں، خاص طور سے اس لیے کہ فوجی سپاہی کی تنخواہ پولیس کانسٹیبل سے زیادہ ہوتی ہے اور کانسٹیبل کی وردی بھی گھٹیا قسم کی ہوتی ہے۔

پولیس کانسٹیبل، جسے مال کو اپنی حفاظت میں رکھنے کی عادت تھی، فوجی سپاہیوں کو دست و گریبان دیکھتے ہی سچائی اور ایمانداری کا مجسم بن گیا۔ اس نے کہا کہ اس نے تو فلاں فلاں گلی کے ایک سنار کے یہاں کرنسی جمع کر رکھے ہیں، اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ کالا بخش دربار کی وجہ سے دہلی میں طرح طرح کے چور اچکے اور ٹھگ آئے ہیں، اور کرنسی بچے گی؟ تو یقیناً ضرور جاتے رہیں گے۔ اور اس نے اور مقامی انسپکٹر نے ہم لوگوں کے ساتھ مہمانوں کا برتاؤ کیا اور جب تک دودھ اور مٹھائی نہ کھلا دی ہمیں وہاں سے اٹھنے نہ دیا۔ کانسٹیبل تو کچھ کچھ گیا اور جاتے ساتھ ہی سنار کے یہاں سے کرنسی واپس دینے پر تیار ہوا۔ پھر پتہ چلا کہ غلطی سے سنار نے گنیوں کو مروڑ کر توڑ دیا تھا شاید اس لیے کہ کہیں روپے سکے کھلے نہ پڑ جائیں!

اس نے باجی کو یقین دلایا۔ "سونا گنیوں کی شکل میں نہیں، ڈلوں ہی میں ٹھیک رہتا ہے...."

میں نے اس کی بات گرہ کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر میں نے گنیوں کی کوئی چیز نہیں رکھی۔

۴

اگر اپنی جنم کنڈلی کے حساب سے، جو پنڈت بال کرشن نے بہت سی جنتریوں کی مدد سے تیار کی تھی، میں شنیچر کے اثر میں تھا تو میرے اباجی یقیناً کسی اور بھی نحوس ستارے کے اثر میں رہے ہوں گے۔ اماں اس سے بھی زیادہ منحوس اور میرے بھائی ہرش، اور گنیش بدترین ستاروں کے اثر میں رہے ہوں گے۔ اصلیت تو یہ ہے بہت سے واقعات ایسے ہوئے جن سے ہم لوگ الگ الگ بھی متاثر ہوئے اور پورے کنبے کی حیثیت سے بھی۔ چین اور سکون اور خوشی کے وہ دن، جو میرے والدین کے خیال میں ہم ایک زمانے میں دیکھ چکے تھے، پھر لوٹ کر نہ آئے، حالانکہ مرتے دم تک میری اماں منگل کو ٹونا اتارنے کے لیے نالی کو تیل دیتی رہیں، اور شنیچر کا برا اثر دور کرنے کے لیے جمعہ کو کسی برہمن کو کھانا کھلاتی رہیں۔

دلی سے واپس آنے کے کچھ دنوں بعد میرے اباجی اس جگہ سے جہاں اپنی عادت کے مطابق شال لپیٹے کھڑے ہوئے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" پڑھ رہے تھے، دوڑ کر رسوئی میں گھس آئے اور انھوں نے گھبرا کر اماں کو یہ خبر سنائی کہ غضب ہو گیا۔

انھوں نے بتایا کہ "وائسرائے کی کوٹھی کے پاس سڑک پر ایک بم ملا ہے! لوگ کہتے ہیں کہ یہ بم فرنگیوں کو مارنے کے ارادے سے رکھا گیا تھا..... اس سے بس ایک سپاہی مرا جس نے فٹ بال سمجھ کر اسے ٹھوکر لگا دی....."

"اماں نے بڑے اطمینان سے ذرا بھی گھبرائے بغیر پوچھا: "تمھارے خیال

ہیں کس سے کیا ہوگا؟"

"شبہ یہ ہے کہ بنگال والیوں نے رکھا ہوگا جنھیں اس پہ اعتراض تھا کہ راجہ صاحب کو کلکتے سے وہیں منتقل کیا جائے۔ اور سرکار کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان میں برٹش راج کو ختم کرنے کی بہت بڑی سازش ہے۔"

"تو پھر!" اماں نے تبصرہ کیا۔

"اخبار میں لکھا ہے کہ سازشیوں میں وہی فسادی ہیں جو ان جھگڑوں میں بھاگ آئے تھے جو لارڈ کرزن کے زمانے میں بنگال کے دو ٹکڑے کر دینے پہ اٹھے تھے۔ اور آریہ سماج کے ممبر۔"

"تو اس میں کون سی ایسی قیامت ہوگئی؟" اماں نے بڑے اطمینان سے سوال کیا۔ "ان انگریزوں نے جیسا کیا ہے ویسا ہی تو بھریں گے۔ ان کے سر تو آسمان پر چڑھ گئے ہیں۔ نہ کوئی دین دھرم ہے نہ کچھ حیا شرم ہے۔ آخر انھوں نے کیسی بے دردی سے سکھوں کو قتل کیا۔ انھیں لوگوں کی بے انصافی کی وجہ سے میرے بابا کی آدھی زمین ضبط کر کے غداروں کو دے دی گئی۔ حرام خور کہیں کے۔"

بابجی سے نہ رہا گیا۔ "لے تم تو بے وقوف ہو۔ سماج......"

"تو کیا ہوا کوئی سماجی پکڑا گیا؟" اماں نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تک تو بس ایک بنگالی پکڑا گیا ہے۔ اس بیچارے کا گھوش نام ہے۔ لیکن جلدی ہی سماجی بھی پکڑے جائیں گے۔"

اماں نے کہا: "تو ہمیں اس سے کیا۔ تم نے تو کسی کا کچھ بگاڑا نہیں؟"

بابجی نے جھنجھلاتے ہوئے کہا: "عقل کے پیچھے تو لٹھ لے کر پڑی ہو۔ میں سمجھا

کے آدمی سماج کا ستون ہوں اور یہ پیارے بچے چھتر سنگھ اور دوسرے لوگ ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ موقع ملے اور یہ جا کے میرے خلاف صاحب لوگوں کے کان بھریں۔ یہ لوگ جلد سے جلتے ہیں اور کسی وقت بھی جا کر زہر اگل سکتے ہیں۔"

اماں بولیں: "مجھے تو سماج میں کوئی ایسی برائی نظر نہیں آتی۔ آخر سب بڑے لوگوں نے تم کو اپنا پردھان بنایا ہے کہ تم ان سب سے زیادہ شریف پائے گئے ہو اور تم لوگ سوائے تاش شطرنج کھیلنے یا ساتھ مل کر کسی رنڈی کے یہاں مجرا سننے کے علاوہ اور تو کوئی برائی کرتے نہیں...... یہ نہ سمجھنا کہ مجھے وہاں کے رنگ ڈھنگ کا پتہ نہیں....."

"ارے حضور، سماج کے آدرش بڑے اونچے ہیں۔ یہاں سب کے پاس سوامی دیانند نے دیے ہیں۔"

اماں نے چوٹ کی۔ "شراب اور رنڈی بازی بھی نا؟"

بابو نے احتجاج کیا۔ "ہرگز نہیں۔ سوامی دیانند جی پھر وید اور ان کی شرن میں لے گئے۔ انھوں نے چند دنوں کو مورتی پوجا سے روکا....."

"سب دھرم....."

"تم تو بیوقوف ہو۔ میں تو گھبرا گئی ہوں۔ لیکن وہ بھی تو ٹھیک تھے۔ بچپن کی شادی اور ذات پات کے سخت بھید کے خلاف تھے اور ان کی منشا تھی کہ ہم پرانے آریوں کی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کریں۔"

اماں نے پھر چوٹ کی۔ "میرے خیال میں وہ فیشن کے حق میں تھے۔

اسی لیے ہم سب فیشن پرست ہیں، اس لیے کہ اس بات چیت کے دوران میں چائے

اور کچھ ہماری سمجھ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو، اتنا ہم ضرور جانتے تھے کہ ان میٹنگوں میں جمع ہونے والے بابو لوگ کھدر ٹوپیک کا ر لگاتے تھے اور "گاندھی" باندھتے تھے۔

باباجی نے اماں کو ڈانٹا۔ "بچوں کے دماغ میں ایسی واہیات باتیں مت بھرو۔ تم تو جانتی ہو کہ مجھے اس میں شریک ہونا پڑا تاکہ گورنمنٹ میں اور صدر بازار کے بڑے بڑے لوگوں میں میری پوزیشن بنی رہے۔ آخر ہیں تو ہم شیڈولڈ کی نیچ جات کے، اور جات کا کلنک آسانی سے تو چھوٹتا نہیں۔ پھر آدمی اوپر سے آنے کے بعد اگر کسی طرح کے کلب میں بھی نہ جائے تو کرے بھی کیا؟"

اماں نے جل کے کہا۔ "دفع دور اپنے سفید بابوں کو، جن کی وجہ سے سب لوگ تمہیں چچا کہتے ہیں اور جن کی آڑ میں تم شراب بھی پیتے ہو اور رنڈی بازی بھی کرتے ہو، اور بہانہ بناتے ہو بابوؤں اور صدر بازار کے دکانداروں میں بیٹھنے اٹھنے کا۔ ان لوگوں کو بھی تم اچھے لیڈر ملے ہو!"

باباجی نے جواب دیا: "بیوقوفی کی باتیں مت کرو، سرکار ہم لوگوں کو سازش اور بغاوت کا چشمہ سمجھتی ہے۔ معلوم ہے لالہ لاجپت رائے بھی سماج کے ممبر ہیں، اور وہ 'پگڑی سنبھال او جٹا' والے اجیت سنگھ بھی۔"

اماں نے شرارت سے "پگڑی سنبھال او جٹا" گنگنانا شروع کر دیا۔ جو کسانوں کو اس بات پر اکساتا تھا کہ تن کر کھڑے ہوں اور اپنی پگڑی سنبھالے رہیں، ہندوستان میں پگڑی تو عزت اور وقار کی علامت ہوتی ہے نا!

باباجی مایوس ہو کر چلے گئے۔ انھیں اماں سے کوئی ہمدردی نہ ملی۔ ہم نے دیکھا کہ انھوں نے گھر نہیں بجائے اور بغیر کچھ کھائے ہی دفتر چلے گئے۔

ان کی بوکھلاہٹ نے گھر بھر میں ایسا تناؤ پھیلا دیا تھا کہ ہر ایک لگتا تھا کہ بھرا بیٹھا ہے اور بات بے بات پھٹا پڑتا ہے۔

اس دن سہ پہر کو وہ آئے تو انھوں نے کہا کہ ان کی ہڈیوں میں، خمار سرایت کر گیا ہے اور پانچ دن کے لیے پڑ رہے۔

شاید یہ خوش قسمتی ہی تھی اس لیے کہ اس طرح وہ شہر نہ جا سکے اور ان پر یہ شبہ نہ کیا جا سکا کہ وہ شنبہ سوسائٹی یا اس کے کسی ممبر سے صلاح مشورہ کرتے رہے ہیں۔

لیکن اس بم والے تحفے کے اثرات کے بارے میں بابا جی کا تردد و فکر نہ ہوا تھا کہ ایک اور بات ہو گئی جس سے ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ بات بات پر انھیں غصہ آنے لگا اور پورے گھر پر دہشت کی فضا چھا گئی۔ جہاں پہلے ہم بچوں کی چیخ پکار، اور ہنسی قہقہے گونجا کرتے تھے وہاں اب ان کی کرخت آواز اور ماں کی منت سماجت سنائی دیتی اور بس۔

ہوا یہ کہ ایک دن اچانک ان پہاڑیوں پر سے کچھ پٹھان اترے جو ہماری پارکوں کے اُدھر تھیں۔ یہ لوگ ایسا بھیس بدلے ہوئے تھے جیسے جنگلی بھولی بکریوں، بھیڑوں کو ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ اس دن ندی کے اوپر کہرا چھایا ہوا تھا اور ہماری پارک سے پہاڑیاں نہ دکھائی دیتی تھیں۔ کہا یہ جاتا تھا کہ ان لوگوں نے گودام پر پہرہ دینے والے سپاہیوں کو پکڑ کر ان کی مشکیں کس دیں اور منھ میں کپڑے ٹھونس دیے، اور بارود خانے سے ستر رائفلیں لوٹ کر پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔

ماں نے کہا: "یہ حرام خور کتنے جیوٹ والے ہیں!"

باجی نے چڑ کر انھیں ٹوکا۔ "ذرا سوچ سمجھ کے ان کی تعریف کرو، کسی نے سن لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!"

"کیوں نہ کروں! مجھ سے تو ان پٹھانوں نے ہمیشہ بھائیوں جیسا برتاؤ کیا۔ میں پل پر سے آدھی رات کو گزری اور ان لوگوں نے کبھی آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں!"

"ارے بیوقوف، کوئی سن لے گا،" باجی نے کہا۔ "کسی جستی یا سپاہی کو بھنک مل جائے گی اور پھر بات کے تو پر لگ جاتے ہیں۔ تمھیں معلوم نہیں کہ سرکار جتنا بنگالی بم اور سرحدی قبائلیوں کے حملے سے ڈرتی ہے اتنا اور کسی چیز سے نہیں ڈرتی!"

"تو پھر کیوں فرنگیوں نے آ کے دوسروں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے؟" اماں نے کہا۔ "ان غاصب بدنیتوں کے بارے میں جنھوں نے ان کی زمینیں ضبط کر کے ان کے چچیرے بھائی ہربنس سنگھ کو دے دی تھیں، اماں کے والد جو باتیں کہا کرتے تھے انھیں وہ کبھی بھولی نہ تھیں۔

باجی نے کہا: "یہ تو ٹھیک ہے کہ ان لوگوں نے دوسرے لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے، لیکن یہ تو سوچو کہ اب جب کر لیا ہے تو پھر چھوڑیں گے تو نہیں اور یہاں ہیں تو ڈرتے بھی ہیں۔ اسی لیے ہماری پلٹن کو اس پتھریلے ویرانے میں تعینات کیا گیا ہے اور اسی لیے سرحد پر قدم قدم پر چوکی ہے۔ ایک زمانے میں اس پورے علاقے میں میم صاحب لوگ نہیں آ سکتی تھیں۔ یہ تو ابھی تھوڑے دنوں سے آنے لگی ہیں!"

اس نے کسانوں کی فطری عقل سے کام لیتے ہوئے کہا: "آخر ڈرتے
کاہے سے ہیں؟ دنیا بھر کی تو فوجیں ہیں اور توپ بندوق۔ بیچارے پٹھانوں کے
پاس تو تھوڑے سے دار، چند وقیں ہیں وہ بھی گنی چنی!"

"ارے منہ یا تو نہیں جانتی، یہ لوگ وزیری، محسود اور دوسرے قبیلوں
کو اب تک زیر نہیں کر پائے ہیں۔ پھر انھیں روس کے بادشاہ کا بھی ڈر ہے جو چاہے
دولت مند ملک پہ دانت لگائے ہے۔"

"میں روس کے بادشاہ کو تو نہیں جانتی لیکن انگریز ہیں اور وزیریوں کو جو ت
پھیر لیا! اسی طرح کسانوں کے بجائے یہ بھی فرنگی چند روپے سو کے بٹے داؤ
دو چار تھیلی کیوں نہیں دے دیتے؟ غریب، تو تم جا تو کبھی حملہ کرتا ہے جب پیٹ کی آگ
ستاتی ہے، لیکن مالدار تو اپنا زور دکھانے کے لیے ظلم توڑتا ہے۔"

میں نے حامی بھری۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ اگر پٹھانوں کے ساتھ ذرا سی رعایت
کی جائے تو ان جیسی شریف قوم تو دنیا میں ہی نہیں۔ بڑی آن بان کے لوگ ہیں۔
مگر وہی ہیں ان سے مرنے پہ تیار۔ ہیں تو گھڑی میں جان نچھاور کرنے پر آمادہ۔ اگر کسی کو
دوست کہہ دیں تو پھر ان سا وفادار دوست نہیں اور خون کے پیاسے اگر....."

"ہاں خون کے پیاسے ——— فرنگیوں کے، سو کون نہیں ہے؟"
اس نے کہا۔

میں نے کہا: "لیکن یہ تو تم بھی جانتی ہو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ لوگ کئی
پشتوں تک عداوت رکھتے ہیں اور پھر ایسے کٹر اور پیروں کے غلام ہوتے ہیں؟"
اس نے بات کاٹی: "اپنے دھرم کا پالن کرتے ہیں اسی لیے اپنے پیروں کے

کے پر چلتے ہیں، لیکن جب ہمارے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انھیں فتح کر لیا تو ہمارے دوست بن گئے۔"

"کچھ نہیں، پیر بھرے ہیں۔ اپنی گل فرصت میں عش، بجتے ہیں اور بات بے بات اٹھا کے بندوق داغ دیتے ہیں۔"

اماں نے ان کی بات کاٹی: "ریشم کاتتے اور اس کے کپڑے بنتے ہیں اور کیا کپڑے ہوتے ہیں!"

بابی نے پھر انھیں چپ کرایا: "اچھا اچھا، ان کے گن گانے نہ بیٹھو۔ ان پہاڑیوں میں ہم سب کے لیے خطرہ ہے۔ یہ تو عیاروں کا جھنڈ ہے۔ اگر اس گورے جرنیل نے سڑک پر مارچ کا آرڈر نہ دیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ انگریزی سرکار سب پر رعب ڈالنا چاہتی تھی کہ دہلی میں ہندوستان کے شہنشاہ کی تاجپوشی ہوئی ہے، اور اب پتہ چلا کہ عیاروں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔"

"تو پھر اب پٹھانوں سے بیر، کھلنے کے مزے لو نہیں۔" اماں نے کہا اور وہاں سے لنگر پہنے بیٹھ گئیں۔

بابی بول پڑے۔ "چپ۔ ہوا چلنے کے ساتھ ساتھ ذکر کرتے۔ کیا لوگ لگتے صبح اور ہی ساتھ لیے گھومتے پھرتے ہیں۔ چپ، بگیڈیئر میں کہ لاوا ہے۔ پھیلی ہی ہے اور تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔ خدا کے واسطے اس عمر کی ذرا سی کہیں گرہ بڑی ہو کے بیٹھنا۔ اس نے کہ وہ پھر سنگھ سے مزہ دیکھنا ہوگی۔"

لیکن میری اماں بھلا اپنے انتقالی جوش کو آزادی کے مسئلے سے باز رہ سکتی تھیں۔ تیا نقیوں کے ملے کے بعد سے چھوٹی اماں نگر پیری اماں کے اور بھی قریب

آتی تھیں اس لیے کہ ان کا گھر کوارٹر گارڈ سے ملا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ آئیں تو خوب ہی کھول کر باتیں ہوئیں اور دونوں نے رجمنٹ اسپتال کے ڈاکٹر گھنشیا رام کی بیوی کے خوب لتے لیے اور دونوں کی دوستی اور پکی ہو گئی۔

ان ہنگاموں سے میرے باجی دوسرے لوگوں سے زیادہ پریشان تھے اس لیے کہ دفتر میں صاحب لوگوں سے انھیں کا سابقہ سب سے زیادہ پڑتا تھا۔ آدمی ہیڈ کوارٹر سے جو آرڈر روز صبح کو پہنچتے تھے ان کو پڑھنا باجی کی ڈیوٹی تھی۔ اور صاحب لوگ روز بروز زیادہ چڑچڑے اور سخت ہوتے جاتے تھے۔ اور یہ بات بھی تھی کہ اتنے دنوں جو رجمنٹ سرحد میں تعینات رہی تو اپنی فطری ملنساری کی وجہ سے مقامی پٹھانوں سے باجی کی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ باجی ان لوگوں کے لیے خط اور عرضیاں لکھ دیتے اور اس کے بدلے میں وہ لوگ انھیں پھلوں، تازہ انڈوں، گرم کپڑوں اور اپنے تہواروں پر پیسے لٹھے کا تحفہ بھیجتے تھے۔

باجی فکر اور پریشانی کے ملے جلے دنوں میں صاحب لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے آثار تلاش کرتے رہتے تاکہ انھیں یقین ہو جائے کہ صاحب لوگ ان پر غداری کا شبہ نہیں کرتے۔ اور اس ڈر سے کہ کہیں کوئی جن کے آنے ان کی چٹھی نہ نکلے وہ ہمیشہ اس دشمن سے کانپتے رہتے جو صاحب لوگوں کو ان کی طرف سے ملا ہوا لگتا تھا۔ اور وہ بڑی کوشش کر کے رجمنٹ میں اپنے دوستوں سے اپنے تعلقات گہرے کرتے پھرتے۔ اپنے کوارٹر کے باہر، جہاں گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر رجمنٹ کے ہندوستانی صوبیدار میجر ٹکا جہاں اپنا دربار لگایا کرتے تھے ٹکا اور باجی کے تعلقات ہمیشہ سے اچھے تھے اس لیے کہ ایک زمانے میں

بابا جی نے "کام کے کرنل" والی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر جلد ہی جلدی ہی ترقی کروانے میں گرمسکا کی مدد کی تھی اور وہ ماتحتوں میں سے موجودہ عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ اور وہ تنومند راجپوت، جس کا چہرہ شیر جیسا تھا، بس وہ اپنی داڑھی کو ٹھوڑی پہ سے اس طرح بناتے تھے کہ چہرے کی سی شکل تھی، پکا دوست رہا۔ بابو کی پریشانی کا اندازہ کر کے وہ گرم دودھ منگواتا۔ وہ بابا جی کی ہمت بندھانے کے لیے چلے گھر بھی آیا۔ اس نے مجھے اور میرے بھائیوں کو پیسے اور مٹھائیاں دیں اور اماں کے لیے پھل اور ترکاریاں بھیجیں۔

فرصت کے وقت بابا جی ایک اور کام کے آدمی، فلنگٹے کو اور ٹرامنز حوالدار سرجن سنگھ سے بھی ملنے جاتے۔ حوالدار سرجن سنگھ اتنے موٹے تھے کہ ان کی آنکھیں پوری نہ کھل پاتی تھیں اور اس طرح سانس لیتے جیسے اتنی بڑی توند اٹھانے کی وجہ سے مستقل ہانپتے رہتے ہوں۔ سرجن میرے بابا جی کے پرانے فیرا تھے دونوں ساتھ ہی رجمنٹ میں بھرتی ہوئے تھے اور بابا جی دور ہی سے ان پر فقرہ کستے، پاس آ کر توند پر ایک گھونسا لگاتے اور پھر گھنٹوں ان سے باتیں کرتے رہتے۔ سرجن سنگھ بڑے کام کے آدمی تھے، اس لیے کہ پرانے سپاہی ان کی عجیب و غریب ہیئت کی وجہ سے ان سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور جتنے لوگ ان کے ارد گرد جمع ہوتے ان کو وہ اپنے جنسی مذاق سے ایسا خوش رکھتے کہ رجمنٹ میں ان کا بڑا اثر تھا۔

کبھی کبھی بابا جی پنڈت بے رام سے باتیں کرتے دکھائی دیتے، جو رجمنٹ کے بڑے پنڈت تھے۔ داڑھی مونچھیں اور سر منڈائے، صاف ستھرے کپڑے پہنے

پنڈت جی اپنی جات والوں کی طرح حرفوں کے بنے تھے اور اس لیے ان پر کچھ زیادہ
بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ اندر سے باجی کی پوزیشن سے خار کھاتے
تھے اور کچھ دنوں پہلے انھوں نے رجمنٹ دفتر میں ہندوستانی افسروں اور بابوؤں
سے مل کر برٹش افسروں پر باجی کے اثر کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے کچھ
لوگوں کو جی شکایتیں تھیں۔ ہندوستانی افسر اس بات پر ناخوش تھے کہ ان کے کام؟
آگے نہ بڑھائے گئے تھے۔ بابو لوگ اس بات سے نالاں تھے کہ باجی ان کے
افسر تھے اور جب تک ان کی پنشن نہ ہوتی تب تک دوسرے بابوؤں کی ترقی رکی ہوئی
تھی۔ لیکن چونکہ انگریز اپنا کام چلانے کے لیے انھیں باجی کی ضرورت پڑتی تھی
اس لیے وہ کوشش کھل کر باجی کی مخالفت نہ کر سکے۔ اور پنڈت جیسے آدمی کو جاسوسی
کرنے کو خوش بھی کیا جا سکتا تھا۔ انھیں ان کے خلاف سازش کرکے ان کی شہرت کو
نقصان بھی دیا جا سکتا تھا اور پھر بکھروں میں سے کسی کی بہن پر انھیں بھروسہ نہ ہو
ان کا منہ بھی بند کیا جا سکتا تھا۔

ہمارے باجی کی سلامتی یا عدم سلامتی کا اصل چابی کوارٹر ماسٹر کے کلرک
بابو بھوسنے باجی۔ بابو چھتر سنگھ سے ہیں کے نہ تو تنہا ہی نہیں تھی بلکہ ...
تھی۔ لال اور باجی کی دشمنی کے باوجود ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ہم کو
چھتر سنگھ اور ... سے لگا۔ ہوں، ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ اصل خطرہ چھتر سنگھ ہی
سے تھا اس لیے کہ وہ ہیڈ کلرک ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اس موقع کی
تلاش میں تھے کہ کب باجی کو ہٹائیں۔ بابو چھتر سنگھ کی آرزو نے اس بات پر آ کر
دم توڑ دیا کہ انگریزی زبان پر انھیں عبور نہ تھا۔ باجی کی انگریزی کو افسر ...

شن ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر، ریورینڈ جیمس فریر نے درست کیا تھا اور گرمیوں کی دوپہر اور جاڑوں کی شام کو انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کے ان کی تقریر سنوری تھی۔

پھر بھی بابو چیٹرجی کے ہاں سے بڑا خطرہ تھا۔ اب بابو جی نے کوارٹر ماسٹر کے کلرک سے دوستی بڑھانے کی کوشش کی۔ انھیں پیار سے ان کے نام کے پہلے حرفوں سے سی بی ایس اور چیٹرجی شیو دیال کہہ کر پکارتے، اپنے ساتھ جیل قدری کے لیے لے جاتے وہ باتوں باتوں میں اپنی پنشن کا بھی ذکر کر دیتے۔ میری اماں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ مسجد میں اور کبھی بڑی بیگم کے پاس بھی گرودیوی کو سلام کرنا شروع کیا، جو کبھی کبھی بات بے بات گھنٹے کے بیٹھ رہتیں، اس لیے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے شوہر کے عقیدے کو اپنا لیا تھا بلکہ خود انھیں بھی ایک عجیب ذاتی مخالفت تھی اس بات پر کہ ان کے تو ایک بھی بچہ نہ تھا اور اماں کی گود کبھی بھری تھی۔ لیکن گرودیوی ملنے کے بعد برابر اماں کے پاس آتی رہتی تھیں، اور ان کی ذات سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اور ہم لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اس لیے کہ ہمیں دو دو جگہوں سے چیزیں ملتی تھی، اماں کے مجلس سے بھی اور پھوپی اماں گرودیوی کے یہاں سے بھی۔

رجمنٹ کے اور لوگوں کو بھی جو ادھر گیا تھا کہیں وہ لوگ بڑی بات نہ پھیلائیں۔ رجمنٹ کے مستری شے مراد دین، جن کا نام بابو جی نے تیمور لنگ رکھ دیا تھا اس لیے کہ وہ بڑی لمبی ڈاڑھی والا اکثر مسلمان تھیں، افغان لڑائی میں مرتے مرتے بچے ہوئے دل پسے گھر آیا تھا اور جب سے لنگڑاتا تھا۔ پھر جنرل ٹرنڈل تھے۔ رجمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر، بیلے جیسے نوجوان جن کی اصول پرستی کے باعث ان سے دوستی ہو پا رہی تھی، اور بڑھا بیٹا اور ساری دنیا سے بیزار ڈاکٹر گھنشیام تھے۔ سید انور

کے رہنے والے، جو کمپاؤنڈر سے ترقی کر کے ڈاکٹر ہو گئے تھے۔ ویسے تو وہ معمولی آرڈیلی پیشن کے تھے۔ لیکن اگر وہ ایک ایسے آدمی کے بارے میں کانا پھوسی شروع کر دیں جس کی مقبولیت اور آ... یہ سماج میں رسوخ سے وہ جلتے تھے، تو چھاؤنی میں ان کا اتنا اثر تھا کہ کافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اور ان کے علاوہ اس چھوٹی سی دنیا میں بہت سے آستین کے سانپ تھے جہاں ہر شخص صاحب لوگوں کی ناک کا بال بننے اور اپنا وقار بڑھانے کے لیے سازش کیا کرتا تھا۔

باجی نے سنجیدگی سے ان امکانات پر غور کیا جن کی بدولت وہ صاحب لوگوں کی نظروں سے گر سکتے تھے، وہ بڑی سنجیدگی اور خوف کے ساتھ کھانے کے وقت اماں سے ان امکانات پر بحث کرتے، ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہر شخص ان کا دشمن ہے اور کئی دن تک ان کی تیوری چڑھی رہتی، کبھی ان پر نرمی اور محبت کا دورہ پڑتا اور کبھی بلا وجہ ہی بچوں پر برس پڑتے۔

بڑے دن، کرسمس کے موقع پر جب ایک اردلی ریجمنٹ کے کمانڈنگ افسر کی طرف سے پھلوں کی ٹوکری اور ایک بند ڈبہ لیکر، جس پر لکھا تھا کرنل [illegible] کی طرف سے [illegible] اور بچوں کے لیے: جالندھر کوارٹر پہنچا، تب جا کے تناؤ میں کمی آئی۔ باجی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس لیے کہ یہ تحفہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کرنل صاحب ان سے خوش ہیں۔ وہ مسکراتے، ہنستے، چہکتے ہوئے انھوں نے صحن پار کیا۔ "آؤ بچو، آؤ، دیکھو کرنل صاحب نے تمھارے لیے کیا بھیجا ہے؟"

میں اور گنیش بیٹھک میں اپنا ہوم ورک کر رہے تھے۔ ہم لوگ وہاں سے ایک دوسرے کو دھکا دیتے، آگے نکلنے کی کوشش کرتے بھاگے کہ دیکھیں اس ڈبے میں کیا ہے جو ہم دونوں اور شیو کے لیے آیا ہے۔ اور جیسے ہی پیکٹ کھولا گیا ہم لوگ اس پر پل پڑے ویسے ہی کترنوں سمیت۔ آخر باجی نے گال شے کر ڈانٹ کے ہمارے چنگل سے ان چیزوں کو بچایا۔ لیکن ہم بھلا ماننے والے تھے، سامان گننے کے بہانے ہم لوگ ڈبے میں سے کترنیں اور کاغذ نکالنے لگے۔ جلد ہی کھلونے ہاتھ آ گئے۔

پہلے ایک ریل گاڑی کے ڈبے ہاتھ لگے، جس میں باجی نے چابی بھر کر چھوڑ دیا۔ اسے دیکھ کر میں مارے خوشی کے چلانے لگا اور میں نے ننھے کو جگا دیا۔ پھر ایک خوبصورت گلابی گالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا نکلی، جیسا ماں نے کہا کہ میری ہونے والی دلہن کی صورت ہے۔ اور اس لیے میں نے اسے کھینچ لیا اور گنیش کو چھونے بھی نہ دیا۔ اور شیو کا ایک ہاتھی، جس کا دانت اور دم کی بنی تھی۔ دیوتاؤں کے دیوتا۔ کرنل صاحب کے پاس سے آئے ہوئے ان کھلونوں کو بعد میں سنتوں کی یادگاروں کی طرح حفاظت سے رکھ دیا گیا۔ لیکن اس وقت تو بڑی ایسی خوشی ہوئی اور میں نے اپنا حق جتانے کے لیے گنیش سے وہ چھین لی کہ کہیں اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ خوشی کا سامان ہی نہ جاتا رہے۔ خیر حق کے سلسلے میں تو کوئی بحث ہو ہی نہ سکتی تھی اس لیے کہ میں لاڈلا بیٹا تھا، زیادہ زبان دراز تھا۔ بڑا تھا اور زیادہ تیز تھا۔ لیکن میں نے انھیں اپنے بھائی سے چھپنا ہی تھا کہ وہاں آ گئیں اور انھوں نے کہا کہ وہ ان کھلونوں کو خاص موقعوں

کے لیے، ان کی استھاپنا کی رسم کرنے تک رکھنا چاہتی ہیں۔ استھاپنا کی رسم ضروری تھی تاکہ گھر میں اور زیادہ برکت آئے۔

میں نے لاڈ پیار کے بگاڑے ہوئے بچے کی طرح ضد کرنی شروع کی۔ "میں لوں گا، ابھی لوں گا" اور اپنی ماں کے ہاتھوں سے چھیننے کی کوشش کی۔

"بہت اچھا بیٹو، تیری ماں رسم کرکے تجھے دے دیں گی۔" باباجی نے ڈانٹا۔ کھلونوں کو مقدس بنانے کے لیے وہ بھی ماں کے ساتھ ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ وہ آریہ سماج کے ممبر تھے جو مورتی پوجا کے خلاف تھا، اور ویدک کال کی پاک پوتر پاوتا کو واپس لانا چاہتا تھا۔ باباجی بھی زیادہ تر ہندوؤں کی طرح کسی بہت بڑی طاقت کو بھی ماننے کے پابند نہ تھے اور ان تمام رسموں اور تہواروں کے لیے اپنی رضامندی دے دیتے تھے جو ہماری ماں ایک بھولی کسان عورت کی عقیدت کے ساتھ منایا کرتی تھیں۔

میری امیدوں پر پانی پھر گیا اور میں اکڑ کر بیٹھ گیا، جو عین اسی وقت اتفاق سے جب میں اپنے بھائی پر فتح پا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس شام کو باباجی خوش تھے۔ انھوں نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کو جو وہ پڑھ رہے تھے، ایک طرف رکھ دیا۔ اطمینان قلب کی مسکراہٹ سے ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ اپنی ٹانگوں پر انھوں نے گھر کی بنی ہوئی دودھ جیسی سفید شال ڈالی جسے وہ گلابی جاڑوں میں پہنے رہتے تھے اور آرام کے ساتھ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا،

جو سفید دیوار سے لگا رہتا تھا اور اس کے اوپر سے ٹین کے لیمپ کی دھندلی روشنی فرش پر بکھری ہوئی دری پر پڑتی تھی اور وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے پورا اطمینان ہو جانے کے بعد اب وہ بدلتے نیچے لباس اور ترکی جیسی ٹوپیاں پہنے ہوئی خوبصورت سوسائٹی خواتین کی جھلکتی ہوئی تصویروں، اور شکاری لباس پہنے ہوئے لارڈوں اور ان کا، ٹوپیوں کے بارے میں سوچ رہے تھے جو انھوں نے "ٹیٹلر" اور "بائی اسٹینڈر" سے کاٹ کر دیوار پر چپکا دی تھیں۔

"کرنل بڑا اچھا آدمی ہے" انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ اس سے کہا، "اور وہ نوکری جو انھوں نے مجھے دی ہے، دشمنوں کے منھ پر جوتا ہے جوتا۔ اب جتنی چاہیں چخ چخ کیا کریں، صاحب لوگ میری طرف ہیں۔ اور آپ، یہ سمجھیے گا بھی ان کا ساتھ مبارک ہو۔ میں نے اتنے دنوں سرکار کی نوکری کی ہے اور اب میں ٹھیک سے ان کی خدمت کروں گا..... لاؤ ذرا وہ چلم تو دو.....؟" اور انھوں نے ایسی للچائی ہوئی نظروں سے نوکری کی طرف دیکھا جیسے انھوں نے ایسی نعمت کبھی دیکھی ہی نہ ہو۔

خیر زندگی میں عیش آرام تو انھوں نے کم ہی جانا تھا اس لیے کہ بچپن میں ایک کنجوس بوڑھی ماں نے انھیں زندگی کی اچھی چیزوں سے محروم کر رکھا تھا، پھر خود کفایت شعار ہونے کی وجہ سے انھوں نے کھانے پینے کی قیمتی چیزیں بھی نہ خریدی تھیں۔ چنانچہ ان کے گھر میں پھل تب ہی ہوتے جب کبھی اماں بازار جاتیں اور سستے داموں گلے ہوئے کیلے خرید لاتیں، یا پھر کوئی ڈالی لے آتا۔

"خادم ہو!" اس نے اپنی ہمدردی کے قید خانے سے نکلتے ہوئے کہا: "تم تو

بالکل بچوں کی سی بے صبری کر رہے ہو۔"

اور وہ ایک مندرلی نکال لائیں جو ان کا مندر تھی۔ اس پر کئی دیوتاؤں کی چھوٹی چھوٹی چینی کی مورتیاں لگی تھیں۔ کرشن جی کی مورتی تھی، جن کے نام پر میرا نام تھا۔ وہ ایک کے اوپر ایک پاؤں رکھے، بانسری لیے، رادھا کے پاس کھڑے تھے۔ گنیش کی مورتی تھی، مضحکہ خیز ہاتھی کے سر والا شخص، اور دولت کا دیوتا جس کے نام پر میرے بھائی کا نام تھا، وشنو کی مورتی تھی، لوہے کی ایک چھوٹی سی صلیب پر یسوع مسیح کی شبیہ تھی، زبان نکلی ہوئی۔ اسے میری ماں نے ایک راہبہ سے مانگ لیا تھا۔ جاپانی بدھ کی چینی کی مورتی تھی، کنول پر بیٹھے ہوئے۔ آغاخان کی ایک ننھی سی تصویر تھی جنھیں میری ماں کہتی تھیں کہ کرشن، وشنو اور رام کے اوتار اور اسمٰعیلی فرقے کے پیشوا، پیغمبر اسلام کی اولاد اور کشمیریوں کی برادری کے گھریلو دیوتا تھے۔ اور بہت سے چھوٹے موٹے دیوتا تھے جو سب صاف چمکاتے ہوئے اگر دان کے دھوئیں میں بیٹھے ایک قطار میں رکھے تھے۔ اس مندرلی پر بھگوت گیتا، سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب، انگریزی کی انجیل اور دھوتے کا قرآن ایک دوسرے سے لگے رکھے تھے بلکہ ایک دوسرے کو ہٹانے کی کوشش میں لگے معلوم ہوتے تھے اس لیے کہ جگہ کم تھی۔ اب جو کرنل لانگ ڈن صاحب کے یہاں سے آئے ہوئے تحفے بھی اس پر رکھ دیے گئے تو جگہ کی اور بھی تنگی ہو گئی۔

"ہو ہو۔ !!" بابا جی بھنبھنانے لگے۔ انگریز پرنسپل نے تو ان کو اعتراض کرنے کے بہانے مل گئے۔ "دیکھو بچو، دیکھو! تمھاری ماں برہمن ہو گئی ہے!" اماں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور دعائیں اور منتر پڑھتے ہوئے، مورتیوں کی آرتی اتارنے

ہوئے اور پھلوں اور کھلونوں کے اوپر سے بھی آگ دان پھیرتے ہوئے انھوں نے فرطِ عقیدت سے دیوتاؤں کے آگے سر جھکا لیا۔

"ہا! ہا!" باجی پھر ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی میں کھسیاہٹ بھی تھی اور شرارت بھی۔ "پاگل ہو گئی ہیں۔ یسوع مسیح اور وشنو، کرشن، قرآن اور گرو گرنتھ صاحب سب کی پوجا ایک ساتھ ہی کرتی ہیں ــــ پاگل ہو گئیں، رزّو، پاگل ہو گئیں، پاگل ہو گئی ہیں!"

اماں اپنے منتر پڑھتی رہیں۔ کبھی باجی کے مذاق سے پریشان ہو کر چپ ہو جاتیں، اور کبھی دو حال سکون سے مسکرانے لگتیں ــــ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کی سادگی کو ٹھیس لگی۔

"پوجا شروع کرنے سے پہلے بیٹے گرم دودھ سے دو اور صاحب نے جو کرسمس کا کیک بھیجا ہے اس کا ایک ٹکڑا۔ پھر تمھارا جو جی چاہے کرنا۔"

"اچھا" اماں نے عاجز آ کر کہا۔ "مجھے تو ایشور سے ڈرو۔ میری پوجا کا مذاق اڑاتے ہو، کیوں دیوتاؤں کا شراپ لیتے ہو۔ تمھارا دھرم تو اتنا ہی تھا کہ آریہ سماج کے ممبر بن گئے اور جب جانا کہ سرکار اسے اچھا نہیں سمجھتی تو بزدلوں کی طرح الگ ہو گئے، مگر دوسروں کو ان کی مرضی کے مطابق پوجا پاٹ کرنے دو۔"

"تم اسے دھرم کہتی ہو؟" باجی نے پوچھا۔ "وشنو کی پوجا کرنا، قرآن پر پھول چڑھانا، گیتا کے آگے سر جھکانا اور یسوع مسیح کو پرنام کرنا؟"

اماں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ان سب کے پیچھے ایشور تو ایک ہی ہے!"

"اماں بیچے بھی دودھ سے دو" گنیش نے دھیرے سے کہا، "اس لیے کہ

وہ باپ کی طرفداری دکھانا چاہتا تھا۔ "میں سونے جا رہا ہوں، مجھے نیند آ رہی ہے۔" "منے!" اماں نے اکتا کے کہا اور انھوں نے جلدی سے پتیلی کے جھٹے میں سے کٹوروں میں دودھ انڈیلا۔ کچھ رکابیوں میں چاول اور مٹھائیاں بھریں اور لا کے ہم لوگوں کے سامنے رکھ دیں۔

باجی نے چٹکار چٹکار کے دودھ چڑھانا شروع کیا۔ ان کی مونچھوں پر ملائی لگ گئی، آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ ہنسنے لگے۔ اچھی طرح چیزوں کے برتنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے دشمنوں سے [illegible] رہے ہوں۔

اماں رسوئی میں چلی گئیں۔ باجی نے جماہی لے کے اعلان کیا کہ وہ سونے جا رہے ہیں۔

میں اکیلا بیٹھا کٹوروں سے کھیلتا رہا۔ کوئی دخل دینے والا نہ تھا۔

اماں نے دالان سے اترتے ہوئے زور سے کہا۔ "کرشنا تو بھی سو جا۔" میں نے مڑ کر انھیں دیکھا تو وہ آنچل سے اپنا منھ ڈھانپ رہی تھیں۔ میں نے پوچھنا چاہا۔ "اماں کیا بات ہے؟" لیکن آواز نکلنے کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس لیے کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ اماں اس بات پر نہیں رو رہی تھیں کہ باجی نے ان کی پوجا کا مذاق اڑایا ہے، بلکہ ان سے ڈر کے مارے رو رہی تھیں۔ پتہ نہیں باجی میں ایسی کون سی کمی تھی جو وہ اکثر چڑچڑے اور غصیلے ہو جایا کرتے تھے۔

"میں تمھارے بغیر نہیں سو سکتا، تم بھی آؤ۔" میں نے کہا، اس لیے کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اماں اور باجی کی اس لڑائی میں کس کی طرف ہوں گا۔

اب سے پہلے میں باپو جی کو ہمیشہ چہرہ دیکھتا تھا اور اماں سے ایک طرح سے ڈرتا تھا اس لیے کہ جب وہ پوجا کرتی تھیں تو آنکھیں بند کر لیتیں اور ان کے انداز میں تناؤ ہوتا اور وہ بہت دور بالکل الگ لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ میری ماں نہ ہوں بلکہ کوئی بدصورت اور بے جان چیز ہوں، اور ان کی مورتیاں اتنی بھیانک لگتیں، دیوتاؤں کی بھیانک پرچھائیاں جو میری اماں کو مجھ سے چھین لیا کرتی تھیں۔ لیکن اب میں نے ایک ایسے پیار کے بندھن میں اپنے کو بندھا پایا جو سادہ تھا اور اٹوٹ، جو خوبصورت تھا اور گھنیں۔ میں نے اپنی باہیں ان کی گردن میں ڈالدیں اور وہ چپکے چپکے روتی رہیں اور میں نے ان کے سانولے چہرے کی دلکش مسکان سے چپٹا رہا اور اس وقت دیوتاؤں کا کوئی وجود نہ تھا۔

۵

میں نے اس زمانے میں ہم سب کے باپو جی کے تعلقات میں ایک نمایاں تبدیلی آتی دیکھی۔ وہ پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگے تھے۔ بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ اور جو کوئی بھی ان کی بات کاٹتا اس پر تو وہ برس ہی پڑتے۔ شاید اپنے خلاف انہیں دشمنوں کی کسی اور سازش کی بھنک مل گئی تھی، یا ہو سکتا ہے یہ وقتی بات رہی ہو۔ لیکن وہ شام کو کھانے کے بعد گھر سے غائب رہنے لگے جبکہ پہلے وہ بیٹھ کر ہم لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے اور گویا گھریلو پنچایت کی صدارت کرتے۔ بجے کر وہ پتا رہتے جاتے یا دو چار۔ ان کی بھینس نے کر امرت سر جاتے اور اماں روتے روتے سو جاتیں۔ اور جب وہ گھر میں ہوتے تو ایک کالے مہیب بادل کی طرح ایک بے نام

خوف منڈلایا کرتا۔

ان دنوں مجھے اس تبدیلی کے اسباب کا علم نہ تھا۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق صاحب لوگوں اور ہندوستانیوں کے درمیان کشیدگی کی فضا سے ہے جو اس وقت سے پیدا ہوگئی تھی جب کہ افسر اعلے کی کوٹھی میں بم ملا تھا۔ باباجی پر اس بات کا بہت اثر پڑا تھا کہ آریہ سماج کی سماجی زندگی سے ان کے جو بھی تعلقات تھے وہ انھوں نے منقطع کر لیے تھے۔ اگرچہ ان کے خلاف کسی سازشوں کا خطرہ ابھی وہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ ان پابندیوں کی وجہ سے رنجیدہ تھے جو انھیں اپنے اوپر عائد کرنی پڑی تھیں۔ تنگ نظر جاہل ہندوستانی افسروں کی صحبت اور پشاور میں شراب اور عورتیں اس کمی کو پورا نہ کر سکتی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی رقابتوں، کمینہ پن اور فوج کے تنگ خیال لوگوں کے جوڑ توڑ اور سازشوں سے وہ نفرت کرتے تھے۔ حالانکہ ان سب سے نباہ کرنا ہی پڑتا تھا۔

اب مجھے یاد آتا ہے کہ باباجی کے مزاج کی اس تبدیلی کا اثر سب سے زیادہ شدید مجھ پر ہوا۔ اس لیے کہ ہوا یہ کہ اس زمانے میں میں لاڈلے بیٹے سے بڑا ہو کر اب باقاعدہ اسکول جانے کی عمر کو پہنچ رہا تھا اور دوسری تمام مصیبتوں کے علاوہ اور تھا، کہ اس نازک دور کا کرب بھی بھگت رہا تھا۔ گھر میں 'بچے' کی حیثیت سے مجھے جو درجہ حاصل تھا وہ اب کچھ دنوں سے شیو کو مل گیا تھا اور میں اس پر خوش تھا اس لیے کہ وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور چونکہ گنیش اور اس کے دوست مجھ سے بڑے تھے اور مجھے کھیل میں اپنا ساتھی نہ بناتے تھے اس لیے میں اپنے ننھے بھائی کے ساتھ کھیلا کرتا اور اسے اپنے ساتھ ملا کر اپنے

بڑے بھائی کے خلاف مشترکہ محاذ بنا لیتا۔ ظاہر ہے کہ میں نے باجی اور ماں کے [illegible] کو بھی اس بچے کی فطری لاپرواہی کے ساتھ قبول کر لیا تھا جو ہر حکم کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا ہے۔ میں نے ان عقیدوں، تعصبات اور پسند ناپسند کو بھی اپنا لیا تھا جو باجی نے اپنے تجربے سے حاصل کیے تھے اور جنھیں وہ باوجود اس کے کہ اپنے بچپن کے دنوں سے بہت دور نکل گئے تھے، ہم لوگوں کو ماننے کا حکم دیا کرتے تھے اس لیے کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بڑے ہو کر انھیں جیسے آدمی بنیں۔

میں نے اس خاندانی عقیدے کو بھی مان لیا تھا کہ ہم سب کو اپنے خاندان کے شایانِ شان کام کر کے اپنے باپ کی عزت بڑھانے کی ہر وقت کوشش کرنی چاہیے جو کہ عزت اور اکرام کا خود حق۔ میں نے توتے کی طرح اپنی ماں کی نقل کر کے گیتا کے اشلوک بھی یاد کر لیے، اور اسکول میں بھی تیز تھا۔ لیکن باجی نے اپنی [illegible] حیثیت کو ذرا سا موقع ملنے پر اچانک اور سختی کے ساتھ جو مار پیٹ اور گالی گلوچ شروع کر دی تھی وہ مجھے سخت ناپسند تھی۔ ان کی حیثیت ہی والدانہ اقتدار اعلیٰ کا وہ زبانی قانون تھی جو سمجھا یہ جاتا تھا کہ ہماری نشوونما کو مدد پہنچاتی ہے۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب باجی نے پہلی مرتبہ مجھے مارا تھا۔ میں نے ایک پکا ہوا رسیلا آم اس ٹوکری میں سے چرا لیا تھا جو اسی دن کسی سپاہی نے بھیجی تھی جو کانگڑے میں اپنی چھٹیاں گزارنے کے بعد واپس آیا تھا۔ گھر کے پچھواڑے باجی نے جہاں ترکاریوں کا کھیت بنا دیا تھا اس کے پیچھے میں مزے سے آم چوس رہا تھا کہ گھر میں کسی کو خیال ہوا کہ میں غائب ہوں۔ باجی مجھے ڈھونڈنے

لگے اور انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں رونے لگا تو انھوں نے جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا اور زور کا طمانچہ لگایا کہ ایک تو آم چرایا اوپر سے ان کو آتا دیکھ کر خواہ مخواہ ہی رونے لگا۔ اس پر مجھے اتنا رنج ہوا اور ایسا غصہ آیا کہ میں کبھی بھول نہ سکا اور یہ ممکن ہے کہ اس دن مجھے جو مار پڑی اسی کی وجہ سے میں ان سے ہمیشہ کے لیے نفرت کرنے لگا اور بڑی حد تک اسی کی وجہ سے میرا باغی بن گیا۔ میں بگڑا ہوا ہٹ دھرم بچہ تو تھا ہی، اس مار نے مجھ میں رنج اور کرب کا احساس اور بھی شدید کر دیا۔ بہرحال، بالکل بچپن کے نظریں۔ ان تاثرات کے علاوہ اس سنسنی خیز واقعہ سے تشدد کا وہ لاوا بہہ نکلا جو میرے ذہن میں ایک آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میری ساری ہی زندگی دھوئے کے گہرا نقش چھوڑنے کے سبب سے بے واقعات کا سلسلہ جاری کر دیا گیا۔

پہلی مرتبہ جب یہ جوالا مکھی پھٹا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس لیے کہ اس کی وجہ بے انصافی کا احساس تھی۔ ایک دن صبح کو میں اسکول جانے کیلیے اپنا بستہ ٹھیک کر رہا تھا کہ دادی نے حاکم نائی کو بلالانے کے لیے کہا جو روز ابّا کے دفتر جانے سے پہلے ان کا خط بنانے آتا تھا لیکن اس دن نہیں پہنچا تھا۔

"مجھے اسکول کے لیے دیر ہو جائے گی" میں نے ان سے کہا۔ اس لیے کہ ایسے موقعوں پر دادی سے بڑا اور سب بات کرتے ڈرتا تھا۔

بابا جی زور سے چلائے "نہ سہی، جا جو تجھ سے کہا جاتا ہے وہ کر"۔

میں منمنانے لگا۔ اس لیے کہ مجھے ڈر تھا کہ میں نائی کو بلانے چلا جاؤں گا

تو گنیش بھیا بے چیز ہی چپ بیٹھا تھا۔ ایک تو ماں، روز صبح سویرے خوب جی بھر کے جھاڑو بہارو صفائی ستھرائی کرتیں تب کھانا بنانے بیٹھتیں اور پھر انھیں وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اوپر سے گھنٹوں کے انتظار کے بعد کھانا ملنے سے پہلے یہ اوپر کے کام کرنے پڑتے تھے۔ چنانچہ میں روزانہ اسکول کے لیے دیر ہو جاتی تھی اور ماسٹر صاحب کی پٹائی کا خیال کر کر کے، جو جاڑوں کی صبح کو بید کی مار سے کم نہ ہوتی تھی، ہماری جان سوکھتی رہتی تھی۔ گنیش زیادہ دنوں سے اسکول جا رہا تھا سو وہ تو مار کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن اسکول میں چند ہی بار پٹنے کے بعد یہ خیال میرے ذہن پر چھا گیا تھا۔ میری رگ رگ میں سما گیا تھا، یہاں تک کہ بید کی شڑاپ شڑاپ کے تصور ہی سے میری آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔

"تیری یہ ہمت" بابا جی نے اپنے جسم کو ہلاتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔ ان کا جسم گدر جانے کی وجہ سے پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ وہ گرجے "چل اٹھ" اور انھوں نے اپنی کھڑاؤں کی نوک سے مجھے ٹھوکر ماری۔

میں نے ان کے بولنے ہی پر سسکیاں لینا شروع کر دی تھیں۔

بابا جی کو میرا یہ پورا ناٹک دیکھ کر اور غصہ آیا اور انھوں نے میرے منھ پر تڑاتڑ طمانچے لگا دیے۔

"میں نے کیا کیا ہے جو مجھے اس طرح پیٹ رہے ہیں؟" میں نے زور زور سے روتے ہوئے کہا تاکہ ماں کی ہمدردی تو حاصل ہو جائے۔ لیکن اس وقت وہ واقعی ڈری ہوئی تھیں کہ دخل دینے سے بھی ڈرتی تھیں۔ دوسری بار مار پڑنے کے ڈر سے میں نے بستہ اٹھایا اور بغیر کھانا کھائے ہی بھاگ نکلا۔

اس وقت میرے دماغ میں جانچنے پرکھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہوئی تھی، اور مجھے یہ لگتا تھا کہ مجھے جو سزا ملی ہے اسے دستِ غیبی کی یہ تنبیہ جانو نہ بنا دیتی ہے۔ چنانچہ میں بڑی فرمانبرداری کے ساتھ نانی کو لینے گیا۔

لیکن میرے دل میں ایک بے بس ضدی بچے کا غصہ سلگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ آخر ابھی ایک ہی ہفتہ پہلے دیر سے پہنچنے پر مجھے اسکول میں مار پڑی تھی کہ نہیں؟ اور دیر سے پہنچنے میں بھی میرا کوئی قصور نہ تھا اس لیے کہ اماں جلدی کھانا بناتی ہی نہ تھیں۔ اور میں رونے لگا۔ "پھر بھی میرے اس ظالم باپ نے مجھے مارا۔ خدا! مجھے اب تو ان سے نفرت ہو گئی۔ ! مر جائیں یہ تو اچھا ہو!"

دماغ میں یہ اور ایسے ہی دوسرے خیالات لیے، جن کو ظاہر بھی کرتا تھا اور دبا بھی رہا تھا، میں گرمی اور پسینے کے باوجود دوڑتا چلا گیا۔ مگر بدقسمتی کو کیا کیجیے کہ راستے میں ٹھوکر لگی۔ پہلے تو میں نے پتھر کو گالی دی اور آگے بڑھ گیا، مگر جب میں نے انگوٹھے سے خون بہتے دیکھا تو چیخ پڑا۔ درد کے مارے نہیں، خون دیکھ کر۔

زمین پر بیٹھ کر اور اپنا پاؤں اٹھا کر میں چوٹ میں سے خون چوسنے لگا۔ دوسروں نے مجھ سے یہی کرنے کو بتایا تھا۔ خون کا ایک قطرہ بھی ضائع جانے سے طاقت کم ہو جاتی ہے نا! "ہائے اماں! ہائے میری میّا" میں رونے لگا۔ اِدھر خون کسی طرح رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اور نفرت کا ایک اور سیلاب اُمڈا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ان سے سینکڑوں بار کہا ہو گا کہ مجھے انگریزی بوٹ خرید دیں گر

چھڑایا، یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "انہیں پتہ ہے کہاں ہیں۔" مجھے ہندوستانی جوتے اچھے نہیں لگتے تھے اور بے ننگے پاؤں جانا پڑتا تھا اور نہ جانے کتنی بار چوٹ لگ چکی ہے۔

بہرحال میں اُٹھ کر چلا گیا اور بابوجی کے کہنے کے مطابق نانی کو گھر بھیج کر میں اسکول کی طرف چلا۔ چڑھتے ہوئے سورج کی دھوپ میں مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ پھر بھی اس ویران جگہ سے گزرتے ہوئے جہاں بس چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور ایک اکیلا کوا کاؤں کاؤں کر رہا تھا اور اسے ماسٹر کا کوئی خوف نہ تھا، میرے دل میں ایک ڈر بھی تھا اور جھجک بھی۔

جب میں اسکول کے کمپاؤنڈ میں پہنچا تو میرے دل کی دھڑکن نے ساری قوت سلب کر لی اور یہ بات یقینی ہو گئی کہ دوسرے پرائمری کلاس کے ماسٹر منشی [illegible] مجھے وہ سزا دیں گے جو اُن دنوں کے تحت ہندوستانی اسکولوں میں قصوروار طالب علموں کا حصہ تھی۔

جب میں نے عذر پیش کرنے کی کوشش کی "میرے بابوجی نے...."
تب تو ماسٹر صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔

"بابوجی کا بچہ! تیرا باپ ہوگا کمانڈر انچیف۔ لیکن اگر تو پچھڑا رہا تو - انسپکٹر صاحب میری تو ترقی روک دے گا": انھوں نے چیخ کر کہا اور بید کی چھڑی سے تین بید لگائے جو مہینوں سے لڑکوں کے بدن پر پڑتے پڑتے چکنی ہو گئی تھی۔

•

گھر اور اسکول دونوں جگہ پٹنے کی ذلت سے کئی دن تک مجھے اُداس

اور مجھے محسوس کرا دیا۔ میں کسی سے نظر نہ ملا سکتا تھا کہ کہیں کوئی میری آنکھوں سے پتہ نہ چلا لے کہ میں ذہین ہوا ہوں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس میری دنیا کی قدرتی فضا ہے۔ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں میں جا سکوں اور کوئی ایسا نہ تھا جسے میں اپنا دکھڑا سنا سکوں۔ اس لیے کہ میری ۔ ابھی دنیا کے بڑے بچوں کو ابھی کھلونوں کی طرح دیکھتے تھے جن سے وہ کبھی ایک آدھ بات کر لیتے یا کچھ چھیڑ چھاڑ کر لیتے۔ بڑی عمر کے لڑکے اپنے برابر والوں کے ساتھ کھیلتے کودتے اور مجھ جیسے ذرا چھوٹے بچوں کو اکیلا چھوڑ دیتے تھے اس لیے کہ ان کی بھاگ دوڑ اور دنیا داری میں مجھ جیسوں کو چوٹ چپیٹ آ جانے تو انھیں پریشانی ہو جانا ممکن پڑتا تھا۔ مجھے کہہ دیا گیا تھا کہ چھوٹی والی گڑیوں کے یہاں بہت نہ جایا کرو، اس لیے کہ ان سے تنگ تھا وہ نہیں چاہتیں کہ ہم لوگ گھر کی بات وہاں بھی کہیں اور جو کچھ نہیں وہاں جا کے اگل آئیں۔ مجھے ایسے لگنے لگا کہ اب میرا کبھی خوش نصیب نہ ہو گی۔ کم سے کم اس وقت تک تو نہیں ہو سکتی جب تک میں بڑا نہ ہو جاؤں۔

اکثر سے میں اکیلا ہی تبت کے سنسان جنگل میں چلا جاتا۔ لیکن پہاڑ اتنا اونچا تھا اور گھوڑے اور جنگ پر جو میرے لیے بہت اونچے تھے۔ میں نیچے سے ان کو نہیں سمجھ کر ایسی دوروں کی پر کیا کر تھک کر چپ ہو جاتا۔ پھر میں اپنا چھوٹا سا گول منزل نیچے لیے ہوئے اداس اور اس واپس آ جاتا۔ تیزی سے دوڑ بھی نہ پاتا تھا، اس پر خود مجھے بھی گھبراہٹ ہوتی تھی اور بڑے لڑکے بھی میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میرا چہرہ ایسا تھا جس پر میں نے ڈالی کے آئینے میں

دیکھا تھا۔ سفید سفید گول مٹول سی بچی رہتی تھی بالکل گنیش کے چپٹے منہ کی طرح، ڈبل روٹی جیسے ہاتھ اور بے ہنگم پاؤں۔ اس کے مقابلے میں رجمنٹ کے ٹھیکے دار کے لڑکے سوہن کا لال لال چہرہ تھا جو انگریزی سوٹ پہن کر تین پہیوں کی سائیکل پر اسکول جاتا تھا اور جسے کھانے کی چھٹی میں کچھ کھانے کے لیے روز دو پیسے جیب خرچ ملتا تھا۔

دل ہی دل میں یہ امید کرتا اور دعائیں مانگتا کہ قسمت کے کسی اتفاق سے ایک صبح میں اچانک جاگوں تو اپنے آپ کو سپاہی متو رام کا پاؤں اور رجمنٹ کے سارے بڑے لڑکے مجھ سے دوستی کرنا چاہیں۔ جیسے کہ کرنل صاحب کے لڑکے جان لاکھنؤ سے جو ایک دوستی کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا، جو روز صبح کو ایک آیا اور ایک اردلی کے ساتھ ٹہلنے نکلتا تھا اور جسے ہر شخص دور سے تعریف کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا اس لیے کہ اس کے ساتھ جو لوگ ہوتے تھے وہ سلامی دیتے تھے اور کرنل صاحب کے جنرل ہو جانے سے پہلے والے بچوں کا یہ چول بالکل انوکھا تھا۔ میرا جی بھی چاہتا تھا کہ میں اس کی طرح ٹیلر پہن سکوں، اسکول جانے کی مصیبت سے چھٹکارا پا جاؤں اور اسی کی طرح گھر پہ مجھے بھی کوئی ماسٹر آ کر پڑھا دیا کرے اور بڑا ہو کر میں بھی بڑا صاحب ہی بن جاؤں۔ لیکن یہ معجزہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اس کی بجائے مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی آسائش اور شان و شوکت گورنمنٹ کے انگریزوں والے حصے یا لال کرتی کے صاحب لوگوں کے لیے اور کالے لوگوں کی رجمنٹوں کے حصے میں تو بس ذلت و خواری ہی آئی ہے اور میں اپنی حالت پر خود ہی کڑھتے رہنے کی فضا میں سانس لیتا تھا۔ اب جب میں کچھ زیادہ انگلش

جسمانی پرورش و خروش سے محروم تھی۔ ہائے اس لڑکے کی قسمت جس کا باپ سرکار کی نوکری میں ایک معمولی کلرک ہو!

اور پھر باجی کے ذہنی اور پھر اس طرح ہمارے گھر کے سکون میں خلل ڈالنے کے لیے ایک اور بات ہوگئی، ایک اور بھی زیادہ پرشور اور وحشتناک واقعہ۔

ایک دن باجی یہ خبر لائے کہ دہلی کی سڑکوں پہ سے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی سواری جا رہی تھی کہ ایک مکان کی کھڑکی سے کسی نے ان کی فٹن پر بم پھینکا۔ لاٹ صاحب کے پاؤں پر چوٹ آئی ہے اور ایک اردلی جان سے مارا گیا۔ اور اگرچہ مجرموں کا پتہ نہیں چلا لیکن سرکار کو یقین ہے کہ یہ مفسدانہ حرکت ایک بہت بڑی سازش کے ممبروں نے کی ہے اور پولیس کا خیال ہے کہ یہی سازش وائسرائے کی کوٹھی کے پاس بم رکھنے کی بھی ذمہ دار تھی۔

باجی نے کہا کہ سرکار کا خیال ہے کہ زیادہ تر سازشی، سازشوں کے اس اکھاڑے آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میجر کار صاحب نے جو رجمنٹ کے "ایجنٹ" (ایڈجوٹنٹ) تھے، انھیں آج صبح بلایا تھا اور پوچھا تھا کہ کیا وہ آریہ سماج کے ممبر ہیں، اور ان کے اقبال کرنے پر کہ ہاں وہ ایک زمانے میں اس سوسائٹی کے ممبر تھے، میجر صاحب نے کہا تھا کہ انھیں اگر اپنی نوکری پیاری ہے تو اس فسادی سوسائٹی سے اپنا ناتہ توڑ لیں۔

اب تو اماں بھی پریشان ہوئیں اور جب وہ اداس ہوئیں تو ہم سب کے بھی منہ لٹک گئے، اس لیے کہ ہم لوگ ان کی باتیں تو سنتے تھے مگر ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ باجی نے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ "ایجنٹ" صاحب کا ان

مہربان تھے اور کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔ لیکن بہرحال فکر انھیں بھی تھی کہ دیکھیں اب صاحب لوگ کیا کرتے ہیں۔

اماں نے پوچھا۔ "ان لوگوں کو سماج سے کیوں اتنی نفرت ہے؟"

ابا جی اس دن ساری شام گھوم پھر کر سول لائن میں رہے اور گویا ہم سب کو اپنی پریشانی میں شریک کرکے اپنا دل ہلکا کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ سرکار اس واقعہ کو ایک بڑے آندولن کا ایک حصہ سمجھتی ہے جو کہ کانگرس نے چلایا ہے اور کانگرس تو سماج سے بھی بڑی تنظیم ہے کہ صاحب لوگ خاص طور سے انھی حرکات کو ذمہ دار سمجھتے ہیں اور ہردیال نامی ایک شخص کو، جو دہلی کا رہنے والا ہے اور لاہور میں پڑھتا تھا اور جو چند سال ہوئے سرکاری وظیفے پر ولایت گیا تھا لیکن اس نے یہ وظیفہ چھوڑ دیا اور سرکار سے کہہ دیا کہ جب اس کے ملک کے زیادہ تر لوگ اتنی اچھی تعلیم نہیں حاصل کر سکتے تو اسے بھی تعلیم نہیں چاہیے۔ اب وہ وطن واپس آگیا ہے اور اس نے لاہور میں لیکچر دینا شروع کیا ہے کہ ایک عام ہڑتال کرکے انگریزی راج کو ختم کر دینا چاہیے۔ بہت سے لوگ اس کے ساتھی ہو گئے ہیں۔ ان میں ایک پنجابی ہے دیناناتھ نامی اور ایک بنگالی ہے جسے چٹرجی کہتے ہیں۔ آجکل وہ خود تو امریکہ چلا گیا ہے۔ لیکن یہ دونوں اور ایک اسکول ماسٹر امیر چند اور دہرہ دون کے محکمہ جنگلات کا ایک کلرک راش بہاری، اور کچھ اسٹوڈنٹ سرکار کے خلاف اشتہار بانٹتے پھرتے ہیں کہ گیتا، وید، اور قرآن سب میں لکھا ہے کہ دیس کے دشمنوں کو قتل کرو۔ پولیس کو پوری شہادت تو نہیں حاصل ہوئی۔ لیکن پولیس والوں کا کہنا ہے کہ بم انھیں لوگوں نے پھینکا ہے۔

اماں نے بابی کا دل بڑھانے کے لیے کہا۔ "لیکن تم نے تو سماج کے جلسوں میں جانا چھوڑ دیا ہے؟" یہ بات صاف طور سے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ان کے نام دیوتا، جو قانون کی خلاف ورزی سے کوسوں دور تھے، جنھیں ان کی پوزیشن کی وجہ سے مخبروں کی پرواہ نہیں، اتنی عزت حاصل تھی، بھلا کیسے اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں اور پھر اب تو انھوں نے آریہ سماج میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ابا نے انھیں بتایا۔ "سرکار سب پڑھے لکھے لوگوں پر شک کرتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ جتنے باغی ہیں وہ سب پڑھے لکھے ہی ہوتے ہیں — میرے ساتھ کے، وہ سب پر شبہ کیا جاتا ہے اور خاص طور سے اگر وہ آریہ سماج کے ممبر ہوں تب تو اور بھی۔"

آخر اماں نے چڑ کر کہا۔ "تو پھر یہ سرکار تو کتیا ہے کتیا۔ ایسا ظلم تو نہ ہونا چاہیے۔ اور تم اتنا ڈرنے کا ہے کو ہو۔ میرے باپ، سکھو سوہا کی طرح مرد بنو، جن کی زمین ضبط ہو گئی۔ مگر اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔"

لیکن ابا جو پہلے واقعے کے بعد بہت سہم گئے تھے، اپنے ڈر کو نہ دور کر سکے اور سارے وقت انھیں کورٹ مارشل کا ڈر کھائے جاتا، خاص طور سے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ جی حضوری کرنے والے چپڑ قناتی، جنھوں نے اتنا کیا ہے کہ انجینئر صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ وہ آریہ سماج کے ممبر ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ لگا بجھا سکتے ہیں۔ انھوں نے سماج سے اور شہر کے دوستوں سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور شام کو گھر پر رہنے لگے، خاموش بیٹھے اور ایسے بھرے ہوئے لگتے کہ ذرا سا کچھ ہوا تو بس پھٹ پڑیں گے۔

یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ہم بچوں کے لیے یہ ایک بھیانک گڑ ڈور کی کہانی تھی جس میں جانے آبا کے غضبناک اور فکرمند چہرے کے نقوش نے جان ڈال کر اسے واقعی بنا دیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ہم نے اخبار میں، جس سے ہم کھیلا کرتے تھے، اس واقعے کی تصویر بھی دیکھی تھی اور دوسرے یہ کہ جائے قتل کی بیٹھک میں منشی گلاب سنگھ اینڈ کمپنی، پبلشرز کا ایک کلنڈر بھی لگا ہوا تھا جس پہ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے کی تصویر چھپی تھی اور ہم ان کی صورت پہچانتے تھے۔

اس پہ ستم یہ ہوا کہ ایک دن خبر ملی کہ پٹھانوں کے ایک جتھے نے راولپنڈی کے اسٹیشن ماسٹر کو اغوا کر لیا ہے اور اسے چھوڑنے کے لیے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ابا پٹھانوں کے خط اور عرضیاں وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے اور قبائلیوں کے بزرگوں اور جلسوں میں بھی انھیں مدعو کیا جا چکا تھا۔ اس لیے وہ بڑے پریشان تھے کہ صاحب لوگ کہیں گے کہ راولپنڈی کے اسٹیشن ماسٹر کے اغوا کا حال ضرور معلوم رہا ہوگا۔

اماں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ چونکہ راولپنڈی کا اسٹیشن ماسٹر ہماری جات کا ہندو تھا اس لیے بھلا ابا پہ کیسے یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پٹھانوں سے مل کر اپنے بھائی بند کو اغوا کروا دیا ہوگا۔ لیکن اس طرح کی منطق سے ابا کو ذرا بھی تسکین نہ ہوئی، انھیں تو اپنے خلاف سازشوں کا خوف کھائے جا رہا تھا اور انھیں پورا یقین تھا کہ صاحب لوگوں کو اپنے کسی بھی نیٹو ملازم

اماں نے بابو جی کا دل بڑھانے کے لیے کہا۔ "لیکن تم نے تو سماج کے جلسوں میں جانا چھوڑ دیا ہے۔" یہ بات صاف طور سے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ان کے تناؤ، وہ جو قانون کی خلاف ورزی سے کوسوں دور رہتے تھے، جنھیں ان کی پوزیشن کی وجہ سے منصفوں کی برادری میں اتنی عزت حاصل تھی، بھلا کیسے اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں، اور پھر اب تو انھوں نے آریہ سماج میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

بابا نے انھیں بتایا۔ "سرکار سب پڑھے لکھے لوگوں پر شک کرتی ہے، اس لیے کہ جتنے باغی ہیں وہ سب پڑھے لکھے ہی سمجھے گئے ہیں — یہی وجہ ہے کہ ان سب پر شبہ کیا جاتا ہے اور خاص طور سے اگر وہ آریہ سماج کے ممبر ہوں تب تو اور بھی۔"

آخر اماں نے چڑ کر کہا۔ "تو پھر یہ سرکار تو کتیا ہے کتیا۔ اسے غرق ہو جانا چاہیے۔ اور تم اتنا ڈرتے کاہے کو ہو۔ میرے باپ، سکھ سردار کی طرح مرد بنو، جن کی زمین ضبط ہو گئی۔ مگر اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔"

لیکن بابا جو پہلے واقعے کے بعد بہت سہم گئے تھے، اپنے ڈر کو نہ دور کر سکے اور ہر وقت انھیں کورٹ مارشل کا ڈر کھائے جاتا، خاص طور سے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ جی حضوری کرنے والے چپڑ قناتی، جنھوں نے اتنا کیا ہے کہ جنرل صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ وہ آریہ سماج کے ممبر ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ لگا بجھا سکتے ہیں۔ انھوں نے سماج سے اور شہر کے دوستوں سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور شام کو گھر پر رہنے لگے، خاموش بیٹھے اور ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ ذرا سا کچھ ہوا تو بس چونک پڑیں گے۔

یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ہم بچوں کے لیے یہ ایک بھیانک گر وڈورہ کی کہانی تھی جس میں ہمارے ابا کے غضبناک اور فکرمند چہرے کے نقوش نے جان ڈال کر اسے واقعی بنا دیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ہم نے اخبار میں، جس سے ہم کھیلا کرتے تھے، اس واقعے کی تصویریں دیکھی تھیں اور دوسرے یہ کہ ہمارے گھر کی بیٹھک میں منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، بک سیلرز کا ایک کلنڈر بھی لگا ہوا تھا جس پر لارڈ ہارڈنگ وائسرائے کی تصویر چھپی تھی اور ہم ان کی صورت پہچانتے تھے۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ ایک دن خبر ملی کہ پٹھانوں کے ایک جتھے نے راولپنڈی کے اسٹیشن ماسٹر کو اغوا کر لیا ہے اور اسے چھوڑنے کے لیے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ابا پٹھانوں کے خط اور عرضیاں وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے اور قبائیلیوں کے جرگوں اور جلسوں میں بھی انھیں مدعو کیا جا چکا تھا۔ اس لیے وہ بڑے پریشان تھے کہ صاحب لوگ کہیں گے کہ راولپنڈی کے اسٹیشن ماسٹر کے اغوا کا حال ضرور معلوم رہا ہوگا۔

اماں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ چونکہ راولپنڈی کا اسٹیشن ماسٹر ہمارا ہی ذات کا ہندو تھا اس لیے بھلا ابا پر کیسے یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پٹھانوں سے مل کر اپنے بھائی بند کو اغوا کروا دیا ہوگا۔ لیکن اس طرح کی منطق سے ابا کو ذرا بھی تسکین نہ ہوئی۔ انھیں تو اپنے خلاف سازشوں کا خوف کھائے جا رہا تھا اور انھیں پورا یقین تھا کہ صاحب لوگوں کو اپنے کسی بھی خیر خواہ ملازم

پر تو باپ کا بھی بھروسا نہیں ہے۔ اس معاملے میں اتنا ہی غنیمت تھا کہ جس آدمی کو اغوا کیا گیا تھا وہ ہندوستانی تھا ورنہ عام طور سے تو انگریز ہوتا تھا یا میم۔ اس لیے کہ اگر لاڈ ڈرائنگ پر بم پھینکے جانے کے فوراً بعد کسی صاحب یا میم کا اغوا ہو گیا ہوتا تو سرکار نے اسے بھی ملک میں اپنے خلاف سازش کی ایک کڑی سمجھا ہوتا اور پورے ملک میں کالے لوگوں پر سختی اور ظلم شروع ہو جاتا]۔

لیکن اس کے باوجود برٹش راج نے اپنے آپ کو اس بات پر کافی خطرے میں محسوس کیا کہ پٹھانوں نے دیدہ دلیری کی انتہا کر دی اور وہ صرف اگر سرحد پر سے نہیں بلکہ اندرون ملک کے ایک شہر راولپنڈی میں سے ایک اسٹیشن ماسٹر کو اٹھا لے گئے اور ذرا نہ سوچا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اوپر سے ڈھٹائی یہ کہ اب ایک لاکھ روپیہ تاوان مانگ رہے ہیں۔

سرحد کی ساری بریگیڈوں کے جرنیل، آفیسر کمانڈنگ نے یہ حکم دیا کہ سب بریگیڈ کمانڈنگ، ڈیوٹی پر حاضر رہیں۔

اماں نے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ "کمانڈنگ، ڈیوٹی سپاہیوں کو حاضر کرانے سے کیا فائدہ ہو گا۔ پٹھان اس اسٹیشن ماسٹر کو لیکر تو کہیں پہاڑوں میں چلے گئے ہوں گے شاید؟"

ابا نے ان کو بتایا۔ "سرکار اپنی طاقت دکھانا چاہتی ہے تاکہ لوگوں پر رعب پڑے۔"

اماں بولیں۔ "تو اپنی کھوکھلی طاقت کا ڈنکا بجاتے پھریں۔ کسی پر رعب نہیں پڑنے کا۔"

"دیکھنا:" اپا نے کہا۔

اماں نے اپنے شک کا اظہار کیا۔ "اتنے میں تو جو دیکھنا ہے وہ دیکھ لو گی ان میں یہ دیکھو گی کہ سپاہیوں بیچاروں کی وردی پر دھول کی تہ در تہ جمع ہوتی جا رہی ہے۔"

ان کی بات ٹھیک تھی، اس لیے کہ پوری گرانڈ ٹرنک روڈ پہ مسلسل مارچ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا، ان بچوں کی تفریح کا سامان ضرور ہو گیا۔ فوج کی طاقت پر واقعی خاک پڑ گئی اور مختلف رجمنٹوں کے جھنڈے بھی سپاہیوں کی خستہ حالی کو نہ چھپا سکے، جن کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور جو تھکن سے نڈھال ہو چکے تھے..... اور پھر بھی اغوا شدہ اسٹیشن ماسٹر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پشاور اور نوشہرہ کی دیواروں پر روز ایک نئی مانگ چپکا دی جاتی۔ اب پٹھانوں نے مطالبے کی رقم کو بڑھا کر دو لاکھ کر دیا تھا۔

ہم کو یہ احساس ہوا کہ زمین کا مالک ہونے کا غرور عجیب چیز ہے جو مالک کو بالکل اندھا بنا دیتا ہے۔ سرکار عوام سے اتنی الگ تھلگ رہتی تھی کہ اسے بہت دنوں میں اس کا احساس ہوا کہ گرانڈ ٹرنک روڈ پہ رعب ڈالنے سے پٹھان اس آدمی کو ہرگز واپس نہ کریں گے جسے وہ اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ جب مطالبے کی رقم بڑھا کر پانچ لاکھ کر دی گئی تب سرکار نے یہ سوچا کہ واقعی تلاش شروع کرنی چاہیے۔

تب فوج کے دستوں نے سرحدی پہاڑیوں اور سیاہ غاروں کو چھاننا شروع کیا اور وزیرستان کے اندر تک بھیجی گئیں۔

میرے ابا کی رجمنٹ کی کئی کمپنیاں، صوبیدار میجر کرم سنگھ کی کمان میں گئیں
انھوں نے جانے کتنے پرسے، ندی کے اس پار نیچے پہاڑیوں پر پڑاؤ کیا اور
وہاں سے وہ گشتی ٹولیاں بھیجی جاتی تھیں کہ جا کر پہاڑوں کے کونے کھدرے دیکھ
بھالیں اور گاؤں کی تلاشیاں لیں۔

ابا کبھی کبھی جب صوبیدار میجر سے ملنے جاتے تو ہم لڑکوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔
میں نے ایک خطرناک تلاش میں حصہ لینے کے باوجود بھی، صرف سورج کی شعاعوں کی
جو قوس قزح دنیا بناتی ہے اس کے علاوہ اس زمانے میں میں نے ان پہاڑیوں سے بہتے
ہوئے رنگوں کو دیکھا اور ان پر فریفتہ ہو گیا۔

صبح کی دھند کے سنہرے رنگ سے آج میں نے ان پہاڑیوں کو
تاحد نظر دیکھا ہوا دیکھا تھا اور ابا کے پیچھے سے یہاں سے سورج کا سنہرا پھول
کی طرح ابھرتا تھا اور پھر سرخ، لال اور گہرے رنگوں کی آمیزش سے جن پر شفاف
آسمان اور دوپہریں کو اپنا غصہ دکھاتا تھا۔ یہ پہاڑیاں شام کو، جب ہم ان پر سے
ہو کر گزرتے تھے تو، داماں کی کلیوں کی نرم و نازک نوکوں کی طرح ابھری تھیں اور
جب سورج انھیں اشارہ کرتا کہ اب رات کی بانہوں میں لپٹ کر سو جائیں تو
یہ پہاڑیاں اس سبب اور غضبناک ہو کر سورج کو گھورتی تھیں۔

صوبیدار میجر کرم سنگھ ہم بچوں کو میوے، گرم دودھ اور کیک کھلاتے،
بھنے ہوئے چنے کھلاتے اور بڑے شوق سے اپنے صندوقوں میں ڈبل روٹی کے بند ڈبے
گھونٹ گھونٹ ٹینڈے اور ... میں سے نکال نکال کر ہمیں کھلاتے، بالکل چاکلیٹ سا
مزہ آتا تھا۔

اور جو کچھ پڑاؤ کے ان تین ہفتے تک رہا اس عرصے میں ٹیڑھے میڑھے اور خطرناک پہاڑی راستوں کو اچھی طرح جان گیا اور ان عجیب و غریب سناٹوں کھیتوں کو سمجھنے کا فن سیکھ گیا جو جنگل بیابانوں میں جہاں تہاں تھا اس کے بیچ میں اگا کرتی تھیں اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کنٹونمنٹ کے جانے پہچانے راستوں کے علاوہ اور کتنی دنیائیں ہیں! اور پہاڑیوں پر چڑھنے اور وادیوں کو پار کرنے کے لیے کیسے مضبوط ہاتھ پاؤں ہونے چاہییں! اور چھاؤنی گھر کے باہر کی دنیا میں کتنا شور اور ہنگامہ تھا۔ فضا سپاہیوں کی پکار اور بگل پر بجائی ہوئی دھن میں چاند ماری کی مشق سے، انگریزوں کی آوازوں سے گونجتی رہتی۔

ان تپتی ہوئی پہاڑیوں اور ان کے اندر چھپے ہوئے خزانوں نے جو میرے حواس اور ذہن کی گرفت میں آ رہے تھے، مجھ پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ میں اکثر اندرونی گھاٹیوں کی طرف چل پڑتا، زیادہ دور تک جاتے ڈرتا بھی تھا اور ذہین پہاڑ پہ قدم جمانے کی کوشش کیا کرتا اور میری روح ہوا میں بجتے ہوئے بگولوں کے رقص بھرتی۔

یہ سیر تماشا ایک دن اس اطلاع پر ختم ہو گیا کہ راولپنڈی کے اسٹیشن افسر کو پٹھانوں نے ایک رات پکڑ کے صوبہ سرحد کے گورنر کے حوالے کر دیا ہے۔ اس بات سے میرے بچپن کے دماغ نے پٹھانوں کی ہمت کی خوب خوب داد دی، اور خاص طور سے جب یہ معلوم ہوا کہ اسٹیشن افسر کو وزیرستان کے بیابانوں میں لیجانے کے بجائے پٹھانوں نے اسے اٹک میں سندھ ندی کے اوپر بنے ہوئے ریل کے پل کے

نیچے بھینوں تک رکھا اور سینکڑوں سپاہی گرانڈ ٹرنک روڈ پر دوڑا دیے گئے تھے۔ اور مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے مطالبے کی رقم کا تصفیہ کرنے کے لیے اپنے سردار کو گنگو نہ کے پاس بھیج دیا تھا اور اس کی حفاظت کا کوئی انتظام بھی نہ کیا تھا تب تو میرے دل میں ان کی قدر اور بھی بڑھ گئی۔

صاحب لوگوں کا خوف بہتوں کے دل سے ہمیشہ کے لیے دور ہونے لگا اور مجھ جیسے چھوٹے چھوٹے بچے بھی سپاہیوں کا مذاق اڑاتے تھے کہ مٹھی بھر پٹھانوں کے ہاتھوں انھیں منھ کی کھانی پڑی اور پٹھانوں پر انگریزی سرکار کی ایک نہ چلی۔

لیکن ہماری دنیا میں مصیبتیں کبھی تنہا نہیں آتیں۔

ہوا یہ کہ ڈاکہ ڈالنے والوں پر بم پھینکے جانے کی خبر کے تھوڑے سے ہی دنوں بعد ہمارے گھر چاندی کا ایک چمچہ کھو گیا۔ یہ وہ چمچہ تھا جس سے بچپن میں ہم سب کو کھلایا گیا تھا۔ یوں کہیے کہ چاندی کا وہ چمچہ جسے اپنے منھ میں لیے ہوئے ہم پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ ہماری ماں کے نزدیک اس کی اہمیت صرف جذباتی نہیں تھی بلکہ اس کی حیثیت ایک جاندار کی سی تھی، جو خاندانی انگوٹھی کی ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب کوئی چیز کھو جائے تو پہلے اپنے گھر میں ڈھونڈو۔ چنانچہ پہلے اماں نے پورا گھر چھان مارا۔ انھوں نے رسوئی سے پیتل، کانسے، تانبے اور چاندی کے سارے برتن نکالے اور چولھے سے راکھ لے کے سب کو اپنے ہاتھ سے مانجھ کر شاید کہیں وہ چمچہ مل جائے۔ پھر انھوں نے گھر کا سارا فرنیچر، پلنگ، صندوقے، چوکیاں، دریاں، چٹائیاں نکال کر صحن میں جمع کیا جیسے گھر کی تہواری صفائی

ہو رہی ہو۔ لیکن چاندی کا چمچہ ان میں سے کسی میں سے نہ نکلا۔ پھر صحن کے کونے میں اینٹ مٹی کا جو ڈھیر لگا تھا وہ بھی چھان مارا گیا۔ گھر کے کونے کونے میں کھودے گئے جہاں اماں ڈاکوؤں کے ڈر سے اپنے روپے پیسے گاڑ کے رکھتی تھیں۔ لیکن ان سب سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ چاندی کا چمچہ نہ ملا۔ ہمارے چھوٹے سے گھر میں چمچے کی تلاش بالکل ٹھیک معنوں میں ویسی ہی تھی جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈی جائے۔

جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، اپنا گھر ڈھونڈنے کے بعد یہ سوچا جاتا ہے کہ کس نے چرایا ہے۔

ہماری اماں لوگوں کو پرکھنے میں بڑی تیز تھیں لیکن ان کے لیے یہ بڑا مشکل تھا کہ ہمارے یہاں جو لوگ آتے تھے ان کا منہ دیکھ کر وہ کسی پر بھی شک کر سکیں۔ بغیر پوچھے بچوں کو تو اس خوف کے بغیر کہ وہ بُرا مانیں گے، طرح طرح کے سوالوں سے جی بھر کے مار بھی کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میرے سامنے، دوستوں کو جواب دینا پڑا کہ انھوں نے چاندی کا ایک چمچہ تو نہیں دیکھا، وہ چمچہ جس سے بچپن میں ہم لوگوں کو کھلایا جاتا تھا۔ لیکن ویشا، ان کتابوں میں بھی یہ بات گئے کہ کوئی سوال ہی نہ تھا کہ ہمارے یہاں جو بڑے آتے تھے ان میں سے کوئی چاندی کا چمچہ لے گیا ہے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو جنت کے چھوٹے پنڈت، پنڈت بال کرشن سے رجوع کیا گیا۔

کہا یہ جاتا تھا کہ پنڈت بال کرشن لوگوں کے دلوں کا بھید جان لیتے تھے۔ ان سے کوئی بات چھپی نہ تھی، وہ نہ صرف اس جنم بلکہ اگلے پچھلے جنموں کی جنم کنڈلی جان سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ چور کا نام نکال لیتے تھے۔۔۔ اور یہ سب وہ اپنے

نذرانوں کے علاوہ وہ کرتے تھے جن میں صبح شام کی پوجا کرانا، جنم مرن اور وواہ کی رسمیں کرانا، بہرصورت میں خاص طور سے ان بھوج میں، جو پکوان کی برس پر دیا جاتا تھا، خصوصی مہمان بنتا وغیرہ۔ ایسے بھوج میں، وہ مردوں کی طرف سے کھانا کھاتے تھے۔ بہرحال میری ماں نے مجھے پنڈت بال کرشن کے پاس بھیجا۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "ماں کہتی ہیں کہ ہمارے گھر سے چاندی کا ایک چمچہ کھو گیا ہے۔" پنڈت بال کرشن تازہ نہائے دھوئے فرش پر پلتی مارے میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے لکڑی کی ایک بڑی چوکی پر گرنتھ رکھا تھا جس میں جانے دھرم کے کتنے ہی دیوتا؛ کچھ کھڑے تھے اور کچھ بیٹھے تھے۔ ان میں برہنہ تن بھی تھے اور کپڑے پہنے ہوئے بھی۔ اور پنی اور شیشے کے ٹکڑوں کے آئینوں سے ان کی آرائش کی گئی تھی۔

"شش، شش،" پاس بیٹھے ہوئے ایک برہمن نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

لیکن پنڈت بال کرشن خود، جو لمبے، سفید داڑھی اور لال گالوں والے آدمی تھے، مجھے دیکھ کر مسکرائے، اور کچھ دیر بعد دیوتاؤں کا نام لے کر انھوں نے مجھے آشیرواد دی، مجھ سے بیٹھنے کو کہا، اور خود پوجا گھر کے پیچھے اندر چلے گئے۔

چوکی کے پاس دیوتاؤں کے چرنوں میں بہت سے سکے رکھے تھے اور میرا جی چاہا کہ ایک کو اٹھا کر میں بھی پنڈت بال کرشن کی طرح بجاؤں اور پھر دیوں کو پوجا کے لیے جلاؤں۔

لیکن اتنے میں پنڈت جی واپس آ گئے۔

میرے پاس بیٹھ کر انھوں نے جھٹ کی جادو والی انگوٹھی اپنے دہنے ہاتھ کی چھنگلی میں لی اور مجھ سے کہا کہ دہنی آنکھ بند کر کے بائیں کو ذرا سا کھول کر انگوٹھی کے شیشے میں دیکھوں۔

"بتاؤ کیا دیکھ رہے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے ان کے کہنے کے مطابق کیا۔ پہلے تو کچھ دکھائی نہ دیا، پھر دھندلے سے شیشے میں سے ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے ایک آدمی کی تصویر ابھری۔ میں نے بتایا: "بھنگی"

"کہیں جادوگر کو کچھ دکھائی دے رہا ہے؟" پنڈت جی نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

پنڈت جی نے دیوتاؤں کے نام لیتے ہوئے انگوٹھی کو چوما اور اپنے بے دانت کے منہ میں، جس کا بڑا حصہ سفید ڈاڑھی میں چھپا ہوا تھا، کچھ منتر پڑھے۔ پھر بولے: "پھر دیکھو اور بتاؤ کہ کیا دکھائی دے رہا ہے؟"

میں نے پھر دیکھا۔ اس بات پر میں بڑا خوش تھا کہ مجھے ایک انگوٹھی کے چھوٹے سے نگینے میں سے تصویریں دکھائی جا رہی ہیں جیسے وہ کوئی جادو کی لالٹین ہو۔ ذرا دیر بعد ایک باغ دکھائی دیا، گملے اس طرح سے سجے تھے جیسے بڑے شہر جالندھر والی سڑک پر صاحب لوگوں کے بنگلوں میں رکھے رہتے ہیں، اور پھر ایک مسلمان بہشتی دکھائی دیا، کمر پر مشک لادے ہوئے۔

میں نے بتایا: "باغ میں ایک بہشتی"

پنڈت ہری کرشن نے پوچھا: "کچھ کہیں دکھائی دے رہا ہے؟"

میں نے تصویر میں غور سے دیکھا۔ گملوں کے پیچھے اندھیرے کونے پر شاید
وہاں مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

"نہیں" میں نے کہا۔

پنڈت جی نے جادو کی انگوٹھی کو پھر گھمایا اور اپنے پوپلے منہ سے منتر پڑھاتے ہوئے مسکرائے اور پھر انھوں نے سر کے اشارے سے مجھے دیکھنے کو کہا۔ اب ان کا انداز ایسا ہو گیا تھا جیسے بچوں کے کھیل سے اکتا کر بڑوں کا ہو جاتا ہے۔

میں بڑے شوق سے ان عجیب و غریب تصویروں کو دیکھتا رہا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ انگوٹھی کے ذرا سے چھوٹے سے شیشے میں باغ کی اتنی بڑی تصویر کیسے دکھائی دیتی ہے اور میں نے اپنی بائیں آنکھ سے غور کر کے دیکھا۔ اس بار ایک بڑے سے گھر کی دیوار پر ایک کوا بیٹھا دکھائی دیا۔

میں نے بتایا۔ "دیوار پر ایک کوا"۔

پنڈت بال کرشن نے پوچھا۔ "کچھ کہیں دکھائی دے رہا ہے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

پنڈت جی نے انگوٹھی کو اپنی انگلی پر گھمایا اور اسے سرخ کی ڈبیا میں رکھ دیا اور سارے وقت کچھ پڑھتے رہے۔ پھر انھوں نے ایک اور ڈبیا اٹھائی، چٹکی بھر ناس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

سچ میں مجھے ڈر لگ رہا تھا اور ایک عجیب پن کا احساس ہو رہا تھا اس لیے کہ دوسرے بچے سب جا چکے تھے اور اس لیے کہ پنڈت جی کی آنکھیں بند تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوتاؤں کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

لیکن ایک منٹ میں پنڈت جی نے آنکھیں کھول دیں اور بولے: "اپنی ماں سے کہنا کہ اگر وہ یہ وچن دیں کہ کچھ منت میں چڑھا دیں گی تو اگلی پورنماشی کی رات کو زیور دھن پر مل جائے گا:"

میں نے بھاگ کر اماں کو یہ سندیسہ پہنچایا اور ان کو تفصیل سے بتایا کہ میں نے جادو کی انگوٹھی میں کس کس طرح کی تصویریں دیکھی تھیں۔ پہلے ایک جنگل، پھر ایک کشتی کی اور پھر دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے کی۔

اماں نے کچھ خود ہی اندازہ لگایا اور جنگل کی تلاشی لی جو روز صبح کو جانے یہاں آتا تھا۔ بالک کے باپ پر شبہ لاکھا نے عمر بھر اس گھر کی چاکری کی تھی بغیر چوں چرا کے اس نے تلاشی بھی دے دی۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر اماں چاہیں تو اس کے گھر کی بھی تلاشی لے لیں۔

اپنی تفتیش کے اصول پر عمل کرتے ہوئے۔ لیکن بظاہر میں نے جو تصویریں دیکھی تھیں انھیں کی بنیاد پر انھوں نے کہار کی تلاشی لی جو ہمارے یہاں پانی بھرنے اور برتن مانجھنے آیا کرتا تھا۔ لیکن کچھ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اماں سخت شبے میں تھیں اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ بہرحال انھوں نے کوّوں کو یعنی، روٹی دینی شروع کی اور ان سے بڑی لجاجت سے کہنے لگیں کہ پورنماشی کی رات کو چھلا لا کر ہمارے گھر کے آنگن میں ڈال جائیں۔ کوّوں نے اس الزام لگانے کے جواب میں کاؤں کاؤں کر کے گالیاں دیں۔ حالانکہ یعنی روٹی انھوں نے بڑے مزے سے ہڑپ کر لی۔

ابا نے اماں کو یہ سب کرتے دیکھ کر کہا۔ "تمھاری اماں پاگل ہو گئی ہیں۔"

لیکن وہاں کر پنڈت ہال کرشن کے گیان پہ پورا وشواش تھا۔ بس یہ ذرا گڑبڑ سی تھی کہ اب اگر بچھو مل بھی جائے تو اسے مندر میں چڑھا دینا پڑے گا اور وہ یہ طے نہیں کر پا رہی تھیں کہ پنڈت جی کو کہلوا دیں کہ اگر دیوتا بچھو سے خوش ہیں تو وہاں کو سونگھا کر لیں گے تو ان کے لیے سر چڑھا گیا ہوگا۔ اور ان کے دماغ میں طرح طرح کے شبہے، قیاس اور خیال آرائیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ آخر کار وہ اس ذہنی کوفت کو نہ برداشت کر سکیں تو بچھو بھی کہیں ہے لیکن ان کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔ اگر وہ وشنو کے پاس سے اور انھیں اس صورت میں مل سکتا ہے جب وہ یہ وعدہ کریں کہ دیوتاؤں کو چڑھایا جائے گا تو یوں ہی سہی۔ اور انھوں نے مجھے پنڈت جی کے پاس یہ سندیسہ کر بھیجا کہ اگر بچھو مل گیا تو وہ بڑی خوشی سے لے دیوتاؤں کو چڑھا دیں گی۔

اس دن کے بعد جو پورنماشی آئی اس کی رات کو وہ بچھو جانے گھر کے ہال کی ڈھال کے اندر پڑا پایا گیا۔ اور پھر باقاعدہ طور پر مندر میں چڑھا دیا گیا۔

ہمارے گھر میں چند مہینوں سے جو کھیل تھی وہ ذرا کم ہوئی۔ آپا کا شتا ذرا کچھ کم ہوا اور ہمارے آنگن میں بھیڑ نہ لگی۔ وہاں وہ وہاں چھوٹی۔

تقریباً ہر ہفتے ہی ہمارے رجمنٹ کی ہاکی ٹیم پر چھیپا کی کسی دوسری رجمنٹ کی ہاکی ٹیم سے میچ کھیلتی۔ یہ میچ عام طور پر آفیسرز میس کے پاس دریائے کابل کے کنارے پر اس جگہ جہاں وہ گالف لنک کے برابر بنتی ہے۔ ایک چبوترہ میدان میں ہوا کرتے تھے۔ میرے ابا ان میچوں میں ریفری ہوتے تھے، اور اگر وہ ۱ بجے سہ پہر میں ہوتے تو ہم لوگ بھی ان کے ساتھ جاتے تھے۔ یا اگر وہ گھر میں نہ ہوتا جب ابا پہنچتے تو پھر

ان کے جانے کے بعد ہم بھی چپکے سے پیچھے پیچھے پہنچ جاتے تھے۔ جن دنوں چاچا جی گھر میں اس چینی میل ملاپ کا دور دورہ رہتا، ان دنوں ہم لوگوں کو سیر گشتی کرنے کے لیے کافی ڈھیل مل رہتی تھی۔ کچھ ہی دن پہلے ہم نے اپنے امتحان پاس کیے تھے، میں نے دوسرا پرائمری اور گنیش نے تیسرا پرائمری، اور گرمیاں آنے ہی والی تھیں جب سکول بند ہو چکے، رہنے کی ممانعت ہوتی تھی اور حالانکہ ہمیں گھر سے بہت دور جانے کو منع کیا جاتا تھا، پھر بھی ہم جنسی خوشی کے دنوں میں اس چھوٹ سے فائدہ اٹھا کر بھٹ کے ان اونچے ٹیلوں کو بھی دیکھنے جا پہنچتے تھے۔

آفیسرز میس اور صاحب لوگوں کے جھاڑیوں کی ٹہنیوں والے بنگلوں کی اس دنیا کی سیر جانے سے بہت ہی خوشی کا باعث ہوتی تھی۔ اس لیے کہ ایک تو بابا کو صحن میں چینی دواخانے ادھر ادھر دوڑتے دیکھ کر ہم خود بھی شان محسوس کرتے اور دوسرے ہم لوگ پلٹنیے کے برگزیدہ لوگوں، صاحبوں کی قدرت پہ اتراتے۔ صاحب لوگ موٹر سائیکلوں اور تانگوں پہ آتے، غیر ملکی لباس پہنے ہوتے اور ساتھ میں ان کی بیویاں ہوتیں جو خوبصورت کپڑوں میں ملبوس اور بڑی بڑی ٹوپیاں پہنے ہوتی تھیں۔

کرنل واکنسن صاحب، رجمنٹ کے بڑے افسر کا ڈھنگ جب بھی آجاتے تو ہم لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے اور اپنی ٹوٹی پھوٹی پنجابی میں ہم لوگوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتے۔ نو دوں کا کھیل دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں اپنے بچوں کی خبریں سناتے جنہیں تعلیم کے لیے پہاڑوں پر بھیج دیا گیا تھا۔ اور شاذ و نادر سخاوت سے وہ ہم لوگوں کی مٹھی میں ایک ایک روپیہ ڈال دیتے۔

میجر ولار، رجمنٹ کے بوڑھے ایڈجوٹنٹ، جن کے پاس ایک چڑیا سی تھی جس سے مجھے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی داہنی آنکھ پر بغیر کسی سہارے کے چپکا ہوا ایک شیشہ، جو ہر وقت منہ میں ایک موٹا سا چرٹ دبائے رہتے تھے، کبھی کبھی مجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیتے اور جب وہ اپنا سگار میرے منہ میں ٹھونس کر کش لینے کو کہتے اور میرے گلے میں پھندا پڑ جاتا اور اس زور کی کھانسی آتی کہ سارا بدن ہل جاتا تو دیکھنے والے محظوظ ہوتے۔

کبھی کبھی کوئی اور صاحب ہم لوگوں سے بات کر لیتا، یا کوئی میم بڑی مہربانی کے ساتھ مسکرا دیتی۔

ہندوستانی افسر، این سی او اور سپاہی جو ایک لائن میں بیٹھے یہ کھیل دیکھتے ہوتے، صاحب لوگوں کی ان شفقتوں اور نیکیوں سے بڑے متاثر ہوتے اس لیے کہ ان کے خیال میں، ان کے سلیوٹ کا اشارے سے بھی جواب مل جاتا ان کیلئے بڑی عزت تھی اور یہاں ہم لوگوں کا اس طرح سے لاڈ پیار کیا جاتا تھا۔ اور گویا اپنے افسروں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے، وہ لوگ بھی ہمارے بڑے نخرے اٹھاتے قدرتی طور پر ہمارے سر پھر گئے۔

میں خاص طور سے گستاخ ہو گیا اور اگر "بولا" (رہبرے) کننگھم صاحب آس پاس نہ ہوتے تو میں کسی بھی صاحب کے پاس بے جھجک چلا جاتا۔ میں بار کے پاس وہاں بھی جا پہنچتا جہاں کھیل کے بعد خاص خاص لوگ جمع ہوتے تھے اور خانساماں سے سوڈے کی ایک بوتل مانگتا جو عام طور سے شامپین یا جھاگ دینے والی بیئر کی طرح سیس کرتا ہوتا تھا۔ اور رجمنٹ کے دوسرے لڑکے

مقابلے میں۔ میں نے ان ایکی اسکوں پر اپنا حق جمالیا تھا جو جنگ کے دوران ٹوٹ
جاتی تھیں۔ مادلس میموں کی نظر میں میری اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اس لیے کہ وہ
بچاسے تو دور کھڑے ہوئے میٹھی میٹھی نظروں سے صاحب لوگوں کو شراب پیتے اور
گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے دیکھتے اور میں صاحب لوگوں سے ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔
باجی بھی تو میری تعریف کرتے اور کبھی اتنا سر چڑھنے پر بگڑ ڈانٹتے۔ اگر
ویسے اس بات پر منحصر تھا کہ اس زمانے میں صاحب لوگ ان سے خوش تھے یا نہیں۔
لیکن صاحب لوگوں نے عوام میں جو بے تحاشہ دہشت پھیلا رکھی تھی، وہ علاوہ
میرے باجی کے معاملے میں ایک طرح کا احترام بن گئی تھی اس لیے کہ ان کا صاحب
لوگوں سے ہر وقت ہی سابقہ پڑتا تھا۔ پھر بھی اس احترام میں اتنا خوف اور
ہراس ضرور تھا کہ وہ احتیاط برتتے۔ گول مول بات کرتے اور صاحب لوگوں کی
بات میں "ہوشیار خبردار" کا برتاؤ رکھتے۔ انھوں نے تو ہم سب لوگوں کو
تاکید کر دی تھی کہ جب تک صاحب لوگ چلے نہ جائیں اس وقت تک ہم نہ تو
شور کریں یا اگر کوئی ضروری کام آپڑے تو دبے پاؤں آئیں اور کان میں بات
کریں۔ اور ناتمیزوں میں یا صاحب لوگوں کے بنگلوں کے پاس جانے کی تو بہت
سختی سے ممانعت تھی۔ لیکن ان کی ڈسپلن کے علاوہ ان میں انسانیت کا بڑا گہرا
شعور بھی تھا۔ اور اگر وہ یہ دیکھتے کہ اس طرح جیسے بڑوں اور بچوں کے درمیان
ہونا چاہیے۔ کوئی شفقت سے ہم پر ہاتھ پھیرتا ہے یا ہمیں دیکھ کر ہنستا ہے تو ہمیں
اس کا موقع دینے کی اجازت دیتے اور اس بات پر وہ خود اتنا فخر محسوس کرتے
کہ ہمیں ایسی بے تکلفی سے بھی منع نہ کرتے جس پر عام طور سے وہ ڈانٹتے بلکہ مار

بھی دیتے تھے۔

ہم نے جلد ہی اپنی سماجی کامیابیوں پر ان کی خوشی اور ان کے عام "ہوشیار خبردار" والے رویے کے تضاد کو محسوس کر لیا اور سخت تربیت کے ذریعے ہم میں جو اچھے بچوں والی عادتیں پیدا کر دی گئی تھیں ان کی مدد سے نبٹتے ہوئے ہمارا جو جی چاہتا وہ کرتے۔ صاحب لوگوں کو کبھی کبھی شرارت آمیز گستاخی سے سلام کرتے اور ان کی پیٹھ مڑتے ہی ان پر ہنستے۔ ان کے باغوں پر چھاپے مارتے اور گلاب کے پھول اڑا لیجاتے یا محمد دین خانساماں کے پاس جاکے ایک ڈبل روٹی وصول کر لاتے اور گھر آکر ولایتی روٹی کے مزے اڑاتے۔

چھاؤنی کی بے کیفیت اور یکساں زندگی میں ایک عجیب و غریب اور ہم بچوں کے لیے ایک افسانوی کردار ڈمبری ڈائی کے آجانے سے ایک بڑی خوشگوار تبدیلی آجاتی۔ ڈمبری کسی دور قریب جنت کی طرح کئی کئی دن تک یاد کئے جاتے اور گردش کرتے تھے۔

وہ لمبے اور دبلے آدمی تھے، گول چہرے پر باریک نوکیلی ناک اور چوڑے گھنے لیکن ان کی امتیازی خصوصیت تھی، وہ جس سے انھیں دیکھتے ہی آدمی ہنس پڑتا بھی ہوتا تھا اور اسے حیثیت بھی ہوتی تھی، ان کی پیوند دار، دھوپ کھائی قمیص، نیلی پگڑی اور گھسی ہوئی برجس اور ان سب پر رنگ برنگے ٹکڑوں کے پیوند لگے ہوتے۔ پنڈلیاں پر لال پٹی بندھی ہوتی اور پاؤں میں ہندوستانی جوتے —— یہ سب چیزیں مل جل کر ان پھٹے پرانے کپڑوں میں کی تھیں جو سپاہیوں نے انھیں فقیر سمجھ کر دے دی تھیں۔

اور ان کے پاس سب سے شاندار اور سب سے حیرت انگیز چیز تھی بکروں کی ڈفلی جس پر دُنیا کے تقریباً سارے ملکوں کے ٹکٹ جڑے ہوئے تھے، جو وہ بتایا کرتے تھے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں کا دورہ کرکے انھوں نے صاحب لوگوں سے جمع کیے تھے۔

"ڈمبری! ڈمبری! اے ڈمبری آگیا": سپاہی انھیں دیکھ کر چلاتے۔ اور نعروں اور فقروں سے ان کا سواگت کرتے۔ بچے اس شوق میں ان کے پیچھے لگ لیتے کہ شاید وہ ڈفلی ان کے ہاتھ میں دے دیں اور انھیں بجانے کا موقع مل جائے۔

ڈمبری اپنے سواگت کے جواب میں فوراً اٹینشن ہوکر چلاتے "آرڈر آپ! شولڈر اِس! اٹینشن اٹیز!" اور اپنے آرڈر پر خود ہی عمل کرتے جاتے۔ ڈفلی کو کندھے تک اُٹھاتے اور اس کے گدے پر چٹاخ سے ہاتھ مارتے جس سے ڈر کر پیڑوں پہ چڑیاں اور کوے اُڑ جاتے۔ اور پھر اسے سامنے کرکے اس طرح لے لیتے جیسے پریڈ میدان میں کسی صاحب کے آجانے پر سپاہی فوگ کرتے تھے۔

اس غیر معمولی تماشے کے صلے میں، وہ جس آدمی کو سلامی دیتے اس کی آمدنی اور حیثیت کے مطابق اس سے بخشش کی توقع رکھتے۔ سپاہیوں سے اکنی، این سی او سے چاندی کی اٹھنی، ہندوستانی افسر سے کلدار روپیہ اور انگریز افسر سے پانچ یا اس سے اوپر۔

اور جس آدمی کو وہ سلامی دیتے اس سے نقدی کے علاوہ کوئی کپڑا بھی مل جاتا تو وہ جلتی چھاتی کے ساتھ مشین چلانے کی مشق شروع کر دیتے جو کہ

اس شش کا سب سے آمیز نمونہ ہوتی جو سپاہی جنازہ ٹیم کے سر پر لگے ہوئے بوٹ کے ساتھ عام طور سے کیا کرتے تھے۔

اب تماشائی ان کو چیتا کرنے کی، یا پھر ان کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ کوئی انگریزی کا گانا سنائیں۔ اور دوسری وہ مرغ کی چونچ کی طرح اپنا منہ کھول کر انگریزی نامیوں کے مارچنگ گیت "ٹپ ری ری" کی ہزل یا پھر پہاڑی ڈوگرا کا کوئی لوک گیت شروع کر دیتے۔

لیکن جب ایک بار کوئی انھیں روپیہ دے دیتا تو وہ اور روپیہ اینٹھنے کے لیے مسخروں جیسی ذومعنی کے مختلف حصے دہرانے لگتے۔ اور وہ اس میں اپنا سارا دل دماغ لگا دیتے، اپنی مہارت کا مظاہرہ اس شدومد سے کرتے کہ پیچھے پیچھے منہ لال ہو جاتا اور سارا جسم پسینے میں تر ہو جاتا یہاں تک کہ تماشا ایک ڈراؤنی اور وحشتناک صورت اختیار کر لیتا۔

"اسٹینڈ فیجر!"

"شن!"

"لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ!"

فضا میں کرخت آوازیں گونجتی رہتیں یہاں تک کہ بھیڑ تھک جاتی۔ تب وہ اپنے ہاتھوں پر تھوک کر لیتے اور اپنی لاٹھی کی انگلی کو سختی سے پکڑ کر شروع کرتے۔

"مرد بنو، مرد کا کرتب سیکھو، مارو!" وہ اس زور سے چیخ چلاتے کہ منہ میں جھاگ بھر جاتا، ان کے گلابی چہرے کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہو جاتا اور بھوت کی طرح حملہ کرنے کے لیے ان کا پورا جسم اکڑ جاتا۔

• اگر دشمن پیچھے نہیں ہٹتا یا جوابی حملہ کرتا ہے، تو اس کے سر پر رائفل کا کندہ مارو، پیٹ پر لات دو اور گرا دو۔ پھر اس کے پیٹ میں سنگین اتار دو، زور سے، پوری سنگین، لیکن فوراً کھینچ لو تاکہ دشمن چھد جائے اور اتنا خون بہ نکلے کہ مر جائے۔ ایک، دو، تین، چار......"

اور پھر وہ اپنے ہی بتائے ہوئے قاعدوں کے مطابق عمل کرتے۔

سپاہی اس قاعدے کی ٹھیک ٹھیک نقل دیکھ کر، جو این سی او ان کو سکھایا کرتے تھے، خوب ہنستے اور ہم بچوں کو یہ بڑا تماشہ معلوم ہوتا تھا اور ہم ڈمبری کو دنیا کا سب سے بڑا جوکر سمجھتے تھے اس لیے کہ وہ ہمیں دکھاتا تھا کہ کیسے مارا جاتا ہے۔ البتہ ننھا بھی اس کی ان حرکتوں سے ڈر جاتا تھا اور رونے لگتا تھا۔

کوئی حولدار، ڈمبری کا دھیان بٹانے کے لئے کہتا "آؤ چائے پی لو" لیکن یہ یقینی نہ ہوتا کہ وہ اپنی مجنونانہ نمائش کو ملتوی کر کے چائے پئیں گے یا روپے کی فکر میں اپنا کام جاری رکھیں گے۔ فقیر کی سوچ کا بھلا کسے پتہ!

این۔ سی۔ او ڈمبری کے اس تماشے کو بہت پسند کرتے تھے اور ساتھ نوکروں کے سامنے انھیں سپاہیانہ بہادری کی مثال بنا کر پیش کرتے اور ان کے بارے میں طرح طرح کے قصے، اور مختلف لڑائیوں میں ان کے کارنامے کی کہانیاں اپنے دل سے جوڑ جوڑ کر سناتے۔

ایک کہتا: "وہ ایک جرنیل صاحب اور ایک پٹھان عورت کا لڑکا ہے۔" دوسرا اپنی رائے ظاہر کرتا: "وہ تو سرحدی علاقے میں قبائلیوں کا پیر ہے۔" تیسرا اطلاع دیتا: "دلی دربار میں اس نے بادشاہ جارج پنجم سے

اُٹھا لایا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!

کوئی زنکورٹ پوچھتا، "اگر وہ اتنا بڑا آدمی ہے تو پھر فقیروں کی طرح پیوند لگے کپڑے کیوں پہنے گھومتا ہے؟"

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اور ان کے جانے کے کچھ دنوں کے بعد تو میری کی یاد بھی اس فراموشی کی دھند میں چھپ جاتی جو زمین کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتی ہے۔ اور ایسا لگتا کہ ہماری اس دنیا میں ہر شخص اور ہر چیز کے لیے جگہ ہے چاہے وہ کتنی ہی بے سر پیر کی اور کتنی ہی احمقانہ کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ تو میری اگلے سال پھر جنت کی روزمرہ کی بے کیف اور بے جان سی زندگی کو اپنی وحشیانہ اور مجنونانہ بیماری سے چھیڑنے کے لیے آموجود ہوتے۔

کبھی کبھار بابا جی ہم لوگوں کو لنڈا پر بنے ہوئے کشتیوں کے پل پر سیر کے لیے لے جاتے۔ نوشہرہ میں دریائے کابل کو لنڈا ہی کہتے ہیں اس لیے کہ یہ ندی پوری پچھلا وہ ہے جو اٹک میں دریائے سندھ میں ملنے سے پہلے بڑی ہی چوڑی اور منہ موڑی بہتی ہے۔

دریا کے سوکھے پیٹے میں سے ہو کر جو راستہ اسکول اور ہال کے آگے سے ہوتا، اور کشتیوں کے پل کی طرف جاتا تھا اس پر دوڑنے میں مجھے بڑا مزا آتا تھا۔ میں بابا جی کے ساتھ ساتھ لگا، بنا بسلسل باتیں کیے جاتا اور طرح طرح کے سوال پوچھتا۔ بابا جی کے ساتھ اس طرح ٹہلنے جا کر اور یہ دیکھ کر کہ بابا جی کو ہر ایک آدمی سلام کرتا ہے، اور خاص طور سے یہ محسوس کر کے مجھے

بڑا فخر ہوتا اور اپنی طاقت کا اندازہ ہوتا کہ یہ راستہ اسکول کی قید کے اندر نہیں بلکہ بےنگا رنگ اور خوبصورت، اینٹوں کے بنے ہوئے شہر کو جاتا تھا جس کی چہل پہل سڑکوں پر سوار لمبی لمبی قمیص اور تھیلے جیسی شلوار، ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں اور فل ولی حقہ کی واسکٹیں پہنے ہوئے پٹھانوں، پنجابی دکانداروں، جنھوں نے سرحد کی چال ڈھال اور پوشاک کو اپنا لیا تھا اور ویسے ہی ڈرانے لگے تھے، بریگیڈ کے سپاہیوں کے ٹھٹھے کے ٹھٹھے اور اکا دکا ہی نظر آتے تھے جو اپنی ٹوپیاں انگریزوں کی طرح آڑی کیے وردی کی ٹوپیوں میں، اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑیاں چمکاتے ہوئے یا تو کباڑیوں کی دکانوں کے باہر کھڑے ہوتے یا رنڈیوں کے بازار کے کوٹھوں میں دیکھے ہوتے۔

دوستوں اور جان پہچان والوں کو سلام کرتے، ان کے سلام کا جواب دیتے، کسی سے ٹھٹھک کر راہ روکی میں ایک آدھ بات کرتے، کسی سپاہی یا اپنی سی او کو، جو جانے گھر آتے یا دفتر میں دیکھے جانے سے ڈرتا تھا اور جس کو کوئی کام کرانا ہوتا تھا، ایک طرف لے جا کر اس سے ویسے ہی باتیں کرتے ہنستے مذاق کرتے۔ جانے یا ابی ہم لوگوں کو بازار میں لے جاتے، کوڑھیوں کے ایک اڈے کے پاس سے گزرتے اور پھلوں کی دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے، جن کے مالک مکھیوں سے ڈھکے ہوئے پھوڑے بیچتے، اور فقیروں سے کتراتے ہوئے جو اپنے گندے زخم دکھا دکھا کے ایک پیسے کے لیے گڑگڑاتے، ہم لوگ گرانڈ ٹرنک روڈ پر پہنچ جاتے جہاں گدھوں کی قطار، ڈھول کے بادل اڑاتی گزرتی اور انگریزی اسٹائل کی دکانوں کے شیشے جن میں رنگین تھالیاں،

کیک اور پیسٹری اور چاکلیٹ رکھے رہتے، دُھلا جاتے۔

دریا اتنا تیز اور خطرناک تھا کہ اس میں نہایا نہ جا سکتا تھا۔ بس تہواروں کے موقعے پر لوگ نہاتے اور لائف بوٹ تیار کھڑی رہتی کہ اگر کسی کا پاؤں پھسلے اور وہ بہنے لگے تو اسے فوراً بچا لیا جائے۔ جیمن صد پار اور نوشہرو کے پرانے گاؤں کو ملانے کے لیے جو پیدل پل بنا ہوا تھا اس کی ایک کشتی پر بیٹھ کر جوا کھیلنا باجی کو بہت پسند تھا۔

اس ندی کے بارے میں طرح طرح کے مابعد الطبیعیاتی سوالات مجھے ستاتے رہتے: کہاں سے آیا تھا اور کہاں جائے گا۔ اس لیے کہ اپنی زندگی کی اس منزل پر میں زندگی کی ہر چیز کا سلسلہ کسی دوسری چیز سے ملانے کی کوشش کیا کرتا تھا اور جاننے اور مالک ہونے کے فطری جذبے میں سرشار تھا۔ باجی نے سمجھایا کہ پہاڑوں سے بارش کا پانی نالوں میں بہہ کر آتا تھا اور پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر آتی تھی اور یہ دریا سندھ میں جا کر مل جاتا تھا اور سندھ سمندر میں گرتا ہے۔

خیالی جزائر کی تلاش سے عمل تک کا وقفہ میری زندگی میں بہت تھوڑا ہوتا تھا چنانچہ سمندر کا ذکر سنتے ہی میں پکڑ سے اٹھا، سمندر تک تیر جانے کے لیے تیار ہو گیا اور جب مجھے بتایا گیا کہ مجھے تو تیرنا آتا ہی نہیں اور یہ کہ دریا گہرا ہے اور سمندر اس سے بھی بہت زیادہ گہرا ہوتا ہے تو میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر ایسی ہی مصیبت آئی تو میں راستے ہی میں بھاپ بن کر بادل بن جاؤں گا اور ٹھیک اسی جگہ واپس آ جاؤں گا جہاں سے میں چلا تھا۔

باباجی نے میری توجہ کسی اور طرف ہٹا دی اور یہ بھی ہوا کہ خاموش طبیعت نیک گُرشیش نے میری قمیص کا کالر پکڑ کر مجھے انجانی دنیاؤں میں چوکڑم کا سفر کرنے سے روک لیا۔ اب مجھے یہ مسئلہ پریشان کر رہا تھا کہ پانی کیسے بہتا ہے اور پھر جب ساری دنیا کا پانی اتنی تیزی سے سمندر میں جا کر گرتا ہے تو سمندر اُمنڈ کیوں نہیں پڑتا اور دنیا بھر میں پانی سر سے اونچا کیوں نہیں ہو جاتا۔ باباجی نے سمجھایا کہ ہزاروں سال پہلے ایک بہت زبردست سیلاب آیا تھا اور پہلے دنیا کی بڑی بڑی چٹانیاں جو اب پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں، سوکھی زمینیں تھیں اور جہاں اب زمین ہے وہاں پہلے سمندر تھا۔

دنیا کی بڑی بڑی چٹانیوں والے فقرے پر میں بڑا چکرایا اور میں حیران پریشان سہما سہما گھر آیا۔ میرا چھوٹا سا بھیجا سب کچھ جاننے کے لیے پھٹا جا رہا تھا۔ اور باباجی سے سارے سوالات پوچھ بھی نہ سکتا تھا کہ کہیں وہ جھڑک کر یہ نہ کہہ دیں "اچھا اب نچلا بیٹھو اور مجھے ذرا چین لینے دو"۔ لیکن مجھے چین کہاں پڑتا تھا اور میں نے ایک گڑگڑاتے ہوئے بھینی کے ساتھ پوچھ ہی لیا۔ "باباجی آخر دُنیا میں ایسی چیزیں کیوں ہیں؟ کس نے بنائی ہے یہ دُنیا؟ اور یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ آدمی سب کچھ جان سکے؟" باباجی میری تیزی اور بے صبری پر مسکرا کر رہ گئے اور انھوں نے اس طرح شفقت سے مجھے تھپکی دی جیسے وہ مجھ سے بہت خوش ہوں اور وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھے۔ انھوں نے ہم لوگوں کے لیے بغیر خود ہی کہا کہ وہ ہمیں کسی شمشان ڈکانڈا سے ایجو گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے اپنا مال لے کر بیٹھا کرتے تھے، ایک تربوز خرید دیں گے۔

جب سودا پٹ گیا تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اور ہم منتظر تھے کہ ایک چھوٹا سا تربوز گھلوسے میں لے، جو وہ کاندار کبھی کبھی شے دیا کرتے تھے اور جو ہم بھی کے لئے لیانا چاہتے تھے۔ اباجی ذرا چپ چپ سے تھے اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ ان کو تھوڑے سے پیسے خرچ کرنے پڑے تھے بلکہ یہ بھی کہ اب انھیں ایک ایسا پھل بچا کھنا تھا جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے شہد جیسا میٹھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکل ہی پھیکا اور سیٹھا نکلے۔ اباجی کو بہرحال کچھ تو پہچان تھی ہی پھلوں کی۔ وہ بیٹھ گئے اور انھوں نے تربوزوں کو اپنے دونوں ہاتھ سے بجا بجا کر اس طرح دیکھنا شروع کیا جیسے وہ مٹی کے گھڑوں کو دیکھ رہے ہوں کہ نہ نے چھوٹے تو نہیں۔ اور اتنے مول تول کے بعد سودا کیا کہ جتنا دکاندار مانگ رہا تھا اس کے آدھے ہی پہلے ہوگیا اور صرف ایک نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے دو تربوز گھلوسے میں مل گئے تاکہ ہم دونوں بھی خوش ہو جائیں۔ مجھے دُنیا کے تمام باپ سے زیادہ خوشی اور فخر کا احساس ہوا کہ میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں۔

اسکول ماسٹر کی بیوی کے مستقل خوف سے آزادی کے ان دنوں میں ہم ایک زیادہ بھرپور دنیا کی گرمجوشی اور سازگاری سے محبت کرنے لگے تھے اور قزاق کے طور پر وہ حرکت کرتے جس میں وحشیانہ جبر کا سا رس اور جادو ہوتا۔ شیطان کے چیلے تو ہم تھے ہی۔ ہمیں کسی چیز سے ڈر نہ معلوم ہوتا تھا۔ نہ زمین سے نہ آسمان سے، نہ پولیس سے نہ پہرے کے سپاہیوں سے۔

ایک دن صبح گنیش اور میں نے چڑھا نظر گروہ ہونے کی وجہ سے اسکول میں

مجھ سے زیادہ مصیبت میں رہا کرتے تھے اور جنھوں نے اسی لیے اسکول سے غائب ہو جانے کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ بڑی دیر کی کانا پھوسی کے بعد مجھے بھی اپنے راز میں شریک کر لیا اور یہ کہا گیا کہ ہم سب اسکول سے غیر حاضر ہو جائیں اور ندی کے کنارے گنّے کے کھیتوں میں جائیں۔

گنیش نے اچانک بڑی خاکساری اور منت کے ساتھ کہا: "چھوٹے بھیا، ہم نے اپنا گھر والا کام نہیں کیا ہے اور آج اسکول گئے تو ہمیں مار پڑے گی اور تمھیں بھی دیر ہو گئی ہے۔ دیکھو سورج کتنا اونچا آ گیا ہے اور اگر اور کچھ نہیں تو تمھیں دیر سے پہنچنے ہی پر مار کھانی پڑے گی۔ تو تم بھی ہم لوگوں کے ساتھ چلو۔ ہم تم کو گنّے کے بھٹے دیں گے۔"

ایک ذرا دیر تو میں اسکول جا کے پٹنے کے ڈر اور اسکول سے غائب ہونے کے جرم کے بیچ ادھر میں رہا۔ لیکن بڑے لڑکوں کی دلداری میرے لیے اتنا امکان پیدا کر دیتی تھی کہ ان کے کھیلوں کی دنیا میں برابر سے شریک کیا جانے لگوں، اور پھر گنّے کے بھٹے بھی تو ملیں گے۔

اتنے میں مل نے بڑی محبت سے کہا: "میں تم کو جھولی بھر کے لال لال بیری دوں گا۔ مجھے ایک جھاڑی کا پتہ ہے جسے کسی نے ابھی تک چھوا بھی نہیں۔"

اس پر میں بہل پڑا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

پرانی ندی کے سوکھے پیٹے میں کافی دیر تک مارے مارے پھرنے، گلیاں کھیلنے کے لیے ادھر ادھر دوڑ کر اچھے پتھر جمع کرنے، بیری کے پیڑوں پر چڑھنے اور لال لال پکے پھلوں سے اپنی جیبیں اور دامن کی جھولی بھرنے

اور چڑیوں کے گھونسلوں کی تلاش لینے کے بعد، ہم پیچھے سے مکئی کے کھیت میں گھس گئے اور ایک چھوٹی سی صاف جگہ پر بیٹھ گئے۔ ہمیں گرمی لگ رہی تھی اور پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہاں ہم نے اپنے ساتھ لائے ہوئے پھل کھائے۔ پھر ہم نے اچھا بچے کچے بیج اور اس فکر میں لگے کہ انہیں چھپایا کس طرح جائے۔ لیکن ہم میں سے کسی کے پاس بیلچہ تو تھا نہیں اور پھر مکئی کے کھیت میں آگ جلاتے تو بھی تو کیسے۔

صبح کے سیر سپاٹے کے دوران میں اور پھل کھاتے وقت ہم خوش تھے اور یہ بالکل ہی بھول گئے تھے کہ اسکول جیسی کسی چیز کا بھی کوئی وجود ہے۔ اب جب سارے مشاغل ختم ہو گئے تو ہمیں پریشانی ہونے لگی اور ہم بے چینی سے وقت کاٹنے لگے کہ کب گھر جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اب ایسا کس طرح کیا جائے کہ ہم گھر اسی وقت پہنچیں جس وقت اسکول سے چھٹی ہونے پر آتے تھے۔ اگر جلدی گھر پہنچ گئے تو فوراً شبہ ہو جائے گا اور یہ بھی ڈر لگتے تھے کہ کسی سے جا کر وقت پوچھیں کہ کہیں کوئی سپاہی ہم لوگوں کو دیکھ کر جا کے گھر میں خبر نہ کر دے۔

ہم نے یہ دیکھ کر کہ سورج نے صبح سے اب تک کتنا سفر طے کیا ہے، وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کسی صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ پھر ہم اسی بار کھیت کی مینڈھ پر آئے اور اس راستے کو دیکھتے جو اسکول سے بازاروں کی طرف آتا تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ چھٹی کے دوسرے لڑکے لوٹ رہے ہیں کہ نہیں۔

بڑی دیر کی بے چینی، پریشانی اور کشمکش کے بعد جس کے دوران میں ہمیں یہ خیال بری طرح ستاتا رہا کہ اگر گھر جانے والے لڑکوں کی کسی ٹولی سے

ہمیں دیکھ لیا تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ ہم نے رحمت کو اکیلے آتے دیکھا۔ ہم لپک کے اس کے پاس پہنچنا چاہتے تھے اور ارادہ یہ تھا کہ اسے علی کے پیچھے شرارت کے طور پر شہ دیں گے تاکہ وہ باکروں میں جاکر ہماری چپل نکالے۔

لیکن جیسے ہی ہم کھیت میں سے نکلے اس کے پٹھان مالک نے جو اپنے کوٹھے سے گڈیاں اڑا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ لیا اور دوڑ آیا۔

ہم نے قمیص اور شلوار میں جو بھٹے چھپا رکھے تھے ان کی وجہ سے ہم تیز بھاگ بھی نہ سکتے تھے اور بھٹے بھی لڑا لڑ گرنے لگے۔

علی اور گنیش تو تیزی سے بھاگ کر سڑک کے اس پار ہو لیے لیکن میری ٹانگیں بہت زیادہ دور تک نہ جا پائی تھیں کہ میں پکڑا گیا۔

کسان نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے مجھے اپنی چارپائی کے پاس زمین پر ڈال دیا۔ میں یہ دیکھ کے زور زور سے رونے لگا کہ یہ اب مجھے مار ڈالے گا۔

خوف پسینے اور سسکیوں کی وجہ سے میرا اضمحلال ہو رہا تھا اور میں ڈال بیٹا لیٹا سوچ رہا تھا کہ اب آخری گھڑی آ پہنچی۔ رحمت نے بڑے ہاتھ پاؤں جوڑے مگر پٹھان مجھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔ لیکن گنیش اور علی دوڑے دوڑے ابا کے دفتر پہنچے اور انھیں قصہ سنایا کہ میں کیسے اسکول سے لوٹتے وقت بھٹے چراتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔

ابا جی آئے اور انھوں نے مجھے چھڑوا لیا اور وہ اچھی طرح میری خبر لینے ہی والے تھے کہ مجھ پر ایک مصیبت کے اوپر سے مار کا خوف طاری ہو گیا اور بیچ یا دوسرے ہی دن ڈانٹنے کے بعد میں چوری میں اپنے ساتھیوں کی اہمیت کو

چھپا نہ سکا اور پورا قصہ سنا دیا کہ مجھے کیسے ان لوگوں نے اسکول سے غائب ہو جانے پر رضامند کیا تھا۔

اس رات کو لڑکی واشنگ سے گنیش کی بڑے غضب کی پٹائی ہوئی اور وقتی طور پر میرے والدین مجھ سے خوش ہو گئے۔

علی کی ماں نے بھی علی کو گھر سے باہر نکال کر اپنے بیٹے کو سزا دی اور علی کو رات بھر ایک سنتری کی کھولی میں سونا پڑا۔

جب سے میں نے علی اور گنیش کے ساتھ دغا کی تھی تب سے وہ لوگ مجھ سے بہت نفرت کرنے لگے تھے۔ مجھ سے الگ رہتے اور ہر شخص کے دوسرے لڑکوں سے بھی الگ رہنے لگ گئے۔ اور میں پہلے سے بھی زیادہ اکیلا رہ گیا۔

میں نے اپنا بدلہ لینے کے لئے ایک بار ڈیڈی سے یہ کہہ دیا کہ گنیش اور علی نے میرے جوتے اٹھا کر کہیں پھینک دیئے ہیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ ان دونوں نے مجھے اپنے ساتھ جھونپڑی کا اکھاڑہ دیکھنے لے جانے سے انکار کر دیا تھا اس لئے انتقاماً گنیش کے خلاف سوچا کہ میں نے اپنے جوتے پلنگ میں اور کے نیچے چھپا لیے اور گنیش پر یہ الزام لگا دیا کہ اس نے جوتے کہیں پھینک دیئے ہیں۔ جب ڈیڈی دیر تک گنیش کی پٹائی کر چکے اور ڈیڈی بڑی لڑائی سے سخت ناراض آ چکے تھے اور رات میں جوتوں کے نقصان پر پریشان تھے، گنیش کی خوب اچھی طرح پٹائی کر چکے تو میں نے بتا دیا کہ اتفاق سے جوتے چارپائی کے نیچے مل گئے ہیں اور یہ بات بتا دی کہ گنیش بے قصور تھا اور مجھے بہت دکھ ہوا کہ بھی ماری کی گئی ... نیچے مل گئے، اس لئے کہ میں نے ہی چھپا لیے تھے۔

اس واقعے کی وجہ سے لڑکوں نے مجھ جیسے چھوٹے کو بالکل ہی اپنے ساتھ سے کاٹ دیا اس لیے کہ میں نے لڑکوں کے آداب کے اس اصول کی خلاف ورزی کی تھی کہ بڑوں سے چھوٹی شکایت کبھی نہ کرنی چاہیے، اور میں ہمیشہ سے زیادہ تنہا رہنے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ تسکین کے بھی کچھ سامان تھے۔ کوئی سپاہی مجھے اکیلے گھومتا دیکھتا اور مجھے ایک پیسہ دیتا یا رجمنٹ کے چھوٹے بازار کی سیر کرا لاتا اور وہ ڈوگی یا پانڈیوں کی روایت کے مطابق مجھے حلوائی کی دکان پر سے دودھ جلیبی دلوا دیتا، یا پھل والے کے یہاں سے کوئی پھل خرید دیتا، یا اور کچھ نہیں تو بنئے کے یہاں سے گڑ ہی خرید دیتا۔ اماں نے مجھے منع کیا تھا کہ اس طرح کسی کی دی ہوئی چیز نہ لیا کروں اس لیے کہ یہ سپاہی کہیں ٹونا وونا کر دیں گے، لیکن میں جادو ٹونے کے خطرے کی پروا کیے بغیر، اس طرح چیزیں ملنے پر بہت خوش ہوتا اور مزے لے لے کر چٹ کر جاتا۔

میں مستری کے یہاں، کارخانے کی طرف چلا جاتا اور گھوڑا گاڑی کے پاس لگے بیٹھے پہروں دیکھا کرتا جو سامان دھرا تھا اس پر لوہے کے ٹکڑے تیز کیا کرتا یہاں تک کہ مستری کا سب سے بڑا بیٹا اور اس کا شاگرد کرامت اللہ آتا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس کچھ پرانے پہیے پڑے ہوئے ہیں، وہ ان میں جوڑ جاڑ کر میرے لیے تین پہیوں والی سائیکل بنائے گا۔ شام کو وہ کلب والی کھیلنے گیا ہوتا، لیکن جب کبھی وہ کارخانے میں ہوتا تو میں دیکھتا کہ وہ پہیے ایک پرانی سائیکل ٹھیک ٹھاک کر رہا ہے اور مجھ سے اگلے دن آنے کو کہہ کر

مجھے ٹال دیتا۔

میں نے رجمنٹ کے بڑھئی گوردو سے جو میرے بڑے بھائی برکت کا دوست
تھا، دوستی بڑھائی۔ گوردو چھوٹے قد کا گٹھا ہوا جیالا سا تھا، ناک چپٹی تھی اور
بالکل گوریلا سی شکل تھا۔ وہ صاحب لوگوں کے بنگلے کے فرنیچر کی مرمت کیا کرتا
اور مجھ سے مذاق کرتا جاتا کہ میری شادی کب ہوگی اور جب میری شادی
ہو جائے گی تو میں اپنی بیوی کے ساتھ کیا کروں گا۔ میں اس کی چوکھٹ پر
گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اسے بھونڈے بھونڈے جواب دیتا جاتا جن پر وہ اور بھی
مذاق کرتا اور میں اس سے کہتا کہ مجھے لکڑی کی تلوار بنا دے۔ مجھ میں تخلیق کرنے
کی جو کھجلی سی لہر اٹھتی تو میں اس کے اوزاروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتا۔
وہ یا تو مذاق میں اپنی سخت انگلیوں سے میرے گلوں پر مارتا یا زور سے جھڑک کے
مجھے روک دیتا اور ایک سوال گندی کیتلی میں سے ایک گھونٹ چائے دیتا۔ گوردو کی
کیتلی لوہے کی انگیٹھی پر چڑھی رہتی، لکڑی کی چھیلن اور بیکار ٹکڑوں کی آگ
میں جلائے رکھی جاتی، وہ دودھ، گڑ اور پانی سب کھولتا رہتا۔ اور وعدہ تو ضرور
روز ہی کرتا کہ کل سے وہ میرے لیے تلوار بنانا شروع کر دے گا۔

جب میں گھر آتا تو اماں بتاتیں، ان دونوں سپاہیوں کے یہاں
جانے کی کیا ضرورت، اور ادھر ادھر مت پھرا کر بیٹا؛ لیکن اس زمانے
میں میں اپنے بڑوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر ذرا کم ہی عمل کرتا تھا۔
میں اکثر رجمنٹ بازار میں، دھوبیوں، نائیوں اور دوسرے لوگوں کے گھروں
کی طرف ہر قسم کے سیر سپاٹے کے لیے جہاں بھی میرا جی چاہتا چلا جاتا اور جو کوئی

بھی مجھ سے مخاطب ہوتا اس سے میں باتیں سنا کرتا۔ میں اکیلا تھا تو ان ملاقاتوں اور میل جول میں میرے لیے کتنی خوشی تھی۔ مٹھائی، پھل یا کھلونے کے چھوٹے چھوٹے تحفے پا کے دل خوشی سے کس طرح ناچنے لگتا تھا۔ یہ معمولی غریب سپاہی، مزدور اور اچھوت میرے ماں باپ کے مقابلے میں کتنے نیک کتنے فراخ اور کتنے اچھے دل کے تھے۔ ویسے تو میرے والدین اپنے کو ان لوگوں سے کہیں برتر سمجھتے تھے اور ان لوگوں کی کسی چیز کو چھونے تک سے منع کرتے تھے۔ میں اب جو کچھ جانتا ہوں، چیزیں بنانے کی صلاحیت، کہانی سنانے اور جانے بنائے جانے کا فن اور میری ساری انسانیت انھیں بیکار لمحوں میں پروان چڑھی ہے جو گھر سے غائب رہ کر صرف کیے گئے تھے۔

لیکن ایک سہ پہر کو ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے اس قسم کے ساتھ سنگت کے لیے میرے جوش و خروش کو اگر ہمیشہ کے لیے نہیں تو کم سے کم کچھ وقت کے لیے ختم کر دیا۔

پاس کی رجمنٹ کے کچھ انگریز سپاہی، وہ پارک کے اس پار بونیر جھاڑیوں کے ادھر ادھر اور پارک کے چاروں طرف کی نیچی چار دیواری کے آس پاس منڈلایا کرتے۔ اپنی ہوائی بندوق سے کبوتر اور چڑیاں مارتے اور ربڑ کی غلیلوں سے بھی شکار کرتے جو چڑیاں مارنے کے لیے شاید انھیں بہت بھا گئی تھیں۔

میری رگ رگ میں ہر ایک سے گھل مل جانے کی عادت رچی بسی تھی اور ان صاحب لوگوں کے لیے تو میرے دل میں خاص قدر و منزلت بھی تھی۔ چنانچہ میں ان میں سے کسی کو دیکھتے ہی ان کے پاس جا پہنچتا۔ ان میں سے

زیادہ تر میرے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آتے، دوسرے سرپرستانہ انداز میں مسکراتے
اور مجھے، یا اپارٹمنٹ کے دوسرے بچوں کو، پیچھے پیچھے آنے سے منع نہ کرتے۔

لیکن ایک دن میں نے بکنگھم کو جو "بولا" (بہرے) صاحب کے نام
سے مشہور تھے، جہاز گھر کے پیچھے پایا، دیواری سے لگے تھے، ہاتھ میں تھیلا لیے
جاتے دیکھا۔ میں نے ان کو سلام کیا اور ان کے پیچھے ہو لیا۔ اس لیے کہ میں
نہیں چاہتا تھا اور انھیں کی طرح شکار کھیلنے کا طریقہ سیکھنا چاہتا تھا۔

انھوں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا "جاؤ" لیکن میں رک کر ان کی طرف
گھورنے لگا۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ مجھے اس لیے بھگانا چاہتے ہیں کہ کہیں
میں چڑیاں نہ اڑا دوں جنھیں وہ نشانہ بنانے جا رہے ہیں۔

جب وہ آگے بڑھے تو میں پھر پیچھے لگ لیا۔

اس وقت بڑی گرمی تھی۔ غالباً صاحب گرمی سے پریشان تھا یا شاید
اس بات سے چڑ گئی کہ ایک بالشت بھر کا لونڈا اس کے حکم کی خلاف ورزی
کر کے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

دریا کے سر کے پیچھے میں پہنچ کر انھوں نے مڑ کر دیکھا اور مجھے اس طرح
ڈانٹا جیسے میں کوئی پلا ہوں۔

میں بد مزہ تھا۔ تھوڑا ڈر تو مجھے لگا مگر میں پھر بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔
چند قدم چل کر انھوں نے زمین پر اپنے پاؤں پٹخے۔

میں ان کے نہ ہونے پتھروں پر سے ہوتا ہوا، جو دھوپ سے لال ہو رہے
تھے، اس لال پگڈنڈی کو پکڑنے ہی والا تھا جو رجمنٹ دفتر کی چار دیواری کی

میں سے چھوٹے دروازے کی طرف جاتی تھی۔ لیکن دو چار قدم چل کر میں نے کنگھم صاحب کو گھور کر دیکھا جو آگے بڑھ چکے تھے۔

اب ان کا غصہ ضبط سے باہر ہو چکا تھا یا شاید دماغ پر گرمی چڑھ گئی تھی، اس لیے کہ انھوں نے اپنی جیب سے ایک پتھر پھینک کر مجھے مارا، جو آ کے میرے بازو پر لگا۔

میں درد کے مارے چیختا ہوا اپنے باجی کے دفتر کی طرف بھاگا۔

برآمدے میں ایک اردلی تھا جو دوڑ کر میرے باجی کو بلا لایا۔ باجی اسی بات پر خفا تھے کہ میں اس طرح چیختا ہوا دفتر پہنچ گیا اور ابھی سارے صاحب لوگ دفتر سے گئے نہیں تھے اور انھیں ڈر تھا کہ صاحب لوگوں نے میرا واویلا سن لیا تو جانے کیا ہو۔

لیکن میں حلق پھاڑ کے چیختا چلاتا رہا اور میں نے انھیں بتایا کہ کنگھم صاحب نے مجھے پتھر کھینچ مارا۔

باجی کو میری بات کا یقین نہیں آیا، وہ اور بھی بگڑ گئے۔ اپنی بے بسی پر وہ مہینوں سے اندر ہی اندر جلے بیٹھے تھے۔ اوپر سے یہ حادثہ ہو گیا جس میں ایک صاحب پر حرف آتا تھا۔ مارے غصے کے انھوں نے اتنا فساد مچانے کی سزا میں مجھے زناٹے کا ایک طمانچہ رسید کیا۔

میں نے بے بسی سے ان کو تکتے ہوئے فریاد کی: "اماں، ہائے میری اماں!"
باجی نے میرے بازو پر نشان دیکھا تو کچھ پسیجے۔ انھوں نے مجھے اٹھا کر ایک اردلی کی بنچ پر لٹا دیا اور کسی نے پانی لا کر مجھے پینے کے لیے دیا۔ ایک اردلی نے

اپنا انگوچھا پانی میں بھگو کے میرے سر پر لپیٹ دیا۔ لیکن میں برابر روتا رہا۔ ایک صاحب بھی اٹھ کر باہر آگیا اور مجھے چپ کرانے لگا اور باجی نے اس سے انگریزی میں کچھ کننگھم صاحب کے بارے میں اس سے کہا۔

مجھے جنرل اسپتال لے جایا گیا جو پاس ہی تھا اور میرے ماتھے پر پٹی باندھ دی گئی۔

جب میں گھر واپس گیا تو مارے غصے اور رنج کے میری ماں کا بُرا حال تھا۔ وہ اس طرح روتی جاتی پیٹ رہی تھیں جیسے میں مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں۔

باجی نے دھیرج سے کہا۔ "اب کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔"

ماں نے پوچھا۔ "لیکن اس ننھی سی جان نے کیا بگاڑا تھا اس کا؟"

باجی نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "کننگھم صاحب کہتے ہیں کہ اس نے مجھے گھورا...... اور بات یہ ہے کہ دوسرے صاحب لوگ کہتے ہیں کہ "بڑا صاحب سنکی ہے۔"

ماں نے سوچا کہ شاید گرودیو بابا نے کسی بُھتنے کی صورت نے مجھ پر ٹونا ٹوٹکا کر دیا ہے۔

اس حادثے کے بعد ایک اور واقعہ ہوا جس میں میری جان جاتے جاتے بچی اور میری ماں کو یقین ہو گیا کہ یا تو میرے ستارے گردش میں ہیں یا پھر کالی ماتا کسی گناہ کی سزا جانے کیوں دے رہی ہے۔

گرمیوں کی ایک دوپہر کی بات ہے۔

ہندوستان کو جھلسانے والا سورج صبح ہی سے وہ دھوپ پھینکے ہوئے تھا کہ اُجاڑ بنجیلی پہاڑیوں میں نگاہ اٹھا کے دیکھا نہ جاتا تھا۔ سائے کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ ویران پہاڑیوں کے نیچے، ایک لمبے چوڑے میدان میں، جو دھوپ کی غضبناک کرنوں میں تپ کر سُرخ ہوگیا تھا، رجمنٹ کے لڑکے کھیلا کرتے تھے۔

مٹی پر ایک لکیر کھینچ دی جاتی اور دونوں طرف پانچ پانچ لڑکوں کی ٹولیاں ہو جاتیں، اور لڑائی کا کھیل کھیلا جاتا، کبڈی۔ ایک ٹولی میں سے، چھوٹا یا بکھا کے اشارے پر جو اپنی ٹولیوں کے لیڈر رہتے، ایک کھلاڑی پار کرتا اور دوسرے کی عملداری میں گھس جاتا، جیسے قدیم ہندوستان میں گھوڑا، جو کہ جنگ کی علامت ہے، ایک ریاست سے دوسری ریاست کی سرحد میں بھیجا جاتا تھا۔ وہ برابر کہتا جاتا۔ "کبڈی، کبڈی" اور اس کے حملے کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہوتا کہ وہ مخالف پارٹی کے کسی لڑکے کو ہاتھ کو تیز چلا کر یا پاؤں کی ضرب، مار کر، مار آتا ہے یا نہیں۔ اور اس کی ناکامی یہ تھی کہ مخالف پارٹی والے اس کو پکڑ لیتے۔ جب تک وہ "کبڈی، کبڈی" کہتا رہتا، زندہ رہتا، لیکن جب وہ اپنے کو چھڑا نہ پاتا اور اس کا دم اکھڑ جاتا تو وہ "مر جاتا"۔

میں بیچ کی لائن کے ایک سرے پر ایک بڑے سے گرم پتھر پر بیٹھا ہوا تھا اور چلا چلا کر ہیرو ٹولی کے حملہ آور لڑکے کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ لڑکوں اور خاص طور سے بینڈ مین کے لڑکے علی اور [illegible] دھوبی کے لڑکے رام چرن نے مجھے کھیل میں شامل کرنے کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس دن بھی کہا تھا کہ میں بہت چھوٹا ہوں۔ اور میں اس بات کو بھی

بھولا ہوا تھا کہ میں اپنے آپ ہی ننگا بن گیا تھا۔ نہ کوئی میری رائے پوچھ رہا
تھا اور نہ کسی کو میرے پڑھانے کی ضرورت تھی۔ بہرحال میں کھیل پر دھیان
جمائے بیٹھا ہوا تھا اور جب بھی کوئی لڑکا دوسری عملداری پر حملہ کرنے کے لیے
بڑھتا تو میں پوری دوڑ لگا کے پہنچتا۔ اس کی مدد کرتا اور اپنے جسم کو اس طرح
ہلاتا جیسے لنگوٹ چڑھا کر خود جا کے میں خود ہی حملہ کر رہا ہوں اور منہ ہی منہ میں
کبڈی کبڈی کا منتر پڑھتا جاتا۔

میری ماں جانے کب سے دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی تھیں اور کچھ دیر سے ہم لوگوں
کو کھیلتے دیکھ رہی تھیں بالکل اسی طرح جیسے فاختہ اپنے گھونسلے کے پاس بیٹھی ہوئی
ہے اور نظر رکھتی ہے کہ اس کے بچوں پر کوئی مصیبت نہ آئے۔ پھر شاید ان کے
بچکانہ منظر پر نظر جمائے ہوئے وہ میرے اور کھیل ہی کے سلسلے میں سوچتی رہی
ہوں گی اس لیے کہ انھوں نے ہم لوگوں کو پکار کر کہا کہ جلتی زمین پر کھیلیں اور
گھر آ جائیں۔ نہیں تو کم از کم جوتے تو پہن ہی لیں۔

"آ جا۔ بیٹا کرشنا اندر آ جا۔" انھوں نے چلچلاتی دھوپ کو دیکھتے ہوئے
جیسے مجھ ہی سے آواز دی۔

لیکن میں اسٹری کے لڑکے رحمت اللہ کی زد دار الزائل دیکھنے میں ایسا کھو
تھا کہ میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ رحمت اللہ چھوٹا کی عملداری میں پکڑ لیا گیا
لیکن وہ کبڈی، کبڈی کہتا رہا اور مرا نہیں۔ اس میں جانے کہاں کا دم تھا جو
سانس ٹوٹتی ہی نہ تھی۔

میری ماں نے پھر پیار سے بلایا۔ "بیٹا کرشنا آ جا اب دیر نہ کر۔" انھوں نے

شاید کسی بڑے رشتے کو اپنے جیسے چار کے بوجھ تلے دبا اور جیتا دیکھ لیا تھا اور انھیں یہ ڈر لگا ہوگا کہ کہیں یہ چیز ایک طرف کو لڑھک نہ جائے اور میں ان کے نیچے کچل نہ جاؤں۔

لیکن بہت جلد اس کی سانس ٹوٹ گئی اور وہ "مر گیا"۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔ چھوٹا اور بانکا نے اپنی اپنی ٹولی کو نئے کھیل کے لیے تیار کر لیا تھا۔

میں بھاگ کے اپنی ماں کے پاس گیا کہ انھیں بتا دوں کہ میں بہت اچھی طرح ہوں۔ لیکن وہ مجھے وہاں ملی نہیں اور میں نے جو پھر سے کبڈی کبڈی کی آواز سنی، تو میں لوٹ کر اپنے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس بار رام چرن نے حملہ کیا تھا، اور میں دم سادھے ہوئے دیکھتا رہا کہ دشمن اس پر بھی ٹوٹ پڑے تھے۔

رام چرن جیسے ہی پکڑا گیا اس نے چلّا کر چیخنا شروع کیا: "بے ایمانی، بے ایمانی۔ جنگلی بانکا کو مجھے پکڑنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس نے مجھے چھو ڈالا۔"

"جا بے سالے" بانکا نے چڑ کر جواب دیا۔ وہ اٹھ کے پھر کھڑا ہو گیا اور رام چرن کو اس نے دوسری طرف دھکیل دیا۔

بانکا کے دھکے سے سنبھلتے ہوئے رام چرن چلایا: "ارے مجھ سے ذرا آ تو، اس سالے جنگلی کو نکال باہر کریں۔ میری ماں تو مجھ سے پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کے ساتھ نہ کھیلنا، حرامی کہیں کا!"

"چپ بے" بانکا نے کہا۔

اس پر رام چرن نے ایک پتھر اٹھا کر بانکا کو مارا۔ بانکا خالی ہٹ گیا اور

وہ پتھر سیدھا آ کر میری گدّی کے اوپر لگا۔

میں چکرا کے گر گیا۔ میرے سر سے خون بہہ رہا تھا اور میں خون دیکھ کے رونے لگا۔ رام چرن، سمی، بچھو بابا اور دوسرے لڑکے بھاگ گئے کرسا فرگو بڑے بوڑھے اور سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بس گنیش، بانکا، رحمت اللہ اور اس کا چھوٹا بھائی عصمت اللہ رہ گئے۔ بانکا نے اس بار ذرا بھی سوچ بچار نہیں کیا، جیسے کہ آپ نے لاہور جانے میں کیا تھا، اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور گنیش دوڑ کر ایک پیالہ لانے کے لیے کہ میرے سر سے جو خون بہہ رہا ہے اسے، ہائے، میری چیخ سن کر اماں دروازے پہ آگئی تھیں۔

"ہائے، ہائے!" وہ اپنی چھاتی اور سر پیٹ پیٹ رونے لگیں، جیسے مجھے دیکھ کر ان کا کلیجہ پھٹا جا رہا ہو اور وہ اپنے آپ کو کوس رہی ہوں کہ کیوں انھوں نے مجھے گھر بلایا تھا جو اس کی نوبت ہی نہ آتی، اور وہ سارے لڑکوں کو کوسنے لگیں۔

"وائے تمھاری کھٹیا نکلے، کینو، میرے بیٹوں پہ مصیبت لے آئے۔ وائے بچیا، ہائے رے، تو نے اسے چھوڑ دیا اور رحمتیا تو نے بھی اسے نہ بچایا!" گنیش نے بتایا: "لیکن اماں یہ لوگ تھوڑی تھے، وہ تو گلا بودھ سین کے لڑکے رام چرن نے پتھر مارا ہے۔"

"جانے، ہائے رام خود، پچاس شنشدوں کی صفائی دیجیے۔ آنے دے اس کے باپ کو، تیری بڑی پسلی ایک کر دیں گے.... ہائے میرا بیٹا، میرا لال، خون کا تڑیڑا لگا ہوا! اسے میں کیا کروں! تو ان کمبختوں کے ساتھ کھیلنے کیوں گیا تھا؟"

"لاؤ اسے مجھے۔ اب نہلانا تو پڑے گا ہی!" انھوں نے بانکا سے کہا۔

جنگل کے لڑکے نے مجھے ماں کی گود میں دے دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، غصہ تھا، جھنجلاہٹ اور پچھتاوے کے زور میں ماں نے میری پسلیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔ "کیوں گیا تھا کمبخت اپنی جان ہلکان کرنے؟ کیوں گیا تھا گھر بھر پر ایک نئی مصیبت لانے؟"

میرا ہول اور بڑھ گیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ بلک بلک کر رونے لگا۔ میرے زخم سے جہاں سے خون نکل رہا تھا اور اس سے زمین پر گڑھل کے پھول بن رہے تھے، اس جگہ گنیش نے تیل کا کنڈا لگا دیا۔

جب ماں نے مجھے اندر لیجا کر چارپائی پر لٹایا تو خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ اور سارے کپڑے تر ہو گئے۔

ماں بالکل پاگل سی ہو کر رونے لگیں: "ارے میرے لال، تیرے پیدا ہوتے ہی کس کی بددعا ہمیں لگ گئی، جانے کن کرموں کی سزا مل رہی ہے؟" پھر انھوں نے مجھے پیٹ کے بل لٹا دیا اور خون بہنا شاید رک گیا۔

ماں جا کے ایک کپڑا لائیں اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے پٹی باندھ دی، لیکن کٹورا بھر خون جو ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اسے دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو گئیں۔ کوس کوس کے رونے اور سینہ پیٹنے لگیں اور میں صحن میں چارپائی پر لیٹا کراہ رہا تھا۔

میرے چیخنے چلانے سے ننھا شبو جاگ گیا تھا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی گئیں اور گنیش مجھے پنکھا جھلتا رہا۔

میرے ہوش بجا نہ تھے، میں اپنا سر کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف

کر دیتا یہاں تک کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور اس کے بعد مجھے جو بات یاد ہے وہ یہ ہے کہ میں رجنٹ اسپتال میں تھا۔ منہ پر کپڑے باندھے ہوئے لوگ مجھے گھیرے ہوئے تھے اور دواؤں کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور لوہے کے اوزاروں کے کھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور پھر مجھے ابا جی کے غضبناک آواز یاد ہے۔ انھوں نے مجھے گود میں اٹھایا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ رات کے پرسکون اور پرکیف باغ میں، میں درد اور تکلیف سے رو رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔

ایک دو ہفتے تک میری جان پر بنی رہی۔ نوکیلا پتھر میری کھوپڑی کے پچھلے حصے میں کوئی آدھا انچ اندر گھس گیا تھا۔ چوٹ میں، اور آپریشن کے بعد اتنا خون بہہ گیا تھا کہ میرے بدن میں بالکل جان نہ رہ گئی تھی۔

پھر مجھے بڑا سخت بخار چڑھا اور میں سرسامی کیفیت میں پڑا ہوا تھا۔ سر پر بندھی ہوئی پٹی میں سے دوا کی تیز اور ناگوار بو آ رہی تھی۔ سوکھے ہوئے کانٹے پڑے ہوئے حلق تک اس طرح کا مزہ ہو رہا تھا جیسے کسی منہ دھوئے سے پہلے ہوتا ہے۔ اور کمزوری کی لہریں سر تک پہنچتیں تو میں کراہنے لگتا اور ہر بار اپنی ماں کا سہارا ڈھونڈتا۔ "ہائے اماں"! اب وہ ہر وقت تو میرے پاس بیٹھ نہ سکتی تھیں، اس لیے میں پڑا پڑا شمشیروں اور صفیہ کی ہوئی دیا کو سر کھاتا۔ بعض وقت درد بہت شدید ہو جاتا اور میرا دم گھٹنے لگتا اور میں کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتا۔ چنانچہ بار بار یہ ہوتا کہ مجھے چارپائی سے

اتار کر زمین پر لٹا دیا جاتا کہ ہندو روایت کے مطابق آدمی کی آخری گھڑیاں دھرتی ماتا کے چرنوں میں گزریں اس لیے کہ — "تو بندۂ خاکی ہے اور خاک میں جائے گا۔"

معلوم ہوتا ہے میں بڑا سخت جان تھا، ہڈیوں میں کہیں نہ کہیں بڑی طاقت تھی، اس لیے کہ جب کئی بار مجھے آپریشن ٹیبل پر لیجایا گیا اور کرنل بیلی جنھیں میں نے رجمنٹ اسپتال میں اکثر سلام کیا تھا، مجھ پر جھک کر میرا زخم کھولتے اور ایک لمبی سی سوئی سے اسے ٹٹول کر دیکھتے اور نئی پٹی باندھتے تو میں ڈرا ہوا چپ چاپ لیٹا رہتا، شاید موت کے خوف نے میری رونے کی صلاحیت کو ختم کر دیا تھا۔

اور گھر کی زندگی کے بارے میں میرے اندر نے بہت پیچھے پیوند جڑ گئے تھے اور کمزوری کی دھندلی نقاب میں سے میں لوگوں کے چہروں پر گہرا دکھ دیکھتا مگر یہ نہیں سمجھتا تھا۔ ایک انجانی روشنی میں اپنی ماں کے چہرے کو دیکھتا جس پر شفقت بچھتاوا تھا کہ چوٹ لگنے کے بعد بھی انھوں نے مجھے مارا۔ اور بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے مجھے ان دنوں کا خیال آتا جب بیمار بچے کی حیثیت سے میرا جو لاڈ پیار ہوتا ہے وہ ختم ہو جائے گا اور مجھ پر یہ الزام لگایا جائے گا کہ میں نے گھر بھر کو مشکل میں ڈال دیا، جب مجھ پر پہلے سے بھی زیادہ مار پڑنے لگی، جیسے گنہگار پر پڑتی ہے، ہاتھوں سے، کرکٹ کے بلے سے اور ہاکی اسٹک سے...... لیکن ایسے وقت میں مجھے باجی کی آنکھوں میں وہ پریشانی اور تشویش یاد آتی جو اس وقت ہوتی جب وہ مجھے اسپتال لیجاتے اور وہاں سے واپس لاتے، اور اماں کا رونا، اور مجھے امید ہوتی تھی کہ یہ لوگ مجھے معاف کر دیں گے۔ اپنے بیٹے

تب بیٹھ کر اپنی ماں کو، روتے سنتا، ایسا لگتا جیسے دور سے میرا نام پکارنے کی بھی سی گونج آ رہی ہے۔ اور اس طرح اپنے آپ پر مجھے جو ترس آتا تھا وہ میرے والدین کے لیے رحم میں تبدیل ہو گیا اور میں باوجود اس کے کہ جسمانی چوٹ کو بھولا نہیں تھا پھر بھی میں نے ہر ایک سے ایک طرح کی مستقل محبت اور ہر ایک کے لیے رحم کے جذبے کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کر لیا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس جان نے جو میری ہڈیوں میں رہی ہوگی زور پکڑنا اور رنگ لانا شروع کیا۔ مثلاً میں نرس بیلی کے ہاتھ سے چھپاتے ہوئے نشتر اور چھٹیاں چھیننے کے لیے ہاتھ اٹھانے لگا۔ مجھے یاد آتا کہ پہلی بار جب میرے زخم کی پٹی بدلی گئی تھی تو ان چیزوں سے کتنی سخت تکلیف پہنچی تھی اور اب کی بار میں نے طے کر لیا تھا کہ انھیں یہ چیزیں اپنے اوپر نہ استعمال کرنے دوں گا۔ بیہوشی کے بغیر میں سرجن کو لانگ سلائیڈ استعمال نہ کرنے دیتا۔

کمزور قامت کے زیر اثر بے بس ہو کر میرا دماغ بھٹکنے لگتا، اور خیالی نشتروں سے خیالی لڑائیاں لڑتا۔ ان پراگندہ خیالیوں میں سے ایک مجھے اب تک صاف طور سے یاد ہے: میں ایک کھودتے ہوئے گڑھے کے پاس بیٹھا تھا اور چمکتے ہوئے سفید دانتوں والی ایک کالی بدصورت جھتنی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ مجھے ایک تختے پر سے اٹھا کے چونکہ اب میں بڑا زبردست ہو گیا تھا اور جھتنی مجھے اٹھا تو سکتی نہ تھی، اس کھودتے ہوئے گڑھے میں ڈال دے گی۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا: میں اس کو چمٹ جاؤں گا، جس طرح کشتی لڑنے والے سپاہی کرتے ہیں، اسی طرح

میں بھی اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر اُسے بھی کو کھائی میں گرا دوں گا۔ وہ آ رہی تھی۔ آ گئی ——— میں نے اسے پکڑ لیا۔ زور لگاؤ۔ سارا زور۔ اسے یہ وہ! میں نے اسے کھائی میں گرا دیا اور اب وہ تیل میں تل جا رہی ہے۔ اور میں نیچے۔ لیکن ——— لیکن کرنل بیلی اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہہ رہے تھے: بس بس، اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اور انہوں نے میرا سر پکڑ کر سینے سے لگا دیا، اور میری آنکھیں نیند کے مارے کھل نہیں رہی تھیں . . . . . اور بعد کو جب میری آنکھ کھلی تو میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، نتھنے پھڑک رہے تھے، دل بڑی بے چینی سے دھڑک رہا تھا، اور میری نگاہیں کمرے میں بھٹک رہی تھیں کہ کوئی ہو جسے میں چھو لوں، پاس محسوس کروں، پکڑ لوں۔ سہارا لوں۔ میں موت پر غالب آ رہا تھا۔

"ماں، ہائے میری ماں" میں نے آواز دی۔ اس لیے کہ میں اس قدر ان کا محتاج ہو گیا تھا کہ بعض وقت ان کے بغیر میرا کام چلنا دشوار تھا اور اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

"ماں! کیا ہے۔ میرے لال" انہوں نے آتے ہی مجھے پیار کیا اور مجھ پر جھک گئیں، ان کی ساری کی ساری نرمی، اور وہ دھندلی چھٹ پڑی اور ان کا سارا پیار، اور مرحم امید و بیم کی ایک جھلک میں جلوہ گر ہو گیا۔ "کیا بات ہے، کیا ہے بیٹے؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں" میں نے ہمیشہ یہی جواب دیا۔ اس لیے کہ گرمیوں کے تو نئے دن تھے اور بچپنے کے دن بھی آخر تھے۔

اور میری ماں ہمیشہ مجھے گرم گرم دودھ دیتیں جسے دیکھتے ہی مجھے متلی ہونے لگتی تھی۔ لیکن میں ان کا بڑا احسان مند ہوتا تھا، خاص طور سے ایسے وقت میں جب میں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس آنے کے لیے شبو کو اکیلا چھوڑ آئی ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ میں جتنا ان سے پیار کرتا ہوں اتنا کبھی کسی کو نہ چاہوں گا، اس لیے کہ جب میں موت کے منہ میں تھا تو انھوں نے جیسے کھلی ہوئی آنکھوں میں کاٹ دی تھیں۔ ان کی زبان سے ہمیشہ اتنا ہی نکلتا۔ "میں تجھ پہ قربان!"

پہلی صورت، مجھے تقدیر نے آزمائشوں میں مبتلا کر دیا تھا جو ذرا سی بات پر خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی۔ جیسے کہ ہر زندہ دل بندہ اس پر شدت کے ساتھ طاری ہوتا ہے جو تنگ دائروں میں نقل و حرکت کرتی ہے، یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو آگے سامنے سر جھکانے کو اپنا شعار بنا لیتی ہے، کسی بہت شدید چوٹ پر بھی پانی پانی نہیں ہو جاتی بلکہ ایک چٹان کی طرح قدم جمائے رکھتی ہے، مرد کی صورت میں دوسری طرف وہ زیادہ مجھے اپنے اندر سمو لینے کی عادی نہیں ہوتی۔ پھر بھی اپنے بچوں کو اسی طرح اپنے دامن کے نیچے سمیٹے رہتی ہے جیسے ہا کرتے ہیں: ماں کی محبت اور مرغی کا احساس بھی کر سکتا ہے۔ اسی لیے اسے مزید پریشانیوں میں مبتلا کرنے کے لیے وہ پہلے سے سوچتا ہے، عجیب کی بات نہیں ہے کہ باوجود تمام خطروں کے ماں اور بچے کا بنیادی رشتہ نوع انسانی میں اب تک برقرار ہے جبکہ بہت سے دوسرے بنیادی اور ابتدائی جذبوں کو علم اور شرم کی صورت دے دی گئی ہے۔

جب گرمیوں کا تیز و تند موسم نرم و لطیف سے ہو کر خزاں کی حدود میں داخل ہوا اور روشن خشک دنوں کی ابتدا ہو گئی تو میری ماں مجھے باہر نکال کر کھلی ہوا میں لانے لگیں۔ وہ اپنی گود میں لٹا کر گرم تیل کی مالش کرتیں تاکہ میرے کمزور جسم میں کچھ جان پڑے۔ میرے سر میں اتنا درد ہوتا کہ کبھی کبھی میں رونے لگتا۔ وہ کہتیں: "دوست بیٹا، اب تو مرد ہو گے اتنی ذرا سی چوٹ پہ چلاتا ہے، ابھی تو تجھے جانے کیا کیا جھیلنا پڑے گا۔ مت رو، میرے بچے۔"

اور جب وہ سرد ہوا کی خنکی کو محسوس کرتیں اور دن کی مدھم پیلی ہلکی روشنی میں چڑیوں کو بسیرے کے لیے اڑ کر جاتے دیکھتیں تو ان کے چہرے پر شکر اور احسان مندی کے آثار نمایاں ہو جاتے کہ میں اچھا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بے شمار دیوی دیوتاؤں کے نام لے کر دعا کرنے لگتیں۔

اس لیے کہ میری طویل بیماری کے دوران میں بے شمار خداؤں پر ماں کا عقیدہ کچھ بے چیز متوازن صورت اختیار کر گیا تھا کہ وہ مانتی تو ایک ہی خدا کو تھیں لیکن ڈر ڈر کے گر یہ نہ کہہ سکتی تھیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں ہے۔ ہر مذہب کے خدا اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی موٹی علامتوں، تصویروں، اشیا، اور عقیدوں کے مرکزوں کو وقتی طور پر باری باری سے سب سے بڑے خدا کا درجہ دیا گیا اور اس سے دعا کی گئی کہ وہ میرے زخم کو پر کر دے۔ بلکہ وہ تو ان متعدد خداؤں سے اتنی مرعوب تھیں کہ وہ ایک ہی سانس میں ان میں سے بیشتر کے نام لے ڈالتیں اور ان سب کا تصور انھوں نے اتنا واضح بنا رکھا تھا کہ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں کے بیچ ہی میں رک جاتیں اور ان میں سے کسی ایک کے

اس طرح اپناد کو وہ وہ کہہ جاتیں جیسے کسی سے دو بدو باتیں کر رہی ہوں، پھر گھٹنوں کے بل ہو کر سجدے میں گر جاتیں اور اپنے خیالی خداؤں کی بارگاہ میں اپنے دل سے بنائی ہوئی دعائیں کرتیں اور بیچ بیچ میں ٹیپ کا مصرعہ یہ ہوتا "میرے بچے کو اچھا کر دے۔ اگر میرا بچہ اچھا ہو گیا تو......"

اور ان خداؤں سے دعائیں مانگنے کے علاوہ وہ ہر قسم کے گنڈے تعویذ، ٹونے ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک بھی کراتی تھیں جو ہندوستان کے پنڈت اور مولوی کیا کرتے ہیں اور توہم پرستی کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

محلے کے ایک بہت پنڈت جی رام، جو ڈاڑھی مونچھیں اور سر منڈائے اور سفید کپڑے پہنتے تھے، اور جنہیں صاحب لوگ اتنا مانتے تھے، آئے اور انھوں نے مجھ پر کچھ گنگا جل چھڑکا اور ہون کی آگ میں گھی اور چاول ڈالے اور منتر اوپر سے پڑھے اور یہ سب انھوں نے صرف پانچ روپے کے عوض میں کیا جو کہنے کو تو دیوتاؤں کے خزانے میں جانا تھا، لیکن جس سے دراصل ان کے لیے چینی نسر کا ایک بڑھیا جوڑا بن گیا۔

میری پھوپھی اماں گزر رہی، جو اپنے سامنے گلے شکوے قبول کرا کے آڑے وقت میں ان کے کام آ رہی تھیں اور جانے یہاں وہ آ گئی تھیں، یہ صلاح دی کہ اگر شہر کے حکیم صاحب گرو گر محمد صاحب کا پاٹھ کریں اور لڑکا پرشاد (صوفی کا حلوہ) بٹوایا جائے تو میں بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ بیچاری نے یہ لگا کر یہ بھی کر لیا۔ سالا محمد بننے والی عورتوں میں سے کسی ایک نے اس لفظ ترجمہ کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔ وہ اتنے ہی پر بہت خوش تھیں کہ خیر بابا

باری سے گر، ڈاکٹر تھڈ صاحب پر مرہم پٹی کرے۔ وہ موقع مل رہا تھا اور خاصہ جی نے پشاور کے صوبے میں سے سب سے پہلا اپنا جامہ نکال کر رکھا یا اور چکنائی لگے ہاتھوں کو داڑھی پر مل لیا تاکہ اصلی گھی ضائع نہ جائے۔

مل کی اماں، اپنے موٹے بیٹے واجہ کو موٹے سوتی پتے میں چھپائے ہوئے بھاگے دیکھنے آئیں اور یہ اعلان کیا کہ اسلام کی رو سے تو یہ ہے کہ اگر میرے سر پہ گوشت آتا، کہ چیلوں کو کھلا دیا جائے تو میرے سر سے بلا ٹل جائے گی اور میں اچھا ہو جاؤں گا۔

اکمل، اس عورت کی طرح جو فکر اور غم سے نیم پاگل ہو رہی ہو میری اماں ہر ایک کی بات مان لیتیں۔ اور انھوں نے نہ صرف یہ کہ چیلوں کو بوٹیاں دیں بلکہ میرے ہاتھ سے تیل چھوا کے فقیروں کو دیا، بھک منگوں کو کھانا کھلوایا، منت کے پوچھ جانے چڑھائے اور یہ منت مانی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو گنگا کے کنارے ہردوار کی یاترا کرنے جائیں گی۔

لیکن میں اچھا ہوا تو کسی معجزے سے نہیں بلکہ سرجری سے۔ بائیں پنڈلی میں میرا زخم بھرا...... ویسے میری اماں کا کہنا یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی دوا میں اور مرہم انگریز کو ہندوستانی جڑی بوٹیوں سے بنی تھیں اور جانے کتنی صدیوں کے نانیوں دادیوں کے تجربوں سے چرائی گئی ہے۔ اس لیے کہ جب کلکٹر صاحب نے اپنی غلیل سے پتھر مار کر میرے ہاتھ پر چوٹ لگائی تھی اور جو رام جی کے پتھر سے زخمی ہوئے وہ بھی خیر تھا۔ تبھی سے انگریزوں کی طرف سے ان کا رویہ ایک وقتی تعصب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

۶

جب میں بستر پر سے اُٹھا تو دبلا سوکھ کے کانٹا اور بے جان ہوگیا تھا معلوم ہوتا تھا قبر سے اٹھا چلا آرہا ہوں۔ مشکل چلا جاتا تھا اور چلنے کی کوشش کرتا تو چکر آنے لگتا تھا۔ میں بیٹھتا تو مارے کمزوری اور بے بسی کے سُن سا ہوجاتا اور سارے وقت میرے منہ کا مزا بڑا خراب رہتا۔

لیکن دھیرے دھیرے سوپ اور ٹانک، کاڈلیور آئل جس سے مجھے نفرت تھی اور جو زہر کے شربت سے، جو ڈاکٹروں نے تجویز کیا تھا، اور تیل کی مالش اور نہانے سے جس پر ہماری اماں کو اعتقاد تھا، میری ہڈیوں میں دوبارہ طاقت آگئی۔

لیکن بیماری مجھ پر ایک مستقل نشان چھوڑ گئی۔ ہر چیز اور ہر شخص سے مجھے ایک عجیب وغریب قسم کا ڈر لگنے لگا اور میں بالکل چھوئی موئی کے پودے کی طرح نازک مزاج ہوگیا۔ ذرا سی بات پر میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ پہلے جیسا ہنس مکھ اور تندرست بچہ میں پھر کبھی نہ بن سکا۔ اور موت کا خوف، ایک گہری سی دہشت جو بیماری میری روح پر ایک سیاہ داغ کی طرح چھوڑ گئی تھی، ہمیشہ کے لیے دل میں گھر کر گیا۔ اس کی وجہ سے میرا شوق اور تجسس بڑھا، نئے تجربے کر لینے کی اُمنگ اور جوش پیدا ہوا۔ دونوں باتوں سے میں نے زندگی کو نبھانا سیکھا۔ لیکن اس سب پر بھی میرے اعصاب تنے رہتے، میرا جسم ہاتھوں کی محنت کا ساتھ نہ دے پاتا۔

اپنی بیماری کے بعد کے دنوں میں میں ہر چیز کی طرف اس طرح لپکتا جیسے بچہ کسی رنگ برنگے کھلونے کو دیکھ کر لپکتا ہے۔ میں صبح کو دالان میں ایک چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا۔ میرے پاؤں پر کمبل پڑا ہوتا۔ سورج نکلتا اور صحن کے اس سرے پر لگے ہوئے سورج مکھی اور گل داؤدی کے پھولوں کو آگ لگا دیتا۔ یہ پھول آپ نے اپنے چھوٹے سے باغ میں سوزن کے ان بیجوں سے لگائے تھے جو ولایت سے صاحب لوگوں کی ڈاک میں آیا کرتے تھے۔ میرا جی چاہتا کہ میں دوڑ کر باغ میں پہنچ جاؤں اور پھاوڑا لے کے زمین کھودنے میں ابا کی مدد کروں یا اپنی اماں کے لیے گلاب کے پھول توڑ لاؤں تاکہ وہ دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں چڑھا سکیں۔ میں نے شیشے کے بہت سے کھلونے توڑ دیئے لیکن اتنے سے میرا جی نہیں بھرا۔ میرا جی چاہتا کہ میں جا کے لڑکوں کے ساتھ کھیلوں اور جب ہال کے باہر سے کوئی اٹیشن کر پکارتا تو یہ آواز سن کر میرا اسکول جانے کو بہت ہی جی چاہتا۔

میری کمزوری اور کاہلی کی عادت ہر چیز کو نگلنے پر آمادہ تھی۔ زندگی کے ابتدائی دور کے بعد جب میں گم دہشتیں اپنی ہی ذات میں مگن رہتا تھا اور ساری دنیا کو یہ سمجھتا تھا کہ میری ہی خواہشوں کو پورا کرتی ہے۔ جب لوگوں اور باہر کی چیزوں کو میں اپنا تصور اور کھلونوں کی نظری حرارت سے سمجھا اور سمجھا کرتا تھا اور دور دراز جب میں نے بات کرنا سیکھا لیکن اس صلاحیت کا استعمال اپنے اظہار کے لیے کرتا تھا۔ اور اب میں نے اپنے پیروں اور دیکھنے کے ذریعے باہر کی دنیا کو زیادہ شدت کے ساتھ جذب کر کے اپنی ہی ذات میں گم ہو جانے کے لیے ریشم کا کویا سا بنتا۔

شروع کر دیا تھا۔ ہر کسی چیز کے متعلق یہ مان لیتا تھا کہ بس یوں ہی ہے۔

سارا دن میں اپنی ماں پر سوالات کی بوچھار کیے رہتا۔ اور وہ جب خاموش، بڑی دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی بیٹھی رہتیں تو میں ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان سے سوال کرنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ ضد کرتا۔ "اماں ستارے کیا چیز ہیں؟" "اور سورج کے جب پاؤں نہیں ہیں تو پھر سارا دن چلتا کیسے رہتا ہے؟" اور "بادل کہاں جاتے ہیں؟" میں ان کو عاجز کرتا اور جب وہ بس اتنا ہی کہتیں "بیٹے سو جاؤ، تھوڑا آرام کر لو" تو میں بادلوں کے ادھر اُدھر بھٹکتے ہوئے ٹکڑوں میں مردوں، عورتوں اور جانوروں کی شکلیں ڈھونڈنے لگتا اور آسمانوں میں دیوی دیوتاؤں کی تخلیق کے بارے میں اپنے نظریات قائم کرنے لگتا۔ صرف ایک بار مجھے یاد ہے اماں نے میرے اس طرح کے سوال کا جواب دیا تھا۔ میں نے اماں سے پوچھا تھا، "اماں آسمانوں کے اس پار کیا ہے؟" اور انھوں نے کہا تھا۔ "بیٹے وہاں برہم دیوتے ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے دیوتا اور اپسرائیں ہیں۔" اس بات سے بادلوں کی شکلوں کے بارے میں میرے تاثرات کی تصدیق ہو گئی۔ اور بہت بعد تک، میں نے اسکول میں جغرافیہ بھی پڑھ لیا پھر بھی میں دل سے بادلوں کی ہیبت کو خاص طور سے سہ پہر اور شام کو بادل دیکھ کر جو دہشت طاری ہوتی تھی اسے نہ نکال سکا۔ ان دنوں کے یہ دو تاثرات میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔

شملہ میں اس عجیب و غریب اور جسمانی خوشی کے ناقابل بیان احساس کو

کبھی نہ بھول سکتا جو مجھے اس وقت ہوا جب ننھی ایڈورڈ آکرمن کی بارہ سال کی
زندگی رکھنی نے مجھے اپنی گود میں لیا۔ وہ خود ایک چیتی ہرنی جیسی تھی۔ گردن پر
سیل جما ہوا گڑوں کی شکل کا نوکیلا چہرہ جس کی لطیف آب مخملی رنگ شفاف
تھی، اور اس کے لمبے لمبے بالوں کی دو چوٹیاں کندھوں پر پڑی رہتی تھیں۔
اور ان کا رنگ اس کی دنبالہ دار آنکھوں کی طرح سیاہ تھا۔ تعجب ہے کہ مجھے
جسم کی آگ کا احساس اتنی کم عمری میں ہو گیا تھا، لیکن جس وقت میں اس کی
گردن سے چمٹا ہوا تھا اور اس کے کولہوں پر اپنے کول لگائے اس کی اُبھرتی
ہوئی چھاتیوں کا دباؤ محسوس کر رہا تھا اور اس کے لمبے لمبے ہاتھوں کو چھو رہا تھا،
اس وقت اچانک مجھے ایک عجیب غریب اور وحشیانہ سرخوشی کا احساس ہوا،
کچھ ویسا ہی جیسے کہ اس وقت ہوا تھا جب آگ اور دیوی کی مورتی نے مجھے
رُلا دیا تھا۔

جب میں پیروں سے چلنے کے لائق ہو گیا تو ہم لوگ گھر کے دوسرے
سرے پر ہال میں جا کے آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ میں چھپ جاتا اور رکنی مجھے
ڈھونڈا کرتی، لیکن مجھ سے زیادہ دیر تک چھپا نہ رہا جاتا اور میں خود اپنے
آپ کو ظاہر کر دیتا اس لیے کہ ہر بار جب وہ مجھے پکڑتی تو مجھے گود میں اٹھا لیتی
تھی، مجھے گدگداتی اور مجھے بار بار اس خوشی کا احساس ہوتا جس نے مجھ
میں بہت دنوں بعد تک خوشی بھر دی۔

رکنی مجھے لیے اس جگہ جاتی جہاں ہماری دو نوکرانیاں کی ... کی
دھوپ میں بیٹھی بیٹھی ... ہوتیں یا ... اور ... تھی

جاتیں اور گپ ڑاق رہتیں، اور وہاں وہ دوسرا کھیل شروع کرتی۔ ایک خیال مجھے
میں کھانا پکانے کا سوانگ کرتی (شیشے کے کھلونوں سے برتن بھانڈوں کا کام
لیا جاتا، مٹی کی عجیب بنا کے اسے روٹی سمجھ لیتے اور کنکریوں، پھولوں اور پتوں
سے طرح طرح کی سبزیاں اور سالن بن جاتے۔ اور اگر میری اماں نے وقت پہ
مجھ کو چیتا نہ دیا ہوتا تو میں نے یہ کھانے کھا بھی لیے ہوتے۔

اس فریب پہ پوری طرح یقین کر کے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے ان
کے دو جھلنگا پلنگوں کو جوڑ کے، جو صحن میں کھڑے ہوئے تھے، خیمہ سا بنا لیا اور
ان کے اوپر اوڑھ چادریں ڈال کے اپنا سا گھر بن گیا اور پھر اس زندگی کو
جزئیات سے پورا کرنے کے جیسے دلہن بہن کا طریقہ تھا۔ کیا میری جگہ
زیادہ تر چھوٹے والدین کی زندگی سے لی گئی تھیں اور خاص کر لڑائی جھگڑوں
پر مشتمل تھیں اور پھر ان کو ہم اتنی فنکارانہ واقعیت کے ساتھ برتتے اور خاص طور
سے جب، کسی کا جھوٹا کھینچنا ہوتا تو میرا کا ہی اس قدر سے کھینچتا کہ دوسری
دلہن بننے والی لڑکیوں کے اس گل میں میرے ساتھ بیٹے کا کھیل کھیلنے سے صاف
انکار کر دیتی۔ پھر ہوا یہ کہ ایک دن اماں کو ان چارپائیوں کی بات کا پتا چل
گئی اور جا کر یہ گھروندے پہ۔ چنانچہ اس کے بعد مجھے ایک نیا کھیل سوجھا،
کرنا پڑا جس میں میں کبھی ماسٹر جی بنتا، کبھی منشی تو کبھی چپراسی اور کبھی
ماسٹر بنتا اور پھر چھڑی لے کے، کبھی طالب علم بنتی اور ان سب کو چھیڑتی۔

میں اور میری بہن ایک اور کھیل کھیلتے تھے، جو بچوں کو زیادہ ... یہ ایک ایسا
کھیل ہے جو بڑا دولہا دلہن شادی کے فوراً بعد کھیلا کرتے ہیں، اور میرا خیال ہے

کو اس کھیل کو زیادہ پتا جوڑنے میں پیار اور محبت پیدا کرنے کے لیے اسے بڑھاوا دیا گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مجھے اس کے معنی مطلب کا کچھ پتہ نہ تھا لیکن شاید رُکمنی جانتی تھی حالانکہ جب اس نے اس کھیل کا مشورہ دیا تھا تو بالکل بھولی اور نادان لگ رہی تھی۔ شاید ہماری اسی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے ہماری ماؤں نے ہمیں یہ کھیل کھیلنے سے روکا نہیں بلکہ خوش ہو کے دیکھتی رہیں۔ بہرحال میرے لیے یہ اس نئی سلطنت کی ایک اور سیڑھی تھی جس نے بستر علالت کی یکسانیت تلخیوں سے دور قائم کر رکھی تھی۔

ایک کھیل یہ تھا کہ ہم چڑیاں پکڑتے۔ میں اور رُکمنی دالان کی ڈیوڑھی پر بیٹھ جاتے اور اپنے سامنے دال کے دانے ڈال دیتے، چڑیاں ذرا دور تاک کر دانے ڈر کے بغیر کھائیں، پھر جب وہ دانے چگنے لگتیں تو ذرا اپنے پاس دانے ڈالتے پھر اور پاس، یہاں تک کہ چڑیوں کو ہم پر اتنا بھروسہ ہو جاتا کہ وہ نڈر ہو کر ہماری ہتھیلی پر سے دانے اٹھانے لگتیں۔ بس اسی وقت ہم جھپٹ کر پکڑ لیتے اور پھر کسی کٹورے میں رنگ گھول کر اس میں انہیں رنگ دیتے، پھر اسے چھوڑ دیتے اور وہ پھر سے اڑ جاتی۔ ایک دن ہم چڑیا ہرا رنگ استعمال کرتے دوسرے دن گہرے لال رنگ میں رنگتے اور تیسرے دن بسنتی رنگ میں اور پھر نیلے رنگ میں۔ ہفتے کے سات دن میں ہم سات چڑیوں کو دھنک کے سات رنگوں میں رنگتے۔ اور جب ہم ان چڑیوں کو بادلوں کے اوپر اڑتے دیکھتے جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا، اور ہم یہ دیکھتے کہ چڑیاں ان رنگ برنگی چڑیوں کو دیکھ کر چہچہا جاتے ہیں اور اتنا

کے اوپر ہاتھ سے سایہ کرکے غور سے دیکھتے کہ ان کٹوریوں کو راتوں رات کیا ہو گیا ہے، تو ہماری خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ اور جب یہ رنگ بھری ننھی ننھی چڑیاں ہمارے آنگن میں اترتیں تو ہم خوشی سے چیخنے لگتے اور ہماری مائیں یہ ظاہر کرتیں کہ ہم نے جو آسمانوں کی بلندیوں میں رنگ بکھرائے ہیں اس پر صرف ہم ہی نہیں وہ بھی خوش ہیں۔

لیکن میری اور مکین کی خوشی صرف دن بھر محدود نہ تھی۔ اس کے پاس وہ بک بک کر اکڑوں بیٹھ کے ہتھیلی پر دال کے دانے لیے ہوئے ہاتھ پھیلائے اور دم سادھے اس کا انتظار کرتے کہ چڑیوں کو چاٹے اور پھر وہ سب ہو جائے۔ میری نگاہیں اس کی ہاتھی دانت کی رنگت کی ہتھیلیوں پر پہنچتی جن پر مہندی رچی ہوئی تھی اور پسینے کی ان بوندوں پر پہنچتیں جو اس کی ناک کی پھننگ پر ہیرے کی طرح جڑی ہوتیں اور میں اس ناقابل برداشت خواہش سے بے قرار ہو اٹھتا کہ اس کا منہ چوم لوں، اپنی بانہوں میں لے لوں۔ وہ ہر سو رنگ کی طرح بیٹھی ہوئی وہ نت نئے فرق، سوچ سوچ کر خود ہی خود مسکرایا کرتی اس لیے کہ اس وقت بول تو سکتی نہ تھی وہ میرے منہ کے پاس اپنا منہ لاکر چپکے چپکے مجھے نصیحت کرتی اور اس کی آواز [illegible] کی طرح ہوتی جس سے آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں،

"نکلے۔ بولو مت نہیں تو چڑیاں نہیں آئیں گی"

اور اس نے ہم کی [illegible] مجھ پر شرمسار کر دیتی۔ اور میرے لبوں پر خاموشی لگ جاتی، وہ بولتی، جیسے چھپا کے کہیں بیٹھنے والی بات کی شرم، اور میں اپنی زندگی بھولی، دوسری [illegible] کی طرف جھکا دیتا۔

اور پھر اگر اس کے ہاتھ پر کوئی گڑیا لاتی اور وہ پیچھے سے اپنی مٹھی بند کر کے لے آتی تو وہ اس کی نوکیلی چونچ کو میرے منہ کے پاس لاتی اور اپنے ہاتھ سے میرے گال اتنی نرمی کے ساتھ سہلاتی کہ چڑیا کی پریشانی بھی دور ہو جاتی اور اس چھوٹی سی جان کو اپنے ہاتھ میں لینے کی مجھے جو بے تابی ہوتی وہ بھی دور ہو جاتی تھی۔

ہمارے سروں پر خاموشی منڈلاتی رہتی اور اسی بیچ میں اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں دبی ہوئی گوریا کو چمکارنے اور ہاتھ پھیرنے کا موقع بھی حاصل کر لیتا اور پھر جب رنگے جانے کے بعد چڑیا ہمارے سروں پر سے پھر سے اڑ جاتی تو ہماری نگاہیں ملتیں اور ان میں ایسی خوشی ہوتی ہے اگر کوئی چیز بیان کر سکتی ہے تو وہ روشنی اور چمک جو ہماری آنکھوں میں ہوتی تھی۔

جب دھند کے تیز ہوتے ہیولے اور آسمان کو ڈھک لیتے، تاریکی گہری ہوتی جاتی اور مجھے سونے کے لیے جانا ہوتا تو میں اپنی ماں سے اصرار کرتا کہ مجھے پریوں کی کوئی کہانی سنائیں۔

میری ماں کو بہت سی لوک کہانیاں یاد تھیں، جو انھوں نے اپنے بچپن میں اپنی ماں سے سُنی تھیں۔ یہ قصے، حکایتیں، دیو مالائی کہانیاں، انسانوں چڑیوں اور جانوروں کی کتھائیں گاؤں کے کچے مکانوں کے کوٹھوں پر ہزاروں سال سے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ کہی جاتی رہی ہیں۔ لیکن چونکہ گیلی مٹی سے کھانا بچانے، راکھ سے برتن مانجھنے اور دوسرے گھریلو کاموں کو ان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل تھی اس لیے ان سے کوئی ضد کرتا

تب کہیں جاکے وہ اپنے کام دھندے چھوڑ کر کہانی سناتیں۔

میں ان سے خوشامد کرتا "اماں، سنا دو نہ ایک کہانی"

اور وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتیں۔ "ارے صاحب سو بھی جا، تو ابھی تک جاگ رہا ہے"

اور جب میں ان کے پیچھے ہی پڑ جاتا تو وہ بیٹھ کر مجھے، اس رانی کی کہانی سناتیں جسے ایک جادوگرنی نے گلاب کا پھول بنا دیا تھا، یا اس بچے کی کہانی سناتیں جو باتیں بہت بنایا کرتا تھا۔ یا اس بدمعاش ساہوکار کی کہانی سناتیں جسے ایک چالاک کسان نے بے وقوف بنایا تھا۔

اماں کی داستان گوئی میں اتنا اعتماد تھا اور ان کے انداز میں اتنا جیالا پن تھا اور ان کرداروں کا اتنا گہرا شعور تھا کہ میں کبھی کبھی اتنی دلچسپی اور حیرت سے ان کی کہانیوں میں کھو جاتا کہ میری نیند غائب ہو جاتی اور میں گھنٹوں بیٹھ کر بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔ اور وہ داستانوں کی دنیا سے آسمان کو دیکھا کرتا جہاں ستارے جڑے تھے، جن میں نہ تیز چمک تھی نہ جگمگاہٹ، نہ رقص، اور دیووں اور پریوں کی یاد سے مبہوت اور مسحور ہوتا۔ اس شیر کی بیوقوفی پہ دل ہی دل میں ہنستا جسے ایک گیدڑ دھوکا دے کر نکل گیا اور اس لڑکے پہ جس کو ایک لومڑی کی چالاکی کی وجہ سے منہ کی کھانی پڑی، شہزادہ میر جوان کے کارناموں پہ عش عش کرتا، یہاں تک کہ نیند میرے نہ چاہنے کے باوجود میری آنکھیں بند کر دیتی اور میری اماں ابھی کہانی آدھی بھی نہ سنا چکتیں۔

میری ماں نے جو کہانیاں سنائیں ان میں پہلی راجہ رسالو کے کارناموں کی کہانی تھی، دم بخود کر دینے والی کہانی کہ ایک نوجوان شہزادے نے کس طرح اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف محل سے نکل کر دیووں سے جنگ کی، جیسے وہ سنیاسی بن گیا۔ اور آخر میں کس طرح پرستان کے راجہ کو شطرنج میں ہرا کر اس کی بیٹی یعنی پریوں کی شہزادی سے شادی کر لی۔

اس کہانی کے رزمیہ انداز نے، جس میں اعلیٰ اور شریفانہ جذبات، بلند خیالات اور اعمال گھلے ملے ہوئے تھے، مجھے بالکل گم سم کر دیا تھا اور میں اس لمبی کہانی کے مختلف واقعات کو انتہائی جوش اور دلچسپی کے ساتھ بیٹھا سنتا تھا۔ یہ کہانی مجھے اس قدر بھلی لگی کہ پھر اس کے بعد ماں جب کبھی پوچھتیں کہ میں کون سی کہانی سنوں گا تو عام طور سے راجہ رسالو کے کارناموں کی کہانی سننے کو کہتا۔

اور کچھ دنوں بعد میں نے اپنی کمر سے ایک پیٹی باندھی اور اس میں لکڑی کی وہ تلوار لگائی جو گھر والوں نے میرے لیے بنا دی تھی۔ میں بھی بالکل رسالو کی طرح، بغیر ماں باپ کی اجازت کے نکل کھڑا ہوا اور گھر سے کوئی دو فرلانگ دور پہاڑی ندی کے پیچھے کے اس پار پہاڑیوں میں بے مقصد پھرا۔

میں دریا کے اوپر پہنچ کر ادا کرتے ہوئے کنکروں پتھروں پر سے اچھلتا کودتا تیز تیز چلتا، اپنے آپ سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے پہاڑوں کے قلعہ بند گھروں کی طرح ندی اوپر تک بھری پہاڑیاں خاموش چٹانوں میں ڈوبی کھڑی تھیں اور ایک پگڈنڈی، جو چٹانوں کے کنارے بانوں نے بچھا دیا ہو اور جنگلی جانوروں نے بنا دی تھی، چڑھ کر میں ایک چھوٹی سی ڈھلوان

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ پھر میں اپنے آپ کو بچا بچا کے، راستے میں آنے والے نکیلی چٹانوں کے ہر بڑے پیڑ سے خیالی لڑائی لڑتا ہوا۔ اعلیٰ درجے کی اونچائی والی پہاڑی کے ساتھ ساتھ اُترتا، جیسے قرمزی پہاڑیاں بھی پوری خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک وادی کی ڈھلان پر اتر گیا جہاں میں ایک سائے کے نیچے رکا۔ ہانپ رہا اور میری نگاہوں میں جو کچھ نظر آتا تھا اس کا تختہ مالک بنا ہوا میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب اور کون کون سی جگہیں سر کرنی ہیں۔ میرے سر کے پچھلے حصے میں درد بڑھتا جا رہا تھا۔

اپنے ارد گرد کی خاموشی کی گہرائی میں، جس میں بس گرم دوپہر کی ہلکی ہلکی ہوا چھیڑ رہی تھی، میں پانی کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور گھاس کی ڈھلان کے پاس میں نے ایک قدرتی چشمے میں سے اُبلتا ہوا شفاف پانی دیکھا۔ میں ایک چھوٹی سی وادی میں سے ہو کر جو جنگلی لال گھاسوں اور جنگلی پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ پانی کے پاس پہنچ کر اچانک ٹھٹھک گیا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو بڑا بہادر تھا اور اسے جنگلوں اور صحراؤں سے ذرا بھی ڈر نہ لگتا تھا اور یہ سوچ کر میں نے بھی جھک جھک پانی سے کلا اپنی پیاس بجھائی۔

اس کے بعد اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کبھی میں ادھر آتا کبھی ادھر جاتا پھر میں نے ایک چڑیا کو بڑی گھبرائی گھبرائی آواز میں بولتے سنا اور اس کا گھونسلہ تلاش کرنے لگا۔ لیکن گھونسلہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا اور میں بیری کے ایک پیڑ کے تنوں سے سائے میں دم لینے کے لیے بیٹھ گیا۔ مگر جنگلی چیلوں کی کرخت آواز سے تو مانیں اکھڑ رہی تھی اور وہ ایک عجیب ویرانے کا سا خوف طاری تھا۔ تنہائی

اس لیے کہ میں نے سُنا تھا کہ گدھ مردار کھاتے ہیں اور ایسی اجاڑ جگہوں پر بستے ہیں جہاں جنّات بستے ہیں۔

میں اُٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

مشکل سے میں تین قدم گیا ہوں گا کہ چیخ اُٹھا جب ایک ڈراؤنی شوں کی آواز سُنی اور ایک طرف کو ایک جھاڑی میں سے میں نے ایک کالے سانپ کو نکلتے دیکھا۔ اس کا سیاہ جسم چمک رہا تھا اور اس نے اپنا پھن کاڑھ کر اپنی زبان کو لپ لپ کرنا شروع کیا جیسے وہ غصے اور نفرت سے بھرا ہوا ہو۔

ایک لمحے تک میں دم بخود کھڑا رہا اور مجھ سے چلّایا بھی نہ گیا۔ لیکن سانپ نے اپنا سر نیچے کر لیا اور گھاس کی جھاڑیوں میں چلا گیا جہاں مینڈک ٹرّاتے تھے۔

میں کانپتا کانپتا اور گھگھیاتا ہوا بھاگنے لگا۔

کچھ دور کی چڑھائی کے بعد میرے گھٹنے لڑکھڑانے لگے اور میں نے اپنی رفتار سست کر دی اور پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں وہ سانپ میرا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے اور میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا اور اپنے ڈر جانے پر خود کو کبھی بُرا بھلا کہتا کبھی ڈانٹتا ڈپٹتا اور کبھی ہمت دلاتا۔

جب میں ذرا سا آگے بڑھا تو میں نے سامنے دس گز کے فاصلے پر ابا کو گھوڑے پر آتے دیکھا۔ وہ غصے میں تھے اور ان کے چہرے پر فکر کے ساتھ درشتی بھی تھی۔

مار کا خیال کر کے میں نے رونا شروع کیا۔ لیکن میرے ابا نے مجھے صرف گھرکی دی اور مجھے بیزاری کے ساتھ گود میں اُٹھا لیا۔

جب مجھے کسی نے پانچ گھنٹے تک نہ دیکھا تو گھر والوں کو بڑی پریشانی ہوئی اور لوگ مجھے ڈھونڈنے نکلے۔ ہمارے گھر کے پاس ہی کے اردلی، دو کے سنتری نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا اس لیے کہ اسی نے آ کر ندی کی طرف بھیجا تھا۔

جب ہم واپس لوٹے تو ابا نے کہا: "پرمیش کی ماں، مجھے ڈر ہے کہ چوٹ کا اثر اس لڑکے کے دماغ پر بھی ہو گیا ہے۔"

اماں نے بوکھلا کے چلاتے ہوئے کہا: "ہائے ہائے، ایسا نہ کہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا بچہ، میرا چاند جیسا لال۔" اور انھوں نے مجھے اپنی گود میں لے کے گویا ہر آفت سے بچا لیا۔

ابا بولے: "مجھے ڈر ہے کہ اگر اس کا دماغ نہیں چل گیا ہے تو بھی یہ بڑا وہمی تو ہو ہی گیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ یہ پہاڑی ندی میں دھڑا دھڑ چلا جا رہا تھا۔ بالکل اکیلا۔ اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا اور اسے اس بات کا ذرا بھی ڈر نہ تھا کہ کوئی شیر یا جانور اسے کھا نہ جائے تو......"

لیکن میرے اور اماں کے درمیان ایک طرح کا خفیہ سمجھوتہ تھا۔ اور وہ بھی میرے خیالوں کے پرستان میں کہاں موجود تھیں۔ بچپن کے ساتھ وہ اصل چوکی تھیں۔ اس میں تو اس دنیا کی تعبیر میرے لیے ہی کر رہی تھیں۔ وہ نئی نئی کہانیاں اور داستانیں اور دیومالا کے قصے سناتے۔

دیومالا کی کہانیوں میں سے ایک میرے نام سے بھی متعلق تھی اور یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس لیے کہ یہ کہانی انھوں نے مجھے بار بار سنائی ہے۔ وہ شروع یوں کرتی تھیں: "کرشن جی کی، جن کے نام پر تیرا نام رکھا گیا ہے۔

بہت سی کہانیاں ہیں۔ وہ شہزادے تھے، لیکن ان کو ایک گوالے نے پالا پوسا تھا اور گوالوں کے دوسرے لڑکوں کی طرح وہ بھی ورنداابن کی چراگاہوں میں گائیں چرانے جایا کرتے اور انھیں لڑکوں کے ساتھ کھیلتے۔ گوالنیں گیت گا گا کر ان کے ساتھ ناچتیں۔ اور کرشن ان کے پریتم تھے۔

میں پوچھتا: "اماں شہزادہ ہو کے وہ گوالوں کے ساتھ کیسے رہنے لگے؟"

اماں بتاتیں: "بیٹا ایسے ہوا کہ ایک زمانے میں متھرا میں ایک راجہ تھے اُگرسین۔ ان کی ایک بڑی خوبصورت رانی تھی۔ ایک راکشش ان پر عاشق ہو گیا اور اس سے ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام رکھا گیا کنس۔ بچپن ہی میں کنس بہت شیطان اور بدمعاش تھا۔ اور جب وہ بڑا ہوا تو اس نے اپنے باپ کو قید میں ڈال دیا اور خود راجہ بن کے گدی پر قابض ہو گیا۔ کنس بڑا ظالم بادشاہ تھا اور اس کے راج میں تو دھرتی ماں تنگ آگئی اور دھرتی نے ایک گائے کا روپ دھارا اور سب دیوتاؤں سے کنس کی شکایت کرنے گئی۔ سب دیوتا برہما کے پاس گئے جنھوں نے ان سب کو شیو جی کے پاس بھیجا اور شیو جی نے ان کو وشنو کے پاس بھیجا۔ وشنو بھگوان نے وچن دیا کہ وہ دھرتی کو کنس کے [illegible] سے بچائیں گے۔ اور انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ کرشن کے روپ میں دھرتی پر آئیں گے اور وہ آئے ۔۔۔۔

"کنس کی ایک بہن تھی دیوکی۔ جب اس کی شادی واسودیو کے ساتھ ہو رہی تھی تو کنس نے ایک عجیب آسمانی آواز کہتے سنا: "اس عورت کا آٹھواں بچہ تجھے ختم کرے گا۔" بیٹا پرانے زمانے میں اسی طرح کی آوازیں لوگوں سے

اکثر بات کرتی تھیں۔

یہ سُن کر کنس چاہتا تھا کہ دیوکی کو جان سے مار ڈالے لیکن اس کے پتی نے وعدہ کیا کہ اس کے جتنے بچے ہوں گے وہ سب کو راجہ کے حوالے کر دے گا۔ کنس نے اس کی جان تو چھوڑ دی، لیکن واسودیو اور دیوکی کے اوپر پہرہ لگا دیا اس لیے کہ کنس بہت ڈر گیا تھا۔ میرے لال وہ بھگوان کے غضب سے بہت ڈر گیا تھا۔

"دیوکی کے چھ بچے پیدا ہوئے اور کنس اتنا بے رحم اور ظالم تھا کہ اس نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا۔"

"جب دیوکی کے ساتواں بچہ ہونے والا ہوا تو وشنو بھگوان نے یہ انتظام کیا کہ وہ بچہ دیوکی کی کوکھ سے واسودیو کی دوسری بیوی روہنی کی کوکھ میں چلا گیا۔ اور اس بچے کا نام بلرام رکھ دیا گیا۔

"جب دیوکی کے آٹھواں بچہ ہونے والا ہوا تو وشنو بھگوان نے واسودیو کو درشن دیئے اور کہا کہ "آج رات کو دیوکی اپنے بچے کو جنم دے گی۔ اسے گوکل نند گوالے کی پتنی یشودا کے پاس لے جاؤ۔ وہ بھی ایک بچہ جنے گی۔ اپنا بچہ اس کے پاس سلا کے اس کے بچے کو دیوکی کے پاس لے آؤ۔"

"اب جیسا وشنو بھگوان نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ اور آدھی رات کو کرشن جی کا جنم ہوا۔ میرے بیٹے، کرشن جی پیدا ہو گئے۔

"کنس کے پہرے دار خراٹے لے رہے تھے۔ واسودیو نے بچے کو اٹھایا اور نند کے گھر لے گئے۔ ناگ راج شیش ناگ نے انھیں راستہ دکھایا۔ اب یہ ہوا کہ جمنا ندی اس رات باڑھ پر تھی لیکن جیسے ہی وہ جمنا ندی میں پہنچے

اور واسودیو کے جانے کے لیے راستہ بن گیا اور وہ نند کے گھر پہنچ گئے اور بڑی ہوشیاری سے وہ یشودا کی کوٹھری میں پہنچ گئے اور بچے بدل کر وہ اپنے گھر واپس آ گئے۔

جب دوسرے دن صبح کو پہریدار جاگے اور انھوں نے بچے کے رونے کی آواز سنی تو اسے پکڑ کر راجہ کنسا کے پاس لے گئے۔ اس نے بچے کو ہوا میں اچھالا کہ اپنی تلوار سے دو ٹکڑے کر دے لیکن بھگوان کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ بچہ آسمان کی طرف اڑ گیا اور کہتا گیا، "مورکھ! میں مایا ہوں یاد رکھ وہ بچہ جو تجھے قتل کرے گا وہ پیدا ہو گیا ہے، زندہ ہے اور اچھی طرح ہے!"

ڈر کے مارے کنسا کی تو جان ہی نکل گئی اور وہ ایک اندھیری کوٹھری میں جا گھسا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اب واسودیو اور دیوکی سے تو اسے کوئی نقصان پہنچ نہیں سکتا اس نے ان دونوں کو آزاد کر دیا — بیٹیا وہ بڑا بیوقوف تھا، نکما بدھو۔ . . .

تو واسودیو نے اپنے بیٹے بلرام کو بھی نند کے یہاں بھیج دیا اور انھوں نے گوالے سے کہا کہ وہ کرشن اور بلرام کو لے کر متھرا سے گوکل چلے جائیں۔ نند بچوں کو لے کے گوکل چلے گئے اور وہاں اپنے ناتے داروں کے ساتھ رہنے لگے اپنی گایوں کو چرانے لگے۔

"اب کرشن تو کنسا کو ملے نہیں۔ اس لیے ظالم تو وہ تھا ہی اس نے یہ حکم دیا کہ اس کے راجیہ کے سارے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ کنسا نے ایک بدصورت راکششنی پوتنا کو بلایا جس کا دودھ پیتے ہی بچے مر جاتے تھے جب

اس نے اپنی چھاتی کرشن کے منہ میں دی تو انھوں نے اس زور سے چوسا کہ
پوتنا فوراً مر گئی۔

• اب جو یہ خبر کنسا کو پہنچی تو اُسے یقین ہو گیا کہ اسے جو بچہ قتل کرنے والا ہے
وہ کرشن ہی ہیں تو اس نے ایک راکشش کو بھیجا کہ وہ کرشن کو پکڑ کر قتل کرے۔
کنسا لڑکوں کے خون کا پیاسا تھا — بیٹا بعض لوگ بڑے وحشی ہوتے ہیں
اور کنسا بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔

• کرشن جنگلوں میں گھومتے رہتے کہ راکشش پہنچ گیا۔ انھوں نے راکشش
کی ٹانگ پکڑ کے اس کا سر ایک چٹان پر دے مارا۔ اس لیے کہ دیوتا تو بڑے
لوگوں اور راکششوں سے کہیں زیادہ شکتی رکھتے ہیں۔

• پھر کنسا نے ایک اور راکشش کو بھیجا۔ اس نے ایک بہت بڑے
کالے کوّے کا روپ دھارا اور کرشن کو اپنی چونچ میں پکڑ لیا۔ لیکن کرشن اتنا
گرم ہو گئے کہ چڑیا نے مجبور ہو کر انھیں چھوڑ دیا۔ تب کرشن نے اس کی چونچ
اپنے پاؤں سے کچل ڈالی۔ اور اسے چیر پھاڑ کر پھینک دیا۔ آیا تھا بڑا اولی
سے روپ دھارن کر کے!

• اب کنسا نے ایک اور راکشش کو بھیجا۔ اس بار اس نے سانپ کا
روپ دھارا۔ کرشن جان بوجھ کر اس کے منہ میں چلے گئے اور اس کے پیٹ
میں پہنچ کر بڑے ہونا شروع ہو گئے۔ سانپ کا پیٹ پھولتا گیا، پھولتا گیا
یہاں تک کہ پھٹ گیا اور سانپ مر گیا۔ بیٹا کرشن جی کا غصہ بہت برا تھا۔

• اور کرشن بڑے ہو گئے۔ نند بابا، اور دوسرے گوالوں کے لڑکے

اور وہ گوالنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے۔ گھر سے دودھ اور دہی چرا لیجاتے اور کبھی کبھی کوئی اور دے گیا ہوگا۔ اور ایک بار جب گوالنیں ندی میں نہا رہی تھیں تو انھوں نے یہ شرارت کی کہ سب کے کپڑے چرا کر پیڑ پر چڑھ گئے اور جب تک سب نے پانی سے ننگے نکل کر ان سے بنتی نہیں کی انھوں نے کپڑے نہیں دیے۔ اور وہ بنسی بڑی اچھی بجاتے تھے۔ اور گوپیوں کے ساتھ ناچتے تھے، اور رادھا کو، جو ایک برہمن کی نوجوان بیوی تھی، بہت چاہتے تھے۔ ان سے کرشن کو پریم ہو گیا تھا۔

"اور جب وہ بڑے ہوئے تو انھوں نے سانپوں کے بادشاہ کو، کالیہ سانپ کو بھی ہرا دیا۔ جو گوالوں اور ان کی گایوں کو ڈس لیا کرتا تھا۔

"اور ایک دن جب اندر دیوتا نے، جو بجلی اور برکھا کے دیوتا ہیں، بڑے زوروں کا مینھ برسایا تو کرشن نے گووردھن پہاڑ کو اٹھا کر گوکل کے اوپر چھتری سی تان لی اور گاؤں بچ گیا.....

"اب جو کنسا نے کرشن کے کارنامے سنے تو اس نے اس بالک کو مارنے کی سازش کی۔ ایک منتری تھا اکرور، جو بڑا نیک مشہور تھا۔ کنسا نے اسے گوکل بھیجا کہ وہ جا کر کرشن اور بلرام کو کھیلوں کے اس میلے میں آنے کی دعوت دے۔ اکرور نے دونوں لڑکوں کو سندیسہ تو پہنچا دیا۔ مگر ان کو مشورہ دیا کہ وہ جائیں نہیں۔ کرشن نے اکرور کو یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور میلے میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"پھر دونوں لڑکے گوپیوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر، جو ان سے بچھڑنے پر

بیٹ دکھی تھیں، متھرا کی طرف چلے۔

"کیسن نامی ایک راکشش نے گھوڑے کا روپ دھار کر ان کا راستہ روکا۔ لیکن کرشن نے اپنا ہاتھ گھوڑے کے منہ میں ٹھونس دیا اور گھوڑا پھولنا شروع ہوا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا۔ اور وہ لوگ پھر اپنے رستے پر چلے۔

"جب وہ شہر کے پاس پہنچے تو انھوں نے یہ سوچا کہ ان کے کپڑے تو میلے ہو گئے ہیں اس لیے انھیں کچھ صاف کپڑے مانگ لینا چاہئیں۔ جمنا کے کنارے انھیں راجہ کا دھوبی ملا۔ اس سے انھوں نے کہا کہ وہ ان کو کچھ کپڑے دیدے۔ لیکن دھوبی سب کنسا کی طرف تھے اس لیے اس نے کپڑے دینے سے انکار کر دیا تو کرشن نے دھوبی کو دیا ایک دھکا اور اس سے کنسا کے کپڑے چھین لیے اور شان سے متھرا میں داخل ہوئے۔

"کنسا نے پہلے ہی سے دو پہلوانوں کو تیار کر رکھا تھا کہ وہ کرشن اور بلرام کو ختم کر دیں۔ اور اگر انھیں بھی کامیابی نہ ہو تو ایک مست ہاتھی تیار کھڑا تھا کہ جسے چھوڑ دیا جائے گا اور وہ ان دونوں کو کچل کر رکھ دے گا۔ لیکن کرشن نے پہلوانوں کو بھی قتل کر دیا اور ہاتھی کو بھی مار ڈالا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے کنسا کے سپاہیوں کو اور خود راکشش راجہ کو بھی قتل کر دیا۔ وہ بڑے بہادر تھے ان کی شکتی اور ان کے غضب کا ٹھکانہ نہ تھا۔

"اور اس کے بعد کرشن اور بلرام متھرا میں رہنے لگے اور ان کے ماں باپ واسودیو اور دیوکی بھی انھیں کے ساتھ آ گئے۔

"کچھ برس بعد متھرا پر کنسا کے دو دوستوں اور راکشش راجاؤں نے چڑھائی

کی۔ کرشن اپنی جنتا کی جان بچانا چاہتے تھے اس لیے وہ سب کو لے کر دوارکا چلے گئے اور دوارکا سمندر کے کنارے ایک دیس ہے۔

"یہاں انھوں نے ایک شہر بنایا اور ایک بہت بڑی فوج اکٹھا کی جسے لے کر انھوں نے متھرا پر چڑھائی کی اور جمنا جی کے کنارے بسے ہوئے اس شہر پر پھر سے قبضہ کر لیا۔

اور پھر انھوں نے ملک کے تمام بڑے راجاؤں کو ہرایا اور ودربھ کے راجہ بھیشم کی بیٹی رکمنی سے بیاہ کر لیا۔

اور جب کورو پانڈوؤں میں لڑائی چھڑی تو وہ پانڈوؤں کے ساتھ تھے، اس لیے کہ وہ لوگ اچھے تھے اور کورو برے لوگ تھے، اور انھوں نے پانڈوؤں کو جو نصیحتیں کی تھیں وہی بھاگوت گیتا میں لکھی ہوئی ہیں جن کا پاٹھ میں روز صبح کو کرتی ہوں اور جسے تم سب سنتے ہو....."

یہ ہی دیوتاؤں کی جو کہانیاں میری ماں نے مجھے سنائی تھیں ان سے میرا شوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں اس عجیب و غریب تماشے کو دیکھنے کا دوسروں سے زیادہ شائق رہتا تھا، جسے رہس کہتے ہیں اور جو ڈنگل والے کنسرٹ میں آ کر دکھایا کرتے تھے۔

رام مورت جگت نرائن کے پاس ایک میدان میں شامیانہ لگتا اور چوکیاں اور دریاں بچھا دی جاتیں اور رامانند بنیے کے یہاں سے دو تخت لا کے ان کا اسٹیج بنا دیا جاتا اور پاس ہی ایک چھوٹا سا خیمہ لگا دیا جاتا جس میں ایکٹر اپنا میک اپ وغیرہ کرتے۔ جیسے ہم یہ انتظامات ہوتے دیکھتے، ہم سمجھ جاتے کہ

ریس دھاری آگئے ہیں۔ اور ہم اس خیمے کے اردگرد بھیڑ لگا لیتے جس میں یہ
لوگ تماشے کے سوانگ بھرتے ہوتے۔ انگریز لوگ عام طور سے ہم کو وہاں سے
بھگا دیتے اس لیے کہ وہ نہ چاہتے تھے کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ ان میں کچھ لڑکے
ہی لڑکیوں کا پارٹ کرنے کے لیے زنانے کپڑے پہن لیتے ہیں۔

ہم وہاں سے آگے دریوں پر بوٹ لگاتے یا اسٹیج کے تختے پر چڑھ جاتے،
یہاں تک کہ اردلی ہم لوگوں کو بلانے آ جاتا۔ گھر پہنچتے ہی ہم اماں کی جان کھاتے
کہ ہمیں جلدی کھانا دو۔ ہمیں جلدی سے جا کے اسٹیج کے پاس بیٹھنا ہے۔ عام
طور سے اماں ہم لوگوں کی ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرتی تھیں۔ اور ہم لوگوں
کو ہمیں دیکھنے کے لیے صوفے کی جگہ صرف اس لیے مل جاتی تھی کہ ابا کے لیے
سامنے کی تھا۔ یہی جگہ رکھی جاتی تھی۔ بینچ، میزوں، دریوں اور جنگلیوں کے
درمیان ہو کر دوسرے گھروں، فضا اور نظارہ دیکھنا پڑتا تھا۔ لیکن بچوں کو رام اور
سیتا اور لکشمن کی کہانی تو معلوم ہی تھی اس لیے کہ اپنی نانی یا چچا فدا اور بچپن
سے ہمیں نے سن رکھی تھی یا پچھلے سال۔ ریس دھاریوں نے جب رام لیلا کی تھی
تو دیکھی تھی۔ چنانچہ ہر شخص غور سے دیکھتا رہتا اور جو کچھ نہ سمجھ پاتا یا نہ دیکھ
پاتا اس کو اپنی یاد سے پورا کر لیتا۔

اس لیے کہ سامنے تو گورے صاحب لوگوں اور ہندوستانی افسروں کی
کرسیاں لگی ہوتی تھیں اور پیچھے سپاہی اور عام لوگ زمین پر بیٹھے ہوتے تھے۔
پھر کھانا ہوتی اور رات بیت بھی جاتی، جتنی تھی تو ساری بات ٹھیک سے
دکھائی دیتی تھی اور اسٹیج پر جو کچھ ہوتا تھا وہ پوری طرح دکھائی بھی دیتا تھا۔

اور ویسے بھی یہ بات کچھ اہم نہ معلوم ہوتی تھی کہ لوگ ہنسیں اور دیکھیں۔ اصل چیز تو یہ تھی کہ سب ساتھ مل کر ایک جگہ بیٹھیں اور محبت اور اپنے پن کی ایک فضا بن جاتی جو ہر ایک پر جادو سا کر دیتی —— جب کھیل کے بارے میں اعلان کرنے والا مسخرہ آتا جس کی ناک لال اور کپڑے رنگ برنگے ان پہ جوڑ ہوتے تو سب اس زور سے ہنس پڑتے کہ کرنل صاحب اور انجینئر صاحب کی بیویاں بھی انھیں دبا دیتی تھیں۔ اسی طرح ہنومان جی کے کمالات پر سب خوش ہوتے اور دس سروں والے راجہ راون کے قتل پر تو سپاہی اچھل اچھل پڑتے اور جینڈ مین کلیلن، جو سیتا کا پارٹ کرتا تھا، جب گیت گاتا تو ایسا لگتا جیسے اس کی آواز دلوں میں اُترتی چلی جا رہی ہے۔

جب تک صاحب، جیسا کہ انگریز افسروں کو کہا جاتا تھا، چلے جاتے تب سب لوگ اور کھیل کھیلتے۔ لیکن اس وقت تک ہم بچے سو چکے ہوتے اور ہم کو اول شام کو گھر لے جاتے۔

بہر حال میں اونگھنے رہنے کے باوجود اتنا دیکھ لیتا تھا کہ رام اور اُن کے ساتھ کرداروں کو پہچان لیتا اس لیے اور بھی کہ ہماری اماں نے پرانی کتھاؤں اور لوک کتھاؤں سے جو کچھ ہمیں سنایا تھا وہ ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ اور میں ہر بات کا اثر اتنی جلدی قبول کر لیتا تھا کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ اداکاروں کو رام لیلا کرتے دیکھ کر ہی میں بھی کوئی بھی پارٹ کر سکتا ہوں۔

چنانچہ جب کچھ دنوں کے بعد چھاؤنی کے شوقیہ فنکاروں نے دسہرے کے موقع پر رام لیلا کی تو میں اس بات پر اڑ گیا کہ میں اس ننھے فرشتے کا پارٹ

رس دھاری آگئے ہیں۔ اور ہم اس خیمے کے اردگرد بھیڑ لگا لیتے جس میں یہ
لوگ تماشے کے روپ بھرتے رہتے۔ انگریز لوگ عام طور سے ہم کو وہاں سے
بھگا دیتے اس لیے کہ وہ نہ چاہتے تھے کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ ان میں کچھ لڑکے
ہی لڑکیوں کا پارٹ کرنے کے لیے زنانے کپڑے پہن لیتے ہیں۔

ہم وہاں سے آکر دریوں پر لوٹ لگاتے یا اسٹیج کے تخت پر چڑھ جاتے،
یہاں تک کہ اردلی ہم لوگوں کو ہٹانے آجاتا۔ مگر پیچھے ہی ہم اماں کی جان کھاتے
کہ ہمیں جلدی کھانا دو۔ ہمیں جلدی سے جاکے اسٹیج کے پاس بیٹھنا ہے۔ عام
طور سے اماں ہم لوگوں کی ان باتوں کی کوئی پروا نہ کرتی تھیں۔ اور ہم لوگوں
کو رس دیکھنے کے لیے موقع کی جگہ صرف اس لیے مل جاتی تھی کہ ابا کے لیے
سامنے کی قطار میں جگہ رکھی جاتی تھی۔ جٹے سیٹھوں، دھوتیوں اور جنگلیوں کے
لوگوں کو تو دور سے گردن اٹھا اٹھا کر دیکھنا پڑتا تھا۔ لیکن ہر لڑکے کو رام اور
سیتا اور لچھمن کی کہانی تو معلوم ہی تھی اس لیے کہ اپنی ماؤں یا چچیوں اور پھپیوں
سے یہ سن رکھی تھی یا پچھلے سال رس دھاریوں نے جب رام لیلا کی تھی
تو دیکھی تھی۔ چنانچہ ہر شخص غور سے دیکھتا رہتا اور جو کچھ نہ سن پاتا یا نہ دیکھ
پاتا اس کو اپنی یاد سے پورا کر لیتا۔

اس لیے کہ سامنے تو گورے صاحب لوگوں اور ہندوستانی افسروں کی
کرسیاں لگی ہوتی تھیں اور پیچھے سپاہی اور عام لوگ زمین پر بیٹھے ہوتے تھے،
پھر کھانا پینا اور بات چیت بھی جاری رہتی، مگر تھی تو ساری بات ٹھیک سے
دکھائی دیتی تھی اور اسٹیج پر جو کچھ ہوتا تھا وہ پوری طرح دکھائی بھی دیتا تھا۔

اور ویسے بھی یہ بات کچھ اہم نہ معلوم ہوتی تھی کہ لوگ ہنسیں اور دیکھیں۔ اصل چیز تو یہ تھی کہ سب ساتھ مل کر ایک جگہ بیٹھیں اور محبت اور اپنے پن کی ایک فضا بن جاتی جو ہر ایک پر جادو سا کر دیتی ——— جب کھیل کے بارے میں اعلان کرنے والا مسخرہ آتا جس کی ناک لال اور کپڑے رنگ برنگے انوکھے ہوتے تو سب اس زور سے ہنس پڑتے کہ کرنل صاحب اور انجینئر صاحب کی تیوریاں بھی انھیں دبا نہ سکتی تھیں۔ اسی طرح ہنومان جی کے کمالات پر سب خوش ہوتے اور دس سروں والے راجہ راون کے قتل پر تو سپاہی اچھل اچھل پڑتے اور جینڈ مین گلیمن، جو سیتا کا پارٹ کرتا تھا، جب گیت گاتا تو ایسا لگتا جیسے اس کی آواز دلوں میں اترتی چلی جا رہی ہے۔

جب ٹومی، جیسا کہ انگریز فوجیوں کو کہا جاتا تھا، چلے جاتے تب سب لوگ اور کھیل کھیلتے۔ لیکن اس وقت تک ہم بچے سو چکے ہوتے اور ہم کو اردلی اٹھا کر گھر لے جاتے۔

بہرحال میں اونگھنے، بچے ہونے کے باوجود اتنا دیکھ لیتا تھا کہ رامائن کے سارے کرداروں کو پہچان لیتا۔ اس لیے اور بھی کہ ہماری اماں نے پرانی کتھاؤں اور لوک کتھاؤں سے جو کچھ ہمیں سنایا تھا وہ ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ اور میں ہر بات کا اثر اتنی جلدی قبول کر لیتا تھا کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ اوروں کو رام لیلا کرتے دیکھ کر چاہوں تو میں بھی کوئی بھی پارٹ کر سکتا ہوں۔

چنانچہ جب کچھ دنوں کے بعد جنٹ کے شوقیہ فنکاروں نے دسہرے کے موقع پر رام لیلا کی تو میں اس بات پر اڑ گیا کہ میں اس ننھے فرشتے کا پارٹ

کروں گا، جو سیتا جی کے پاس کھڑا رہتا ہے۔

اماں نے اپنے اثر سے کام لیا اور مجھے وہ پارٹ کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن پارٹ کرنے کی اجازت ملنے سے جوش و خروش اتنا زیادہ تھا کہ مجھے اب یہ بالکل یاد نہیں کہ میں نے وہ پارٹ کیا کس طرح تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نے اچھے اچھے کپڑے پہنے تھے اور میرے ہاتھوں سے دو پنکھ باندھ دیے گئے تھے اور میرے منہ پر سرخی پوڈر لگا دیا گیا تھا اور میرے ماتھے اور گالوں پر چمکتے ہوئے ستارے لگائے گئے تھے اور جیسے ہی کلیشن کے ساتھ، جو سیتا بنا ہوا تھا، میں اسٹیج پر آیا، ویسے ہی میں بیٹھ گیا اور اس کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔ اور چونکہ سمجھا یہ جاتا تھا کہ فرشتے سیتا جی کی نگہبانی کریں گے اور ساری رات ان کے پاس رہیں گے، مجھے بتایا گیا کہ غیر شعوری طور پر میرا سو جانا اداکارانہ صلاحیتوں کا بڑا اچھا مظاہرہ تھا۔

قدرتی طور پر، کئی دن بعد تک میں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا رہا اور دوسرے لڑکوں نے بھی اس بات کو مان لیا۔

*

لڑکوں کی دوستی سے میرا دل بڑھا تو میں ان کے ساتھ کھیلنے بھی نکل گیا۔ لیکن چونکہ اتفاقیہ طور پر میرے سر پر چوٹ لگ جانے کی وجہ سے ان کے کھیلوں سے ڈر لگتے تھے، یوں تو کوئی کمی آئی نہ تھی البتہ ہفتوں تک میرے بستر پر پڑے رہنے کی وجہ سے اب وہ مجھے اس طرح کے کھیلوں میں شریک کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں پھر نہ مجھے چوٹ چپیٹ آ جائے اور اماں ان لوگوں پر

خفا ہوں، اس لیے میں یہیں بیٹھ کے ان کو کھیلتے دیکھ سکتا تھا۔

خیر ان کے بہت سارے کھیلوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا اور میں اتنے ہی سے خوش ہو لیتا تھا کہ دوسرے بچے کو کھیل دیکھتا ہوں۔ لیکن ایک دن میں نے گنیش کو چھوٹا، علی اور رام چرن وغیرہ کے ساتھ چپکے چپکے ندی کے سوکھے نیچے کی طرف جاتے دیکھا۔ میں نے ان لوگوں کو چپکے چپکے یہ صلاح کرتے دیکھا کہ مجھے کس طرح کاٹا جائے اور اس سے میرا شوق اور بھی بڑھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ ایک ایک کرکے الگ الگ راستوں سے کھسکنا شروع ہوئے ویسے ہی میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ ضرور کسی نئے، دلچسپ اور خطرناک کھیل کی تیاری کر رہے ہیں۔

جب انھیں گئے ہوئے چند منٹ ہو گئے تو میں نے یہ اندازہ لگایا کہ سب کس طرف کو گئے ہوں گے اور میں بھی ادھر ہی چل پڑا۔ یہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے اور اب انھوں نے یہ سوچا کہ اگر مجھے ساتھ نہ لیا تو میں ان کی شکایت کر دوں گا۔ انھوں نے بھاگنے یا چھپنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

بس اتنا کیا کہ جب میں ان کے پاس پہنچا تو ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں ندی کے نیچے میں ان لوگوں سے ذرا دور رہوں تاکہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے، اس لیے کہ ان لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ تیر کمان سے لڑائی کا کھیل کھیلیں گے، جس میں وہ پاس والی ٹیکری کو قلعہ سمجھ کر اسے فتح کرنا ہے۔ ہم نے بھول تماشائی بننا منظور کر لیا اس لیے کہ بچپن چوٹ اور مصیبت کے بعد میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

لیکن اب میں کیا بتاؤں کہ بچانہ دل میں کیسی تڑپ تھی۔ ساتھ نہ کھیلنے
پر کیسا غصہ تھا اور اگر کہیں واقعی کچھ ہو جاتا تو باپ کے غصے کا کتنا ڈر تھا۔
آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور رگوں میں جو کھیل کی لڑائی ہو رہی
تھی اس پر مارے جوش کے میرا سر گھوما جا رہا تھا اور دوسرے لڑکوں کی آواز
سے آواز ملا کر چلاتے چلاتے میرا گلا بیٹھ گیا تھا اور میں اپنے آپ کو یقین
دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں جنرل ہوں، میری وردی پر لال پٹیاں ہیں
اور میں لڑائی میں ان لوگوں کو آرڈر دے رہا ہوں۔

لیکن یہ لوگ نقلی بندوقوں سے نہیں لڑ رہے تھے۔ اور نہ عام سپاہیوں
کی پونچھ کے بول ہی چلا رہے تھے۔ شاید ان لوگوں نے ریڈیو پر زبان کے
کچھ عجیب و غریب نعرے یاد کر رکھے تھے اور اس وحشت کے ساتھ لڑ رہے تھے
کہ میں نے کبھی لڑائیوں میں نہ دیکھی تھی۔

سہ پہر کی دھوپ میں اس نئی قسم کی لڑائی میں جو جوش و خروش اور ہیجان
میں شریک ہونے کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اس لیے کہ حملہ آور فوج کے
لڑکے ایک چھجے سے دوسرے چھجے پر اپنی کمانیں چڑھائے ہوئے بڑھ رہے تھے
کہ شکری کو سر کریں جبکہ وہ فوج جو قلعے پر تھی بس تیر مار مار کر حملہ آوروں کو
گرا رہی تھی اور جنگ کے قاعدوں کے مطابق جیسے ہی کسی کے پاس سے
تیر گزر جاتا وہ گر پڑتا اور پھر نہ اٹھتا۔

نعرے والوں نے مجھ میں جو گرمی اور جنون پیدا کر دیا تھا وہ میری ہر آتی وحشت
سے باہر تھا اور میں وہاں کھڑا کھڑا اپنی جگہ سے ... میں پوری لڑائی کو سمجھنے

سے رہا تھا۔ میں ہر جسم کے ساتھ کبھی ادھر جھکتا کبھی ادھر۔ میں تلا پہاڑی ان کے
جنگی نعروں کو دہراتا اور پھر مجھ سے جنگ نے ہنگ تھنگ نہ رہ گیا اور میں
نگاہ ان میں سے چڑھ کر پہاڑی کی طرف لپکا۔ اپنے ہاتھ کی کمان بنا کے اس پر
ایک خیالی تیر کی طرح، مجھے ہونے میں اس تیزی سے بڑھا جیسے یہ فاصلہ میرے
لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لڑکے اپنا کھیل روک کر چلانے اور مجھ سے میدان سے ہٹ جانے کو کہنے
لگے۔ لیکن میں نے کوئی پرواہ نہ کی اس لیے کہ میری روح کہہ رہی تھی "میں
جاؤں گا۔ میں اکیلا بڑھ کر اس قلعے کو فتح کروں گا...."

ہوا سے میں نے معلوم ہوتا تھا سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اور ندی کے سوکھے
پیٹے میں پڑے پتھروں کی نسبتوں سے بھی میرا سمجھوتہ تھا۔ میں اپنا تھوک نگلتا ہوا
ٹیلے کی چوٹی کی طرف نگاہیں جمائے بڑھتا گیا۔

سامنے لڑکے جن کی لڑائی ان کی آوازوں نے شور مچایا ہے اور ان کی
چیخوں چلاہٹوں اور چیزوں کی وجہ سے کافی طول کھینچ گئی تھی، خاموش کھڑے
ہوئے مجھے تک رہے تھے اور اس بات پر بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ ریا
ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس لیے نہیں کہ دشمن شیر دل تھا بلکہ اس لیے کہ
بے موقع نے قلعہ فتح کر لیا اور وہ اسے روک نہ سکے تھے۔

میں پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ میرا جوش اور سارا ہی آرزو میرے
جسم کی نقل و حرکت میں تھی، حالانکہ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے اور سانس
پھول رہی تھی۔ پھر بھی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے نعرہ لگایا: "میں نے

جیت لیا، قلعہ جیت لیا:"

لڑکے آنکھیں پھاڑے منہ کھولے دیکھتے رہے، لیکن منہ سے بولے کچھ نہیں۔ اور پھر مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ سب چل دیے۔ اس دنیا کا میں اکیلا بادشاہ رہ گیا۔

اس پر میں رونے لگا اور ان کے پیچھے بھاگا، لیکن وہ تتر بتر ہو گئے تھے اور میں چلاتا ہی رہ گیا: "اچھا رہ جاؤ، میں تم سب کو ہرا دوں گا۔"

جب میں بیماری سے تقریباً بالکل اچھا ہو گیا تو میرے ابا مجھے شام کو گھر پڑھانے لگے تاکہ "پڑھائی پیچھے رہ جانے کی" کمی، جیسا کہ وہ اسکول سے میری غیر حاضری کو کہتے تھے، کو پورا کروا دیں۔ اس لیے کہ اگر کسی چیز سے میرے ابا کو نفرت تھی تو وہ یہ کہ ان کے لڑکے ان کی آرزو کی منزل، یعنی پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن، تک پہنچنے میں ایک بھی سال پیچھے رہ جائیں۔ وہ کہتے: "میں نے کبھی اسکول میں کوئی سال نہیں خراب کیا۔ اور نہ تمھارے بڑے بھائی نے۔ تم کو خوب محنت کرنی چاہیے، تاکہ کسی سال فیل ہو کے میرے نام کو بٹہ نہ لگاؤ۔"

بیماری کے بعد مجھے اصل مشکل حساب میں پیش آئی تھی۔ پہلے اور دوسرے پرائمری درجوں میں حساب کی بنیادی چیزیں، یعنی جمع، جو خوب مشق سے ہو گئی تھی، اور پھر اس سے مشکل ضرب، تفریق اور تقسیم بیماری سے پہلے کا کھیل تھا، لیکن جب سود مرکب جیسے پیچیدہ سوال اور نسبت کے طریقے سکھائے گئے تو میں اسکول سے

غیر حاضر تھا۔ اسکول ماسٹر یہ سمجھتے تھے کہ مجھے سود مرکب ذرا بھی آتا ہی نہ تھا، اور ان کے ڈانٹنے کے ڈر نے مجھے حساب کے معاملے میں اور بھی گاؤدی بنا دیا۔ ماسٹر صاحب بھلا یہ تکلیف کیوں کرتے کہ سود مرکب کے سوال درجے میں پھر سے سمجھا دیتے، اس لیے کہ وہ چاہتے تھے کہ انھیں ٹیوشن مل جائے۔ لیکن ابا کا خیال یہ تھا کہ ایک گھنٹے کے ٹیوشن کے لیے پانچ روپے ماہانہ صریحی لوٹ ہے، اور پھر ابا اس بات سے بھی پریشان تھے کہ کہیں میرا ایک سال نہ خراب ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے مجھے امتحان کے قریب پڑھانا شروع کیا۔ انھوں نے کہا: "اسکول سے واپس آ کر تم ہوم ورک کر لیا کرو، اور پھر شام کو میں تمھیں حساب پڑھاؤں گا اور شروع سے آخر تک سارا کورس پورا کرا دوں گا۔"

میری اپنی مرضی کو ایک تو بیماری نے ختم کر دیا تھا اور جو بچی کھچی آزادی تھی وہ بھی ابا کی سختیوں نے چھڑا دی جو انھوں نے بیماری میں میری عمر کے بعد سے مجھ پر کرنی شروع کر دی تھی۔ میں بالکل کاٹھ ہو گیا تھا اور اوپر سے مجھے یہ فکر تھی کہ اگر میں فیل ہو گیا تو واقعی مجھے بڑی شرمندگی اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں بڑا احمق ہو گیا اور خلاؤں کی طرف تکا کرتا۔ میں گھر آتا اور کبھی کبھی دو ہی نوالے اور دال کھائے بغیر ہی اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھ جاتا۔ ویسے بھی مجھے کھیلنے جانے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے کہ میں جا کے پھر کوئی مصیبت اپنے سر نہ مول لوں، اس لیے کہ جو حادثہ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں میں مہینوں بستر پر پڑا رہا اس کو اب یہی رنگ دے دیا گیا تھا کہ ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی سزا بھگتنی پڑی۔ چنانچہ میں چپ سادھے بس کام کرتا۔ بس کبھی کبھی شیو کے

ساتھ چیر پھاڑ کر دیتا جس کے نوٹوں میں آفت اُتر آئی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ
بجلی کے قمقموں کی طرح اسے بھی وہ دیکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی میں ہمت کر کے جنید کو دیکھنے
چلا جاتا جو ہمارے گھر کے پچھواڑے مشق کیا کرتا تھا۔

شام کو کھانے کے بعد، جو سات بجے تک ختم ہوتا تھا، ابا مجھے اور گنیش
کو مٹی کے تیل کے ایک چھوٹے سے لیمپ کی روشنی میں، جو بیٹھک کی دیوار پر
لٹکا ہوتا تھا اور جس پر کاغذ کا شیڈ لگا ہوتا تھا، پڑھانا شروع کرتے۔

ابا جس طریقے سے مجھے حساب پڑھاتے تھے وہ عجیب سا لگتا تھا۔ وہ مجھے
کسی سوال کے حل کرنے کا طریقہ اور اصول بتا دیتے تھے اور اس کے بعد مجھ سے
کہتے کہ میں نئی مشق میں سے خود سے سوال حل کروں، اس لیے کہ ان کا خیال
تھا کہ دن بھر دفتر میں جھک مارنے اور پھر شام کو آکر کھانا کھانے کے بعد وہ خود
ٹھیک نہ کر سکتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں جو غلطیاں کروں ان سے وہ
فائدہ اٹھائیں۔ اگر کبھی ایسا معجزہ ہو جاتا کہ میں سوال حل کرنے میں کامیاب
ہو جاتا تو ابا کہتے کہ اب اگلا سوال کرو۔ لیکن اگر میں نہ کر پاتا تب وہ پوری توجہ
سے مجھے پڑھانا شروع کرتے۔ وہ میرے ہاتھ سے سلیٹ چھین کر چلاتے۔
"ادھر آ نا..... ، پیں ادھر نے تھے، نہیں تو اس طرح سے اوپر ایک کے
بعد دوسری تباہی لاؤ کر، اس سال تو ہرگز پاس نہیں ہو سکتا۔"
اتنے ہی پر میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ سلیٹ پر لکھ لکھ کر
جو بھی مجھے سمجھاتے وہ کچھ بھی میرے پلے نہ پڑتا۔ میں ابا کی ہر بات پر "جی۔
جی ہاں" کہتا جاتا۔ حالانکہ میرا دماغ گنتیوں کو چھوڑ کر کسی کہانی میں مصروف

ہوتا جو میں نے فوجی اخبار میں پڑھی تھی۔

جب ابّا اپنی بڑی بڑی فوجی مونچھوں کے نیچے سے ڈھیر سارا تھوک نکال کر سلیٹ کو پونچھ ڈالتے، تب میں اس ٹیڑھے مسئلے سے سر مارتا۔

کچھ دیر بعد ابّا پوچھتے، "کر لیا سوال؟ آخر اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے؟"

"کر رہا ہوں" میں نے شان کی بھرپور گونج پیدا کر کے جواب دیا اور دُعا مانگتا کہ میرے دماغ میں سوجھ کی کوئی کرن اُجالا کرے یا کوئی ایسی بات ہو جائے کہ میں یہ کہنے سے بچ جاؤں کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

لیکن ابّا میرے ہاتھ سے سلیٹ لے لیتے اور یہ دیکھ کر کہ میں نے آدھا سوال بھی نہیں کیا چلانے لگتے۔

"تیرا دل دماغ کہاں ہے، اُلّو؟ تیری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں!"

"ہاں جی میں کر سکتا ہوں!" میں نے جھوٹ بولنے کے ارادے کے بغیر جھوٹ کہا۔

"تو پھر کیا بات ہے؟ بتا مجھے کیسے کرے گا اس سوال کو؟" ابّا اپنے لال لال آنکھوں سے اپنی گھنی بھنویں تان کر گھورتے۔

میں چپ رہتا۔

میری پیٹھ پر ایک ٹھوکر پڑتی، اس لیے کہ جہاں ابّا تکیہ لگائے بیٹھے تھے وہاں سے پاؤں سے مارنا زیادہ آسان تھا بہ نسبت طمانچہ لگانے کے۔

میں رونے لگتا، اور میرے نچلے ہونٹ پہ سسکیاں بھرنے لگتیں۔

ابّا نے کہا، "ذرا سی ڈانٹ پر روتا ہے! کیوں اپنی آنکھیں سُجاتا ہے۔"

ادھر آ۔ پھر سے بیٹھ۔ اور اب کی دفعہ دھیان لگا کے کہنا، نہیں تو میں تیری
جان لے لوں گا۔"

ڈر سے کانپتے ہوئے میں غور سے سنتا کہ دوبارہ نہ پٹنا پڑے۔
سوال کوئی آسان تھا، جب ابا نے سنا دیا تو میں نے فوراً کر کے
دکھا دیا۔ پھر ابا نے اگلا سوال کرنے کو کہا۔

اب ساری شام کی محنت سے تھک چکا ہوتا۔ لیکن میں اس انتظار
میں رہتا کہ ابا کا غصہ ذرا کم ہو۔ جب میں دیکھتا کہ ابا کے چہرے پر تناؤ
نہیں ہے تو کہتا۔ "ابا جی مجھے نیند آ رہی ہے۔"

ابا پھر چلاتے: "ابھی نو بجا ہے اور تجھے نیند آ رہی ہے۔ سُور، جا
جا کے ہوا خوری کر۔" پھر وہ گنیش کی طرف مخاطب ہوتے۔ "کیوں بے بچے،
تو کیا کر رہا ہے؟"

ابا کی غصے بھری آواز پر میں پھر کانپنے لگتا اور گنیش یہ دیکھ
کر اب اس کی مصیبت آئی ایک طرف کو دبک جاتا۔

اتنے میں اماں رسوئی میں سے چائے کا برتن لے کے آ جاتیں اور پوچھتیں: "کیا
ہے، آخر بات کیا ہے؟"

ابا چڑ سے بڑے اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لیے کہتے: "تمھارا
کیا خیال ہے، تم سمجھتی ہو ان کتوں کو ذرا سا بھی اس کا خیال ہے کہ میں ان
کے لیے کتنی فکر کیا کرتا ہوں! یہ ہٹ دھرم اور بدنصیب ہے، اور وہ
کام چور ہے۔ ان کا بہت لاڈ پیار کیا گیا اور کچھ نہیں۔ مجھے میرے پتا ٹھیک

سے کپڑے بھی نہ جڑتے تھے اور میری ماں کبھی ایک پیسہ بھی نہ دیتی تھیں۔ نہ مجھے کوئی پڑھانے والا تھا۔ اُتنے میں ہی دوسرے لڑکوں کو پڑھا کر اپنی فیس کے پیسے پیدا کیا کرتا تھا، اور کھانے کو مجھے بس اتنا ملتا تھا کہ بھڑبھونجے کی دکان سے چار کوڑی کے بھنے چنے اور پیاؤ سے ایک گلاس پانی۔ اور ہم ہیں کہ ان کو اچھا کھانے کو دیتے ہیں ہر طرح سے ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے اسکول کی فیس دیتے ہیں کتابیں خریدتے ہیں اور اپنی تھوڑی سی تنخواہ میں سے ان کے لیے کیا نہیں کرتے؟ مگر کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ اس کا احسان مانیں گے؟ ابھی ان کی جنیؤ پہنانے کی رسم کرنی ہے، پھر ان کی شادیاں کرنی ہیں ـــ اور اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟

اماں تو گویا ان کی ماں ہی ماں ہوتیں۔ "اے ہاں اس بڑے ہی نے کون سے توڑے ہمیں لا کے دے دیے ہیں؟ جو اور نہیں گا؟"

"ہاں، دیکھ لو، اسی نے ہمیں کیا لا کے دے دیا، اور ہم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا۔ میں نے اسے پڑھایا لکھایا، اس کی شادی پر پانچ ہزار روپے خرچ کیے جو پیسہ پیسہ کر کے جوڑا تھا، اور اب اس کا بدلہ کیا ملا؟ میں چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے، اور اس نے اپنی بیوی کے چکر میں آ کے کالج چھوڑ دیا۔ اور کیا ندا ابھی وہ اس کا احسان مانتا ہے کہ میں نے اسے نوکری دلا دی۔ کرنل صاحب نے جو جیلوں کے آئی جی کو سفارش لکھ کے دی تھی اس کی وجہ سے اسے نائب جیلر کی نوکری مل گئی نہیں تو ساٹھ امیدوار تھے۔ اور سوچو کہ مجھے کبھی کسی نے رتی برابر کی مدد نہیں دی۔"

اماں ہم لوگوں سے کہتیں: "تمہارے ابا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں؟"
ابا ہریش کے بارے میں کہتے رہتے۔ "خیر میرا جو قرض تھا وہ میں نے اس کے ساتھ کر دیا اب وہ جانے اور اس کا کام۔ بھگوان کا شکر ہے کہ مجھے اور اس کی ماں کو اس کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب یہ بچے ہیں تو ان کے ساتھ بھی میں اپنا قرض پورا کر دوں گا۔ اگر میں بغاوت نہ کر پایا اگر مجھے پنشن نہ دی گئی تو تعلیم تو پوری کرا ہی دوں گا۔ لیکن ان کی تعلیم میں میں اپنی جان نہیں کھپاؤں گا۔ جیسا ان کے چاچا کے لیے کیا تھا۔ یہاں اگلی تعلیم پر جو خرچ ہو جاتا ہے وہی بہت ہے۔ یہ خود کر کے دکھائیں، محنت کر کے امتحان پاس کریں۔ اور اگر میں ان کو پڑھاؤں گا، اپنا سر کھپاؤں گا تو نہیں احسان ماننا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ جب کوئی سوال کرنے یا ایک صفحہ پڑھنے کو کہا اور یہ لگے رونے۔ ہر سال امتحان پاس کرنا پڑے گا۔ اگر فیل ہوئے تو گھر سے نکال باہر کر دوں گا..."

اماں کچھ سوچتے ہوئے کہتیں، "یہ ہماری اولاد ہیں۔ شاید ان سے کسی سکھ کی امید تو نہیں ہی بیکار ہے۔ لیکن جب کبھی بچے بڑے ہوں گے، جو خود ہریش کا خیال آتا ہے اس کی اشتری پر آگ لگ جاتی ہے۔ کبھی ایک بار بھی اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ میری خدمت کرے؟ کبھی اسے بھولے سے بھی خیال آیا کہ میرے لیے کچھ بھیجے۔ مجھ سے کہے کہ اماں جب میں جوان کی گرمی میں بھول سے رات تھا تو تو نے بھی چاچا کو گلاس دی تھی۔ اب میں کمانے لگا ہوں تو اب بیٹے کی تنخواہ تو ہی لے اور اپنے لیے کچھ بنوا لے۔ میرا تو یہ سوچ سوچ کر کلیجہ پانی ہوا جاتا ہے کہ وہ ایسا اپنی بیوی کے چنگل میں پھنسا ہے کہ ہم لوگوں کا

کبھی خیال ہی نہیں آتا اسے۔ میرے خیال میں اس کی بہو نے اس پر کچھ جادو کر دیا ہے۔"

ابا اماں سے کچھ ہمدردی کرنے کے انداز میں کہتے: "جانے دو بیگم، ہمیں ان سے کچھ نہ چاہیے۔ ہمارے بڑھاپے کے لیے ہمارے پاس کافی ہے۔ نہیں اپنے چچا پرتاپ کی طرح کھاؤ اُڑاؤ۔"

اور وہ اخبار کو ایک طرف رکھ کے ہمیں الگ الگ لینے کے بعد ان سے ہنسی ہنسی باتیں کرنے لگتے۔ ہنستے مذاق کرتے اور ایک ایسی یگانگت دکھائی پڑتی جو کم ہی نظر آتی تھی اور وہ ایک ایسے بڈھے جوڑے کی طرح بیٹھے ہوتے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو قبول کر لیا ہو۔ اور سارے اختلافات کو نبھانے لگے ہوں، کچھ پیسے جوڑ لیے ہوں، ایک کنبے کی پرورش کر لی ہو اور اب اپنی شادی کا جشنِ سیمیں منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔

اتنے میں میں نے کل کے لیے اپنا بستہ ٹھیک کر لیا تھا۔ اور میں اٹھ کر سونے چلا گیا۔

*

ڈرائنگ کے صوفے بھائی کے نیچے میں آرام سے دبکا ہوا تھا اور خوب گرم ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے کہ جلدی لیٹ جانے کے خیال پر میں مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ مجھے اس کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ میں ابھی تھوڑے ہی دن پہلے بیمار تھا۔ میں نے اپنے کان لگائے کہ دوسرے کمرے میں کیا ہو رہا ہے، اور

میں نے سُنا کہ گنیش مصیبت میں ہے اس لیے کہ وہ فقیر کی نظم ٹھیک طرح سے نہیں سُنا پا رہا ہے۔

میں اپنے دل میں سوچا۔ "یہ اچھا موقع ہے۔" اور میں وہ نظم پڑھنے لگا جو میں نے اپنے بھائی کی کتاب سے زبانی یاد کر لی تھی۔

"چپ رہو، ادھورا!" ابا نے کہا لیکن اب کے ان کی آواز میں غصہ نہیں تھا اور میں سمجھ گیا کہ ابا مجھ سے خفا نہیں ہیں۔

لیکن میں نے سُنا کہ گنیش پر گالیاں پڑ رہی ہیں اور ڈر سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ مجھے بے چینی اور الجھن اس کی نہ تھی کہ گنیش بے چارہ مصیبت میں ہے بلکہ میں اپنے ہاتھ پاؤں کی خیر منا رہا تھا کہ کہیں ابا کا غصہ زیادہ نہ بڑھ جائے۔ باوجود اس کے کہ جب مجھے بڑی طرح ڈانٹ پڑ رہی تھی تو گنیش میرے لیے خاصا دکھی لگ رہا تھا، مجھے اپنے بڑے بھائی سے ایک خاص قسم کا بغض تھا اس لیے کہ وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ تو کھیلتا تھا اور مجھے اپنے ساتھ نہ کھیلاتا تھا۔ پھر ایک برتری کا احساس بھی تھا جو میرے والدین نے بڑھاوا دے کر پیدا کیا تھا۔ اس کی چپٹی ناک، اس کے کانوں کی چھوٹی بوندوں، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور اس کے گھٹیا پن سے مجھے اب بھی نفرت تھی اور میں اس بات سے چڑ کر اسے جتنے پیسے ملتے وہ ان سب کو جوڑ کے رکھتا اور لوگوں کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بن کر اور ٹھیک طریقے سے برتاؤ کرکے چھپا بنا رہتا اور سب کہتے کہ بڑا نیک ہے، جو میں جانتا تھا کہ سچ نہیں ہے۔ اور میں بے وقوف تھا اور گستاخ، چنانچہ لوگ مجھے ہمیشہ بدمعاش سمجھتے تھے۔

میری اماں اس کی سفارش کرتیں۔ "مت اس پر اتنی سختی کرو!"
ابا کہتے۔ "اس کی موٹی عقل میں کچھ گھستا کیوں نہیں؟ گاؤدی کہیں کا!"
اماں اس کا قصور معاف کروانے کے لیے کہتیں۔ "کل یاد کرے گا،
مروا دو!" ان کی آواز میں پیار سے زیادہ رحم ہوتا۔ "جا جا کے جینے مینوں،
دھوبیوں اور بھنگیوں کے بیچ لونڈوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور وہاں سے
تھک کے آتا ہے۔" انھیں اپنا یہ بیٹا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، اور جب سے
اس نے ان کی بیوہ دیورانی کی خوشامد کی تھی، تب سے تو وہ اس سے
چڑنے لگی تھیں۔ لیکن اسی وجہ سے اماں بڑی کوشش کرتیں کہ اس کے ساتھ
نرمی اور محبت سے پیش آئیں، حالانکہ اس کوشش میں کامیابی انھیں کم
ہی ہوتی تھی۔

جب میں نے اماں کو گنیش کی طرفداری کرتے سُنا تو مجھے بڑا غصہ آیا
اور میں اس بات کا یقین حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میری اماں صرف میری ہیں
اور کسی کی نہیں ہیں۔ اس کی نوبت نہ تھی کہ پکار کے اماں کو بلا لیتا، میں نے
چپکے سے گنیش سے پوچھا، جسے ڈانٹ ڈپٹ کے بیٹھک سے بھگا دیا گیا تھا۔

"اماں آ رہی ہیں؟"

"نہیں وہ رسوئی میں ہیں۔" گنیش نے جواب دیا۔

میں نے اس سے کہا۔ "ان سے کہو کہ میں بلا رہا ہوں۔"

چونکہ گنیش ابھی ڈانٹ کھا کے آیا تھا اور چونکہ ہم اس وقت گھر
پر تھے اس لیے اس نے میرا کہنا سُن لیا اور اماں کو پکارا۔ اماں نے

نرمی سے جواب دیا،
" اس سے کہو سو جائے ۔ میں رسوئی میں کام کر رہی ہوں ، اور گپتا کا بچہ
ہٹ وہاں سے نہیں تو شیرو بھونکنے لگا :"
میں نے ان کو اپنے پاس بلانے کے لئے کہا ۔ " شیرو نے پیشاب کر دیا ہے ،
ملنے جاؤ ، جا کے اسے سلا دو ، مت اتنا دنگا مچاؤ ۔" ابا نے کہا امی نے
کہ سول اینڈ ملٹری گزٹ پڑھنے میں خلل پڑ رہا تھا ۔ " اس منو کو حساب نہیں آتا
اور اس گدھے کو نظم نہیں یاد ہوتی ۔ اس سال یہ لوگ ضرور فیل ہوں گے :"
" پاس ہو جائیں گے ، پاس ہو جائیں گے " اماں نے جواب دیا ۔ " تم تو
ذرا سی بات میں پریشان ہو جاتے ہو ۔ اتنے کم دل کے کیوں بنتے ہو ، کچھ
ہوا اور ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ بھگوان ضرور ان کی مدد کریں گے ۔ میں ان کے
لئے پرارتھنا کروں گی ۔۔۔۔۔ "

امتحان کے دن اماں اپنے بھگوانوں کی مورتیوں کے سامنے بیٹھیں تاکہ امتحان
پاس کرنے میں ان کی مدد مانگیں ۔ لیکن ہم نے ان سے کہا کہ اس کے بجائے وہ
پہلے سے جلدی سے کھانا پکا دیں تاکہ ہمیں دیر نہ ہو اور اب وہ اپنی پوجا نہ
کریں ۔ لیکن انھیں بھلا کون روک سکتا تھا ۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ
ہم بھی آ کر ان کے ساتھ پوجا کریں ۔ اور انھوں نے اپنی پوجا اور جلدی کر دی ۔
اور آخر کار جب ابا نے ذرا ڈر سے ان سے کہا کہ کھانے میں جلدی کریں ،
اور پھر ہم جلدی جلدی گرم گرم نوالے نگل کر دھلی قمیص شلوار پہن کر بھاگے ہوئے

تھے تو انھوں نے کہا کہ ٹھہرو۔ انھوں نے تیلی میں توے کی کالک لا کر سلائی سے ہماری پلکوں پر کاجل لگایا تاکہ ہمیں راستے میں کوئی نظر نہ لگائے۔

صرف اس منتی اور دعا کی رسم پر انھیں اطمینان نہیں ہوا بلکہ انھوں نے ہمارے ماتھے پر لال تلک لگا کر ہمارے بھاگیہ جگانے کی کوشش بھی کی۔ پھر انھوں نے دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ چاندی کا تعویذ، جس میں ہاتھی کا بال، ہرن کا مشک اور چھپا ہوا کاغذ رکھا تھا، سیاہ دھاگے میں بندھا ہوا ہمارے گلے میں پڑا ہے اور پھر جیسے یہ سب بھی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بدی کو دور رکھنے اور خوش قسمتی کو یقینی بنانے کے واسطے کافی نہیں تھا اس لیے انھوں نے بہشتی کو حکم دیا کہ وہ گھڑا بھر کر لے آئے اور ہم جب گھر سے نکلیں تو ہمیں ملے۔ بد قسمتی سے پنڈت جے رام، جو دوسرے موقعوں پر بڑے مقدس آدمی سمجھے جاتے تھے، لیکن جب کسی ضروری کام سے جانا ہوتا تو ان کا ملنا بڑا منحوس سمجھا جاتا تھا، ہمارے کوارٹر کے سامنے سے رجمنٹ کے پاخانوں کی طرف تیز تیز نکل گئے اور انھوں نے گویا، اور ہمارے بیچ کا راستہ کاٹ دیا۔ اماں بڑی پریشان ہوئیں، لیکن اب وہ ہمیں واپس بھی نہ بلا سکتی تھیں اس لیے کہ یہ اور بھی بڑی بدشگونی ہوتی اور ویسے بھی ہمیں یہ ڈر تھا کہ [illegible] ہماری جان لے لیں گے تو بھی ہم لوٹ کر نہ گئے۔ اس لیے کہ آج کے دن دیر سے اسکول پہنچنے کا ڈر ہمارا برا حال کیے ہوئے تھا اور ہم چلے گئے۔

جب ہم اسکول سے اپنی ٹوپیاں اچھالتے اور اپنے بستے سنبھالتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کے چلاتے خوش خوش آئے کہ ہم دونوں پاس ہو گئے ہیں تو انھوں

سے یہی سمجھا کہ ٹوٹکوں، تعویذوں اور کیسر کے تلک کی وجہ سے یہ جن کو دیکھنے کا اثر زائل ہوگیا اور ہم کامیاب ہوئے۔

اب ابا نے خوب خوب ڈینگیں ماریں اور اپنی تعریف کی۔۔

صوبیدار میجر گرو کا سنگھ کے گھر کے سامنے جو لوگ جمع تھے، جن میں حوالدار سرجن، پنڈت جے رام اور دوسرے افسر، این۔ سی۔ او اور چپا بھی تھے اور جہاں اپنے ابا کو دیکھ کر ہم بھی دوڑتے ہوئے جا پہنچے تھے، انھوں نے سب سے کہا۔ "آخر کو میں نے انھیں گھر پر خوب پڑھایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ سال بھر کی پڑھائی اس نے چار مہینے میں پوری کی اور جبکہ چوٹ پوری طرح اچھی بھی نہ ہوئی تھی۔۔۔۔"

"بڑے باپ کے بڑے بیٹے" صوبیدار میجر گرو کا سنگھ نے کہا، اور ابا یہی سننا چاہتے تھے۔

ابا نے کہا: "بھگوان ان کو لمبی عمر دے اور ان پر اپنی دیا کرے!" لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا: "تاکہ یہ لوگ خاندان کی عزت میں اضافہ کریں۔" اس لیے کہ گھر پر وہ اس بات پر زور دیتے تھے اور یہی ان کے نزدیک بچوں کی اصل منزل مقصود تھی۔ اور سب کے سامنے انھوں نے ہم سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا۔ اور گھر میں جو نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتے وہ بھی انھوں نے نہیں کی۔

میں نے جو اپنی اتنی تعریف ہوتے دیکھی تو اس سے فائدہ اٹھا کر جھٹ کہہ دیا: "اب میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا بڑا بھائی گنیش ایک سال فیل ہو جائے تاکہ میں اور وہ ایک ہی درجے میں ہو جائیں۔"

اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور بعضوں نے پیار سے میرے کان کھینچے اور مجھے "بدمعاش" کہا جس پر میں نے بڑا فخر محسوس کیا اور پھول کر کُپّا ہو گیا۔

لیکن مجھے جب یہ احساس ہوا کہ میرا بڑا بھائی موجود ہے تو میں یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اپنی دلی خواہش کو اس طرح کھلم کھلا ظاہر کر دینے کے نتیجے میں اب پتہ نہیں مجھے کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لیکن میری بیماری کے بعد سے گنیش نے میرے مقابلے میں سب کے سامنے اپنی کمتری کو مان لیا تھا اور امتحان میں کامیابی کی وجہ سے مجھ میں بلا کی خود پسندی پیدا ہو گئی تھی۔

٨

بعد کو ان دنوں کی یاد میں ایک واقعہ مجھے بے حد خوبصورت اور دلکش یاد آتا ہے۔ امتحان کے بعد کی چھٹیوں میں، میں اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ اپنے نانا کے گھر ڈسکا گاؤں گیا۔ میرے سب سے بڑے ماموں شرم سنگھ کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ خود ہم سب کو لینے آئے تھے اور پھر اس مبارک موقع کے اخراجات کے لیے روپے پیسے بھی ادھار لینا چاہتے تھے۔ اور ہم بچوں نے اپنے ماموں شرم سنگھ اور اپنے والدین کے بیچ میں کچھ تناتنی بھی محسوس کی اس لیے کہ ماں نے بعد میں یہ کہا تھا کہ "میرے میکے والے ہمیشہ بے شرم بن کر اپنے داماد سے روپیہ مانگنے آ جاتے ہیں۔" (مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ "ایسا تو کہیں نہیں ہوتا")۔ بہرحال آخر میں یہ نظریہ ہی ثابت ہوا کہ "اپنا خون اپنا ہی خون ہوتا ہے":

ڈیڈی کا خیال یہ تھا کہ امتحان کے لیے ہم نے جو محنت کی ہے اس کے بعد ہمیں چھٹیوں میں آرام کی ضرورت ہے اور اماں کو بھی ذرا شہر سے نجات مل جائے گی۔ جو ادھر کچھ دنوں سے آئے دن بیمار رہتا تھا۔ چنانچہ منے کو چھوٹی اماں گوری بی کے پاس کر دیا گیا۔ اور ہمارے سب اچھے کپڑے اور گہنے ٹرنکوں میں بند کیے گئے اور رات کی گاڑی پر ہم لوگوں کو نانے گجرانوالہ جانے کے لیے سوار کر دیا، جہاں سے ہمیں بیچ میں ڈسکہ جانا تھا۔

سب سے پہلی چیز جس نے میرے بچے دماغ پر اثر کیا وہ گجرانوالہ شہر کا گندہ پن اور بے تکا بے ہنگم باہری علاقہ تھا جو خوش رو چھاؤنی خاص طور سے اس کی لال کی کی، جہاں انگریز افسروں کی بارکیں تھیں، صاف ستھری، نئی سنوری اور افراط دنیا سے کتنی مختلف تھا۔ گجرانوالہ کی گنجان تنگ گلیاں، جن کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے گھر تھے جن کی دیواروں پر اوپلے چپکے ہوئے تھے اور جہاں بیچ سڑتی ہوئی گوبر سے بھری نالیاں تھیں، دیکھ کر میرا جی ڈوب گیا۔ اور میں رونے لگا اور میرا یہ رونا اس وقت تک جاری رہا جب تک ریلوے اسٹیشن کے باہر والے اڈے پر پہنچ کر سواریوں کو لانے والے یکے والوں سے بھاڑا طے کر کے ہم ڈسکہ کے لیے روانہ نہیں ہو گئے۔ اس وقت بھی میں کچھ خوش نہیں تھا حالانکہ اماں نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ گجرانوالہ شہر کا تو نام ہی گوجروں، مویشی پالنے والوں کے نام پر رکھا گیا ہے اور یہ گندہ اسی لیے ہے کہ یہاں گائے بھینسیں بہت ہیں۔

جب شہر پیچھے رہ گیا اور کھیتوں کی ہوا کا نشہ چڑھنے لگا تو میں اپنی ماں

کی گود میں سو گیا۔ کچی سڑک پر گاڑی کے ہچکولے کھانے سے اور بھی جلدی نیند آگئی۔ لیکن جب کوئی گھنٹے بھر بعد میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اور میرے بچگانہ تصور نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لمبے پڑے رقبے کو اتنا ہرا بھرا بنانے میں گھاس کی کتنی پتیوں، اور لہلہاتے پودوں کے کتنے ڈنٹھلوں اور بیری کی کتنی ہری پتیوں کا ہاتھ ہوگا۔ معلوم ہوتا تھا پچھلی رات بارش ہوئی ہے اس لیے کہ دھول تو بالکل تھی ہی نہیں اور سڑک کی مٹی بھی بھوری مائل نیلی سی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اس پیارے بھرے دن میں ہر چیز اس وافر طراوت میں لپٹی ہوئی تھی جو نوشہرہ کی بنجر پہاڑیوں کے سامنے کے چٹیل منظر سے، جو میرے بچپن کا پس منظر تھا، کتنی مختلف تھی۔

جب ہم گاؤں کے نزدیک پہنچے تو منظر بدل گیا اور چاروں طرف سرسوں کے پھولوں سے زرد کھیت پھیلے ہوئے تھے جو سویرے کی ہلکی ہوا میں لہرا رہے تھے اور صریحاً شفاف۔ نیلے آسمان سے دھوپ برس رہی تھی۔ اس میں کی زردی اور اس آسمان کی نیلاہٹ نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیا کہ جب کبھی ان دو رنگوں کا مجھے خیال آیا تو ساتھ ہی وسطی پنجاب کے ان لہلہاتے کھیتوں کا نقشہ بھی میری نگاہوں میں پھر گیا۔ شاید خاص طور سے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے پہلی بار ایک بڑا گاؤں دیکھا تھا اور ان کھیتوں سے گھرے ہوئے بہت سے کچے مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے جو سرحد کے گاؤں کے قلعہ نما اور الگ الگ گھروں سے بڑے مختلف تھے اور اس لیے کہ یہ وہ گاؤں تھا جہاں ہماری اماں پیدا ہوئی تھیں، جو ان تمام کہانیوں کا لازمی جزو ہوتا تھا جو انہوں

بنے ہم لوگوں کو سنائی تھیں اور یہ ان کے باپ نونہال سنگھ کا گاؤں تھا جنھوں نے آخری سکھ لڑائی میں انگریزوں کے خلاف جو بہادری کے کارنامے انجام دئے تھے، وہ میرے ذہن پہ پاس ہی کے شہر سیالکوٹ کے افسانوی ہیرو راجہ رسالو کی کہانیوں کی طرح نقش تھے۔

ایک ہی نظر میں، حیرت سے پھٹی ہوئی میری آنکھیں بھلے چوڑے سکھ کسانوں کو اپنے پھاوڑوں سے نالیاں کھودتے یا سروں پہ گھاس کے بڑے گٹھے رکھے ننگے پاؤں جاتے دیکھتیں اور ان کی عورتیں سروں پہ سرسوں کے تازہ ساگ کی ٹوکریاں رکھے مویشیوں کو ہنکا کے لیجاتے نظر آتیں۔

میرے ماموں شرم سنگھ پورے راستے چپ چپ تھے، لیکن اب وہ بڑے فخر کے ساتھ ہم بچوں سے کہہ رہے تھے کہ چند ہی دن میں وہ گھر کی بھینسوں کا دودھ پلا پلا کے ہم بچوں کو خوب موٹا کر دیں گے۔ اماں کو شاید ان کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی، اس لیے کہ اس میں یہ پہلو بھی نکلتا تھا کہ ہمیں اپنے گھر میں اچھا کھانا نہ ملتا تھا۔ پھر شرم سنگھ نے دوسری بات چھیڑی، اپنی بہن کو گاؤں کے ان لوگوں کے بارے میں بتانے لگے جن کو وہ شادی سے پہلے جانتی تھیں۔ لیکن میں ان کی بھینسوں کے بارے میں زیادہ باتیں جاننا چاہتا تھا اور اپنے ماموں سے طرح طرح کے سوال پوچھتا، جیسے کہ بھینس کا نام کیا ہے اور وہ کتنا دودھ دیتی ہے اور کیا کھاتی ہے اور میں نے تو ضد کر کے ان سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ مجھے دوہنے، اسے چرانے لیجانے اور پھر اپنے ساتھ شہر لیجانے دیں گے۔

آخر کار سڑک ختم ہو گئی اور ڈسکا کی پولیس چوکی کے سامنے ایک چبوترا ہے پر سے پھر مڑ کر ایک پتلے سے بازار میں آ گیا جہاں کسان ہی کسان نظر آتے تھے، جنھوں نے ہمارے ماموں شرم سنگھ اور ہماری اماں سے ست سری اکال کی اور ہم لوگوں کو آشیرواد دیا اور پھر ہم ایک گلی میں سے ہو کر نانا نہال سنگھ کی حویلی کے سامنے پہنچ گئے، چوکھٹ کے کونوں پر کچھ تیل ڈالا گیا اور ہم شرماتے شرماتے صحن میں داخل ہوئے۔ خاص طور سے اس لیے اور بھی شرمائے کہ اماں رواج کے مطابق ایک لمبی گوری عورت سے لپٹ کے خوب چیخیں بکیں، روئیں۔ بہت بعد کو پتہ چلا کہ وہ ہماری نانی گجری تھیں۔ پھر اماں نے نانا نہال سنگھ کے پاؤں چھوئے جو اندر کسی کمرے میں سے نکلے، سفید کپڑے پہنے ہوئے لمبے اور دبلے پتلے بوڑھے، نوکیلی ناک، تیز آنکھیں اور بڑی خوبصورت بھوری سی سفید داڑھی!

اماں نے ہمیں ٹہوکا دیا — "نانا اور نانی سے پائے لگی کہو۔"

اور ہم دونوں بھائیوں نے اپنے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور اپنے بڑوں کے پاؤں چھوئے۔

نانی نے دکھاوے کے لیے یوں ہی ہم لوگوں کو پیار کیا اور نانا نے ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا اور باری باری سے ہمارے چہروں کو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لیا، اور پرکھا کہ ان کی باغیانہ اور نڈر سرشت میں سے ہمیں کتنا ورثے میں ملا ہے۔

میں تو تھا ہی سر چڑھا اور منہ لگا، میں اچھل کے ان کی گود میں جا بیٹھا

اور میں نے ان سے پوچھا کہ ماروں شرم سنگھ نے ہم کو جن جنّیں کے بارے
میں اتنی ساری باتیں بتائی ہیں کیا ہم اسے اپنے ساتھ نوشہرہ لیا سکتے ہیں۔
جس پر ؟؟ نہال سنگھ ہنسنے لگے اور ہم سے بولے کہ پہلے چل کے جنّیں کو دیکھ
تو لو اور چونکہ وہ بھی اس خیال و بات چیت میں شریک ہو گئے کہ سوچیں ہم لوگوں
کے ساتھ جائے گی اس لیے ہم تو ان پر مرنے اور بہت ہی غور سے ان کی باتیں
سننے لگے جو وہ پھر یہ کہاوتیں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے ساتھ کہتے جاتے
تھے اور جس سوچیں جنّیں اور باڑے میں بند تھے ہوتے دوسرے جانوروں کے
باڑے میں بجاتے تھے۔ چند سیکنڈ میں ہم پھر سے دوست بن گئے اور ہمیں ایسا لگنے
لگا کہ انہیں تو ہم جب سے پیدا ہوئے تبھی سے جانتے ہیں۔

نیلے آسمان پہ دھندلکا چھا رہا تھا اور جب ہم مویشی باڑے سے باہر
نکلے تو ایسا لگ رہا تھا کہ ڈسکا کے کچے گھروں کی چھتوں پہ بالکل سناٹا چھا گیا تھا
اور پھر جیسے کہیں دور سے، گھروں کی اوٹ سے دبی دبی پوجا کی آواز، منتروں
کی صدا اور گھنٹیوں اور سنکھ کی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ ناتا نہال سنگھ
نے چپکے چپکے خود کچھ سکھ بانیاں پڑھنی شروع کیں۔ ساتھ ہی وہ مالا بھی پھیرتے
جاتے تھے اور ہم سے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد باتیں کرتے
کرتے انھوں نے ہم لوگوں کا ہاتھ منہ دھلوایا اور ہم کو سوکھی روٹی، دنیاں
گوشت اور ترکاریاں کھلائیں جن میں وہ چمچے بھر بھر کے نمک ڈالتے جاتے تھے
اور ہم میں سے ہر ایک کو باری باری سے تلوں کی خوشبو بھری پیڑھی پہ

گھر کے سب سے بڑے کمرے کی اوپر والی چھت پر لیجایا گیا جہاں ایک قطار میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور جب نانا نہال سنگھ ہم لوگوں کو اپنے ہی پلنگ پر لٹا چکے تو ہمارے دونوں چھوٹے ماموں دیال سنگھ اور سردار سنگھ آ گئے، جو پاس کے کسی گاؤں گئے ہوئے تھے۔

نانا نے اپنے بیٹوں سے کہا: "یہ ہیں تمہارے بھانجے۔"

"یہ تو اپنے باپ سے زیادہ اپنی ماں کو پڑے ہیں۔" ماموں دیال سنگھ نے کہا جو بڑے بیٹے تھے مسکراتے ہوئے پورے دل کے ویسے تھے۔ "انھیں ہم لوگ یہیں رکھ لیں۔"

"ان لوگوں کے لیے مٹھائی لائی جائے۔" سردار سنگھ ماموں بولے، جن کا چہرہ سرخ سیب کی طرح ہو رہا تھا: "میں ابھی جا کے بڑی لے آتا ہوں۔" اور وہ چلدیے۔

مجھے پتہ نہیں کہ یہ ان گاؤں والوں کے برتاؤ کی سادگی تھی، یا ان کی دریادلی، یا وہ محبت جس سے یہ لوگ پیش آتے تھے جو ہم لوگ ان سے اتنی محبت کرنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ جو بالکل ان کے گرویدہ ہو گئے تو اس کی وجہ ان کی محبت اور ان کی مہمان نوازی تھی۔ اس لیے کہ ہم جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے ہمارے والدین سے ہمارے تعلقات نہ صرف یہ کہ خراب ہوتے گئے بلکہ بہت ہی کاروباری اور کھنچے کھنچے ہوتے چلے گئے تھے، اور ان سیدھی سادی خوبصورت روحوں کی دوستی نے ہم کو اندر تک بدل دیا۔ ہم میں ایک نئی سی خوشی پیدا کر دی، ایسا لگا جیسے کونے کے اندھیرے میں چھپا ہوا

خزانہ ہمیں مل گیا۔

اور اس خزانے کا سب سے قیمتی ہیرا نہال تھے۔ نانا کو ان کے بیٹے نہال ہی کہتے تھے۔ وہ لوگ ایک خاندان میں اتنی بے تکلفی اور اتنی محبت اور شفقت کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

بڑے میاں نے ہم لوگوں کو انگریزوں کے خلاف آخری سکھ لڑائی میں اپنے کارناموں کے قصے سنائے: "میں نے خالصہ کے لیے جنگ کی اور میں جانتا ہوں کہ تمھاری ماں بھی میری طرح باغی ہے۔ اس لیے کہ میرے اس کے دل میں فرنگیوں سے نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ فرنگیوں نے ہم کو لڑائی میں نہیں ہرایا بلکہ غداروں کے ذریعے ہم کو خرید لیا۔ میں تو خالصہ کے لیے لڑا اور مجھے امید ہے کہ تم لوگ بھی بڑے ہو کر میری اور اپنی ماں کی طرح فرنگیوں کے خلاف باغی بنو گے۔ اپنے باپ کی طرح تم لوگ نوکر نہ بن جانا......"

ہمیں بغاوت کی سچائی کا یقین دلا کر بڑے میاں کافی دیر کے لیے کھو سے جاتے اور گردوں کے: "مرگ ملا" جیتے جیتے اپنے ہی الفاظ کی روح میں ڈوب جاتے، اور ٹھیک اس وقت جب میں اور گنیش اونگھنے لگتے تو وہ پھر زور سے بول کر ہمیں چونکا دیتے۔

"بیٹو، میں نے تو خالصہ کے لیے جنگ کی، لیکن میرے چچیرے بھائی ہربنس سنگھ کی طرح کے بھی تھے جو فرنگیوں کے ہاتھ بک گئے، اور دوسروں کی زمینیں ہتھیا کر سردار بن گئے۔ مگر بیٹو، یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ غریب کی روٹی

چاہے سوکھی ہی ہو گر دن اسی کے بلے پوستے ہیں:

اور پھر وہ اپنی یادوں میں گم ہو جاتے اور اپنے دھرم کے منتر پڑھتے رہتے اور مالا جپتے رہتے۔ اور رات کے گھور اندھیرے میں ان کی سفید ڈاڑھی اور سفید کپڑے چمک رہے تھے اور کوٹھے کی چھت پر ایک جگنو چمکتا ہوا آجاتا اور پھر اسی طرح اوجھل ہو جاتا جیسے رات کے اس سرے پر جا رہا ہے اور پھر کبھی نظر نہ آنے لگا کہ اتنے میں دوسرا جگنو آجاتا اور پھر میں اپنی آنکھیں پوری کھول دیتا۔

نانا جان پھر کہتے۔ "دولت تو آنی جانی ہے بیٹا۔ لیکن ہل چلانے والا تانا بانا پیشے میں کبھی کھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اور میں نے اس بستے بڑے گھر کو سنبھال رکھا ہے۔ ہم نے اور تمہارے ماموؤں نے بڑی محنت کی۔ اگر ہم لوگ خوش ہیں۔ اس لیے کہ جو محنت کرتے ہیں وہ بادشاہ کی طرح کھاتے ہیں۔ اور تمہاری نانی ـــ اب کیا بتاؤں ؛ یہ نانا ابا۔ "تازہ مکھن اور اچھی بیوی تو جانو جنت کے تین ستون ہیں!"

میں فوراً پوچھ بیٹھا۔ "نانا جنت آسمان میں ہے؟"

نانا نے بتایا: "ہمارے گرو نانک دیو کا کہنا ہے کہ جنت اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی کی ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ آدرش زندگی کو جنت کہتے ہیں...... اور پھر انھوں نے گرو گرنتھ صاحب میں سے بانیاں پڑھ پڑھ کر گرو نانک کا ارشاد سمجھایا اور ہم نظم کی ثنا جاتی تے اور ان کے اصول کی غیر واضح نوعیت کی وجہ سے جلد ہی غافل ہو گئے۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات میں نے نیند کو دور رکھنے کی بڑی کوشش کی اس لیے کہ جاڑے اور گرو جب اندھیرا اور گہرا ہوا۔ رات بھیگی تو مکانوں کی چھتوں پہ پیل پیل

ہونے لگی، ہر طرف قہقہے اور دعائیں اور سکھ کا بھرپور گونجنے لگی جیسے پورے گاؤں میں لوگوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور نیا جیون پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ دن بھر کا کام کاج ختم کر کے رات کے آرام کے لیے واپس آ رہے تھے اور زندگی کی سطح پر اُمنڈ رہے تھے، سوچیں مار رہے تھے.....

صبح سویرے ماموں دیال سنگھ نے ہمیں اُٹھایا اور پوچھا کہ ہم ان کے ساتھ کھیتوں کی طرف اور پھر سورج نکلنے سے پہلے نہر میں نہانے چلنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اور باوجود اس کے ہماری آنکھیں مندی جا رہی تھیں، نیند ابھی پوری نہ ہوئی تھی، لیکن نہر کے نام ہی نے جیسے ہم پر جادو سا کر دیا۔ اس ولایت سے جب ہم لنڈا ندی کے کنارے سیر کو جایا کرتے تھے اور خاص طور سے جب ابا ہم کو تیرنا سکھاتے تھے، ہم کو تیرنے سے اتنی خوشی ہوتی تھی جتنی کہ بچے کو مٹھائی ملنے کے علاوہ شاید ہی کسی چیز سے ہوتی رہی ہو۔ میں اور گنیش فوراً اٹھ بیٹھے، آنکھیں ملتے، لڑکھڑاتے مگر خوش خوش ہم ماموں دیال سنگھ کے ساتھ چل دیے ___ جنھوں نے ہمیں بتایا کہ نانا نہالو، ماموں شرم سنگھ اور ماموں سردار سنگھ تڑکے ہی کھیتوں کی طرف جنگل پانی کے لیے جا چکے ہیں۔

"ماموں دیال سنگھ، جنگل پانی کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا
اصل میں اس لیے کہ مجھے نانا سے ملنے کی آتا دلی پڑی ہوئی تھی، اس بوڑھے انسان نے میرے اندر محبت کی جو گرمی پیدا کر دی تھی وہ دل میں گھر کیے ہوئے اور جگہ جگہ میں سرایت کر جانے والی تھی۔

"بیٹا، یہاں دیہات میں ہم لوگ کھیتوں میں پاخانے جاتے ہیں اور

کنویں پر یا نہر پر جاتے ہیں، اسی کو جنگل پانی کہتے ہیں۔

مجھے ان لفظوں کی آواز بڑی بھلی لگی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں کھیتوں کی مینڈوں پر اِدھر اُدھر آنے جانے لگا۔ گھاس اور کھیتوں کے پودوں پر رات کی اوس پڑی تھی اور اتنی زیادہ تھی کہ میرا بھولا دماغ یہ سمجھ نہ پایا کہ گھاس کی پتیوں اور پھولوں کے پیالوں میں پانی کے اتنے ننھے ننھے قطرے کہاں سے آ گئے ہیں؟ یہ معجزہ کیسے ہوا، اور جب میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے ان موتیوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی، کہ میرا ان سے شناسا ہونے کا یہی طریقہ تھا۔

میں اس کھیل میں لگ کے ذرا پیچھے رہ گیا اور ماموں دیال سنگھ دتنوں کے لیے نیم کے ایک پیڑ سے ٹہنیاں توڑنے لگے۔ یہ مقامی ٹوتھ برش، دانتوں کیلیے اور مسوڑھوں کے لیے بہت مفید سمجھے جاتے ہیں۔ جب انھوں نے ضرورت بھر کی مسواکیں توڑ لیں اور انھیں بنا لیا تو مجھے آواز دی اور ہم سب چپ ہو لیے۔ اس وقت تک مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جلوس سا بن گیا تھا جو نہر کی طرف جا رہا تھا۔

جب تک ہم فارغ ہوئے تب تک سورج کافی چڑھ آیا تھا اور کھیتوں کے راستے ہو کر نہر کے کنارے کی طرف چلے، اور اب اوس کی بوندیں سے نیزے کی طرح کی ایک ایک کرن پھوٹ رہی تھی جس کا مقابلہ کرنے کیلیے تلوار کی ضرورت تھی۔ میں نے ماموں دیال سنگھ کی کلہاڑی لے لی اور کنارے پر کھینچ کھینچ کے دو دو ہاتھ لیے اور اس لڑائی میں اس جوش و خروش کے ساتھ میں اِدھر اُدھر جانے لگا کہ ماموں دیال سنگھ کو بھی، جو اتنے نیک تھے، مجھے ڈانٹنا پڑا کہ یہ کیا پاگل پنا ہے۔

لیکن مجھے جلاکون ۔ وہ کس تھا اس لیے کہ پہلوں سے میری یہ لڑائی تو نہر میں تین بھیوں کی خوشی اور جوش کا پیش خیمہ تھی ۔ خاص طور سے اس لیے کہ گنیش پہلے ہی کپڑے اتار کر پانی میں گھس گیا تھا اور پیچھے اتار رہا تھا ۔ میں نے بھی جلدی سے کپڑے اتارے ، گھاٹ کے پاس پانی میں اتر گیا اور وہیں سے شرارت کے ساتھ گنیش پر پانی اڑانا شروع کیا ۔ حالانکہ وہ پیچھے جا رہا تھا ۔ اس پر گنیش جھنجھلا گیا اور اس نے مجھے ۔۔ وہ کنے کی کوشش کی ، لیکن میں نہیں مانا یہاں تک کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے مجھے گالی دے کر کہا کہ اب بس ۔ گالی پر تو اس سے گتھم گتھا ہو گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو دبوچے ہوئے ڈوبنے ہی والے تھے کہ ماموں دیال سنگھ نے آکر ہم دونوں کو چھڑایا ۔

ماموں دیال سنگھ نے مجھ سے پوچھا : "تو اپنے بڑے بھائی سے لڑا کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ مذاق میں روتا ہے اور میرے ساتھ کھیلتا نہیں ۔" میں نے جواب دیا ۔

"بس سے لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے ۔" ماموں دیال سنگھ نے نصیحت کی ۔

خیر گنیش کو تو میں نے جانے دیا لیکن اب مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اپنے ماموں کو جو بغیر سوچے سمجھے ہوئے صاف جواب دیا تھا اور انھیں اپنے بڑے بھائی سے اپنی دشمنی کی وجہ جو بتائی تھی اس میں میں نے بے تکلف اپنے اخلاق کی اصل وجہ بتا دی تھی ۔ اور چونکہ یہ الفاظ گاؤں کی تراشیدہ ، آزاد کھلی فضا میں کہے گئے تھے جہاں کی ہوا ہی آدمی کو ایک خاص قسم کی سادگی صفائی اور محبت کا بچھونا لگا دیتی ہے اور زندگی کے ساتھ آدمی کا رشتہ بے ساختہ

خود پر منکشف ہو جاتا ہے ۔ اس لیے یہی الفاظ ہمیشہ کے لیے اس کے بارے میں میری قطعی رائے بن گئے ۔

نہر میں نہانے کے بعد ہم ماموں دیال سنگھ کے ساتھ اس گاؤں میں واپس آ گئے جو گاؤں کے پاس ہی خاندانی زمین کے کنارے میں بنے ہوئے کنوئیں پر تھا اور جہاں نانا نہالو ، چارپائی پر بیٹھے ، جو آدھی دھوپ میں تھی اور آدھی سائے میں تھی ، اپنا دربار لگائے ہوئے تھے ۔

ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیت ہرے اور زرد تھے ان کے سر پر سایہ کیے درخت بھورے اور ہرے تھے ، اور ان کی نگاہوں کے نیچے بھوری دھرتی کا رنگ سال خوردہ سونے کا سا تھا ۔ اور وہ خود بھی اپنے سکھ گروؤں کی طرح لگ رہے تھے جن کی تصویریں میں نے نوشہرہ میں بابو چترسنگھ کے گھر کی دیواروں پر لگی دیکھی تھیں ۔۔ وہی سفید داڑھی کے ہالے میں مسکراتا ہوا سرخ و سپید چہرہ ، اور پچھلی شام سے بھی کہیں زیادہ اس وقت میں نے ان کی ملنساری اور محبت ، وہ فطری خوشی جس کے سہارے وہ ہر شخص کو قبول کر لیتے اور ہر ایک کو خوش رکھتے ، کا اثر دیکھا ۔ ان کے سامنے مجھے شرارت کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ میری طرف متوجہ ہوں ۔

جب ہم ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئے تو سرداری ماموں چھاچھ کی ایک مٹکی ، پوریاں اور آم کا اچار لائے ، ناشتے کے لیے ۔

یہ ہم لوگوں اور ان کے ماموؤں کو ، جو کھیت میں کام بند کر کے کھانے

سامنے آ گئے تھے، وہیں ہی گئی تھیں کہ ایک لمبا، پتلا، مسخرہ سا آدمی آ پہنچا، جس کی آنکھیں نکلی پڑی ہوئی تھیں اور جس کی ٹھوڑی پر بچی کھچی داڑھی تھی، اور اوپر کے لب ترشے ہوئے تھے۔ وہ نانا نہال کے پاس بیٹھ گیا۔

"دست سری کا کال، نہال چاچا۔" اس نے آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ کھانے کی مہک ملی تو سونگھتا سونگھتا آ گیا۔"

نانا نے جواب دیا۔ "آؤ فضلو آؤ، سر آنکھوں پہ آؤ۔" اور پھر انھوں نے سرداری اصول کا اشارہ کیا کہ ناشتے کا ایک حصہ فضلو کو بھی دیا۔

فضلو بولے۔ "دوست کو تو مصیبت میں پرکھو، کھانے کو جیا گن میں اور بیوی کو جب کھانے کو ایک دانہ بھی نہ ہو۔"

چونکہ نانا کچھ نہیں رہے تھے بلکہ سچ کا جاپ کر رہے تھے اور اللہ پھرتے جا رہے تھے، اس لیے فضلو کی اس کہاوت کے بعد ذرا سناٹا سا پیدا ہو گیا۔ بڑے میاں نے یہ دیکھا، اور بھنویں تان کر بڑے مُربیانہ انداز میں مسکراتے۔ لیکن فضلو دیا لا کر، اور پھر انجمن میں پڑ گئے۔ تمام پینے کے لیے انھوں نے اللہ تو پھیلا دیا، مگر زبان سے "نہیں نہیں، اور سے نہیں" کہتے رہے۔

فضلو نے پوچھا: "یہ دونوں آپ کے نواسے ہیں، چاچا؟" اور اپنی گرفت کی بھینس کھوپڑی کو تان کر، جس پر کپٹیشن کے بڑے زرد رنگ کی بچھی ہوئی تھی، ہمیں دیکھا اور پھر پوری کا نوالہ بناتے ہوئے انھوں نے پیشگوئی دینا شروع کیا: "صورت سے لگتا ہے کہ شریف لڑکے ہیں۔" پھر دو پیالیاں ایک دم ہی بجل کر بولے: "ماشاءاللہ چھوٹا والا ذرا بدمعاش لگتا ہے، وہاں خبر ہی اس نے

اپنے بڑے بھائی کی وہ گت بنائی ہے، سندریا کا سچا پوت ہے، وہ بھی تو جوانی میں ہوا سے لڑتی تھی..... مگر اللہ ان کو لمبی عمر دے، باپ تو پڑھا لکھا ہے، یہ لونڈے بھی میں سمجھتا ہوں بابو ہی بنیں گے۔ یہ تو قدرتی بات ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر سندریا کا میاں بھی آگیا ہوتا، اس لیے کہ وہ آ جاتا تو میرے لیے ایک درخواست لکھ دیتا۔ میں نے سنا ہے کہ ڈپٹی کلکٹر صاحب بہادر سب غریب کسانوں کی مالگذاری کم کرنے والے ہیں، تو میں نے سوچا کہ میں بھی ایک عرضی دے دوں....."

"کہاں سنا تم نے فضلو؟" ماموں دیال سنگھ نے پوچھا۔

"بھیا، میں جات کا آدمی ہوں، اور میری برادری کے بہت سے لوگ اونچی اونچی جگہوں پر ہیں۔ تم نے چودھری شہاب الدین تھانیدار کا نام تو سنا ہی ہوگا اور وہ بھی اپنی ہی جات کے ہیں۔ شیخ عبدالقادر بالشتر، اور بہت سے لوگ ہیں..... مجھے تو ایسی ایسی خبریں مل جاتی ہیں جو تم لوگوں تک پہنچتی نہیں، اس لیے کہ میں تو اپنے کان کھڑے رکھتا ہوں....."

"اور آنکھیں کھلی رکھتے ہو!" سردار ماموں نے چوٹ کی۔

"ارے چھوٹے بھیا، اب تم ہنس لو میرے اوپر، اس لیے کہ میرے پاس تو پیاز کا چھوٹا سا مربع ہے، اور تم ٹھہرے حویلی والوں کے گھرانے کے لوگ، مگر دماغ میں بھی رکھتا ہوں جو کبھی کام آئے۔"

"بیشک،" ماموں دیال سنگھ نے کہا۔ "تم جسم کو خواہ مخواہ ہلکان کرتے ہو، تمہیں تو چاہیے کہ تم اپنے دماغ ہی سے کام لیا کرو۔"

اس پر سرداری ماموں بولے: "جسم تو گیا ہی تھا اگر دماغ سے کام لیتے تو اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔"

فضلو نے ذرا چڑ کر کہا: "تو تم سمجھتے ہو کہ اگر میں اداس ہو جاتا تو میرا دماغ چل جاتا؟"

"ارے کیوں بوڑھے آدمی سے ٹھول کرتے ہو؟" ماموں شرم گل نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو ڈانٹا۔

"ہمارا فضلو تو ہیرا ہے ہیرا۔" نانا نہال نے اپنے مہمان کو خوش کرنے کے لیے کہا۔

سرداری ماموں سے چپ نہ رہا گیا: "ہیرا تو ہے مگر ان گھڑ سا ہے۔"

فضلو نے کھسیا کے کہا: "مجھے ایسا مذاق پسند نہیں، جس سے آدمی کو تکلیف پہنچے، ویسے تم جانتے ہی ہو کہ ہنسی مذاق کی تو میری بھی عادت ہے۔"

سرداری ماموں نے ان کو منانے کے لیے کہا: "اچھا چھوڑو، اگلی دفعہ ہو جائے گی۔"

"ذرا ٹھہرو میں اپنا حقہ رکھ آؤں۔" فضلو نے کہا اور اپنی تہمد سمیٹتے چلے ایک مست خورے کی طرح۔

ان کے جاتے ہی میں نے پوچھا: "ماما یہ فضلو کون ہے؟"

"بیٹا کسان ہے جس کی بہت ساری زمین قرضے کی وجہ سے نکل گئی۔ اب وہ چھوٹے سے مربعے پر گزارا کرتا ہے اور تمہارے ماموں لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"ماموں ہی کیا، سارا گاؤں مذاق اڑاتا ہے!" سرداری نے کہا۔

نانا نے انھیں ڈانٹا، "سرداری، رب کے غضب سے ڈر!"

"بابا، کچھ لوگ لمبے دن تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے کر اب قسمت کو رونا ان کی عادت پڑ گئی ہے اور انھیں میں سے فضلو بھی ہیں۔ ذرا دیکھو باتیں کیسے کرتا ہے!"

"بات چاہے کیسی ہی کرے،" نانا نے اداس ہو کر کہا، "وہ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہہ سکتا۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو تم نوجوان لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کوئی یہ نہیں دیکھ سکتا ہے کہ ان طرح طرح کی باتوں کے پیچھے فضلو کی کتنی دکھی زندگی چھپی ہے۔"

نانا کی بات کا مطلب تو میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ فضلو کا ذکر کرتے کرتے وہ اتنے اداس کیوں ہو گئے تھے، اس لیے کہ "اداس" تو مجھے بھی اتنا ہی مسخرہ نظر آتا تھا جتنا کہ سرداری ماموں کو۔

"آ گئے اپنا مقدر اٹھائے!" سرداری ماموں نے کہا۔

اور ہم نے دیکھا کہ فضلو اسی مست خودی شان سے واپس آ رہے ہیں۔ پیچھے وہ اپنے پیاز کے کھیت کی طرف گئے تھے۔

انھوں نے مجھ سے اور گنیش سے کہا، "لو بیٹا، تم لوگ کھاؤ، یہ میرے کھیت کی ہیں۔" اور انھوں نے ہم دونوں کو ایک ایک گانٹھ دی۔

"فضلو چاچا، اب یہ لوگ بابو ہیں، شہر والے، کوئی گدھے نہیں ہیں!" سرداری ماموں نے کہا۔

فضلو نے جواب دیا، "میرے تو بیٹے کی طرح ہیں۔ اور بچو، یہ میری طرف سے اپنی ماں کو دے دینا۔" اور انھوں نے مجھے ڈھیری بھر پیاز دی۔

"پیاز!" سرداری ماموں نے ہنسی اڑائی۔

"نہیں بیٹا، پھول" نانا بولے اور پھر انھوں نے سرداری سے کہا: "فضلو کو بچا چھوڑ دو۔"

فضلو نے بیٹھ کے چا چھوڑی اور اپنا سر جھکا لیا۔ اب ان کی آنکھیں گل چکی تھیں کی نوکرن کے اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ان کا دھوپ اور پانی میں سنولایا ہوا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور ان کی داڑھی ان کے بال اور سینے تک پہنچ گئی تھی۔ اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے "اماں جی" کی اداسی کی وجہ کو اور لمبی لمبی باتوں کے پیچھے چھپی ہوئی فضلو کی دکھ درد کو بھانپ لیا ہے۔

سب لوگ چپ تھے۔ نانا نبار نے کہا: "بیٹا جاکر کنوئیں پہ کھیلو، رہٹ پہ بیٹھ کے بیلوں کو ہنکاؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ فضلو کی طرح نانا ابا بھی اداس ہیں اور فضلو سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں بھاگ کر کنوئیں کی طرف چلا، اس بات پہ خوش کہ اس بار جم لکڑی کی سیٹ پر بیٹھ کر جس میں بیل جتے تھے میں گول گول گھوموں گا۔

گنیش بھی میرے پیچھے دوڑا مگر میں اس سے بہت آگے نکل چکا تھا تاکہ میں اس سے پہلے پہنچ کر پہلے ہی رہٹ پہ بیٹھ جاؤں۔

جیسے جیسے دن چڑھتا گیا دھوپ کی گرمی بڑھتی گئی اور دوں کی آڑ سے لوگ نکل نکل کر آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ بالیاں توڑنے کے لیے گنڈاسے اور کدال اور پھاوڑے لیے تھے۔ ہاتھ میں جوتے لیے جا رہے تھے۔ کچھ کنارے سے ہری بھری بیل گاڑیاں ہنکاتے لا رہے تھے۔ کچھ لوگ وہ ہل جوت رہے تھے۔ جو کھیت کٹ چکے تھے ان میں مویشی چرا رہے تھے۔ اور

اُفق پر بدلیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اور میں کنوئیں پر چوں چوں چوں چوں
کرتی ہوئی رہٹ سے جُتے بیلوں کے پیچھے سیٹ پر بیٹھا بیلوں کے ساتھ ایک ہی
دائرے میں گھومے چلا جا رہا تھا۔ میرا سر چکر کھا رہا تھا مگر میں مارے خوشی کے پھولا
نہیں سما رہا تھا۔ اس لیے کہ یہاں نہ حساب کرنے کی ضرورت، آموختہ دہرانے اور
نیا سبق رٹنے کی تاک کی باتیں تھیں نہ اسکول ماسٹر کے چانٹوں کا ڈر نہ اماں
ابا کی ڈانٹ ڈپٹ کا خوف۔ یہاں تو آسمان کی طرح کھلی دنیا تھی لیکن رنگ برنگ
اور پُر اسرار جیسے وہ پہیلی تھی جو اماں کبھی کبھی شام کو ہمیں بجھاتی تھیں۔ اور میرا
جسم اور دماغ اس جیالے منظر سے ہم آہنگ ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں گنیش سے
اپنی ہمیشہ کی رنجش بھی بھول گیا۔ اور بڑی خوشی سے اسے بھی اپنے ساتھ رہٹ
کی سیٹ پر بٹھا لیا۔

دوپہر کے قریب روشن صبح کی خنکی کافور ہو گئی اور خاصی گرمی ہو گئی۔ میں
اور گنیش دونوں اپنی آنکھوں کو تھوڑا تھوڑا بند کر کے کانپتی ہوئی دھند کی بھتنگ
دیکھنے کا کھیل کھیلتے رہے، یہاں تک کہ ہم تھک گئے اور بھوک بھی لگ آئی۔

لیکن اس وقت، ایسا لگ رہا تھا جیسے نانا کے گھر والے مہمان کی ضرورتوں
کے مطابق مناسب طور طریقے جان گئے تھے، کھانا بھی آ گیا، جو ایک نوکر لایا تھا۔
اس نے بتایا نانی خرم سنگھ کی شادی کے دعوت داروں میں پھنسی تھیں اور ہم سب نانا
کے پاس پیڑ کے نیچے جا بیٹھے اور ہم نے کھانا کھایا۔ مکئی کی ملائم سوندھی اور
مزیدار روٹیاں تھیں اور سرسوں کا ساگ، ڈھیر سارا مکھن اور دہی اور اچار
بچا کچھ۔ مجھے کبھی نہ بھولے گا کہ میں نے یہ کھانا کتنا مزا لے لے کے کھایا تھا۔

اس لیے کہ پہلی بار کوئی ہمیں روکنے والا نہ تھا کہ کم کھاؤ، اور اس لیے بھی کہ کھانے میں جو لذت تھی وہ اس بات کی تھی کہ چائے اور بادام، چیزیں ساری رکابیوں میں ڈالے جاتے اور اصرار کرتے جاتے کہ اور کھاؤ۔

کھانا ختم ہوتے ہوتے چائے اوپر اور ساری دھرتی پر غنودگی طاری ہو گئی۔ یہ چائے، سیبوں کی آسودگی اور سفر کی تھکن، چڑھتی ہوئی گرمی اور دھوپ کی تیزی کا اثر تھا۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا اور ہم نانا ابا کے پاس پڑی ہوئی ایک اور چارپائی پر لیٹ کر سو گئے۔

جب ہماری آنکھ کھلی تو دھوپ اتر چکی تھی، اور تھوڑے فاصلے پر سرداری اور بیٹھے ہوئے شربت بنانے کے لیے بادام چھیل رہے تھے۔ ہم نے کنویں کے تازہ پانی سے ہاتھ منہ دھوئے، پھر ہمیں دودھ بادام دیا گیا۔ اس شربت کے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کا عادی ہونا اتنا ضروری ہے کہ مجھے پسند نہ آیا اور بچے اُسے پیتے پیتے رہ گئے۔

چائے اور اپنے اپنے کام ختم کر چکے تھے۔ ماسٹر شرم سنگھ نے سنبھال کے لیے پانی کی نالی کھودی تھی اور سرداری اور دودھ بادام بنا چکے تھے اور اب جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

ماسٹر شرم سنگھ نے مجھ سے کہا: "اگر تم انہیں اپنے ساتھ لیجانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو، میں تمہیں دکھاؤں کہ انہیں کو نہلاتے، کھلاتے اور دوہتے کس طرح ہیں؟"

میں بڑے شوق سے ان کے ساتھ ہو لیا اور میں نے اصرار کیا کہ وہ انہیں

اور بیلوں کے لیے جو ہرا چارہ لے جا رہے ہیں اس کا ایک گٹھا مجھے بھی لے لینے دیں۔
گنیش تو رک گیا تانا نبار کے ساتھ گھر جانے کے لیے اور میں ماموں شرم سنگھ کے
ساتھ چل دیا جو چرواہوں سے بھینسیں لینے جا رہے تھے۔

جس کی طرف سے مویشی آ رہے تھے اس کے دونوں طرف دھول کے بادل
چھائے ہوئے تھے۔ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا اور ماموں شرم سنگھ کو سوہنی کو پہچاننے
میں بھی دقت ہوئی۔ لیکن پھر انھوں نے دیکھ لیا اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے الگ
کر لیا۔ اور فضا میں چھائے ہوئے سنہرے ذروں کے بیچ میں سے ہو کر بھینس کے بچھڑے
جو تالاب پر پہنچے، جس کا سبزی مائل نیلا پانی گاؤں کے باہر شیشے کی طرح ساکت
لگ رہا تھا۔ اور گاؤں کے کتنے مویشیوں کو دیکھ کر جو تک رہے تھے، مرد عورتیں
ایک دوسرے پر چلا رہے تھے اور چرواہے ایک ایک مویشی سے پکار پکار کر کہہ
رہے تھے کہ ادھر ادھر نہیں بھٹکنا ہے، سیدھے گھر جاؤ۔ ساری فضا گونج رہی تھی۔
اور تیسرے پہر کا سورج میری ہڈیوں میں حرارت کر رہا تھا۔ بھینس لینے کے وقت بھی
خوشی کا رنگا رنگ، صحت مند اور چیلا احساس اس نئی خوشی سے اور بڑھ گیا جو
مجھے اس وقت ہوئی تھی جب میں نے یہ دیکھا کہ میں بھینس پر سوار ہوں اور اگر
چاہوں تو اسے ہانک کر اپنے گھر، نوشہرہ چھاؤنی لے جا سکتا ہوں۔

لیکن سوہنی بھینس کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس کو احساس ہوا کہ اس کی
پیٹھ پر کوئی اجنبی بیٹھا ہوا ہے اور اسے یہ بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ اجنبی کوئی بچہ سا
ہے اور اس کو یہ بات ناگوار گزری ہوگی اس لیے کہ اس نے میرے ذرا سے
ایڑ لگانے پر فیصلہ کر لیا کہ بھاگ کر سیدھے تالاب میں چلی جائے گی اور مجھے ڈبو دے گی۔

سوچی کے اس فیصلے پر پہلے ماموں شرم سنگھ کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس پر چیختے
ہوئے کہ انھوں نے "احمق ہی ہے" بھینس کی پیٹھ پر سوار کرا دیا اور اس ڈر سے کہ بھینس میں
بیچ ہی ڈوب نہ جاؤں انھوں نے چلا چلا کر مجھ سے کہا کہ میں نے پاؤں سے بھینس کو
ایڑیں ماری۔ اس پر سوچی شاید یہ سمجھی کہ ڈانٹ اسے ہی پڑ رہی ہے جو اُسے اور
برا لگا اور وہ اور زور سے بھاگنے لگی اور چھلانگ مارتی اور ڈبکی لگاتی بھرے پانی میں پہنچ
کر تقریباً بیچ تالاب تک پہنچ گئی۔ ایسی صورت میں یہ معجزہ ہی تھا جو میں سوچی کی
پیٹھ پر کسی نہ کسی طرح چپٹا رہا۔ اگرچہ میں بے انتہا ڈرا ہوا تھا اور مارے خوف کے چیخ رہا
تھا، حالانکہ چیخ میرے منھ سے نہیں نکل رہی تھی۔

اتنے میں چرواہوں کا ایک لڑکا پانی میں کود پڑا اور تیزی سے تیرتا ہوا سوچی کے
پاس پہنچا اور اس نے مجھے اس وقت تک پکڑے رکھا جب تک ماموں شرم سنگھ
نہیں آ گئے۔ ماموں شرم سنگھ اپنے کندھے پر بٹھا کر مجھے کنارے پر لے گئے اور یہ
سوچ سوچ کر انھیں غصے سے پسینے آ رہے تھے کہ میں ڈوب کر مر ہی گیا ہوتا۔
لیکن اب مشکل یہ تھی کہ سوچی کو منانا تھا کہ اتنی سی بات پر روٹھیں نہ
کہ ایک لڑکا ان کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور اب گھر چلیں۔

کوئی آدھے درجن آدمیوں نے بانسوں سے کوئی دو گھنٹے میں سوچی کو
تالاب کے پانی اور کیچڑ سے باہر نکالا۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ ماموں شرم سنگھ نے
مجھے اس بات پر پھر کبھی معاف نہیں کیا کہ میں نے اس دن ان کو مصیبت میں ڈال دیا تھا۔
انھوں نے میرا مذاق اڑایا: "کچھ بھی ہو آخر ہو تو شہری بابو لوگ!"

جب ہم گھر پہنچے تو شادی کے انتظامات کے سلسلے میں صحن میں بڑی گہما گہمی تھی۔ آنگن کے ایک کونے میں صرف دھوتی باندھے ہوئے ایک موٹا سا حلوائی برادری میں بانٹنے کے لیے امرتیاں تل رہا تھا اور اس کے دو میلے چکٹ چیلے اپنے سدھے ہوئے ہاتھوں سے لڈو بنا رہے تھے۔

حویلی کے ہال کے پاس کچھ درزی اپنی پھرتیلی انگلیوں سے ریشمی دوپٹوں پر گوٹا اور بیلیں ٹانک رہے تھے۔

اور بڑے کمرے کے پاس عورتیں بیٹھی زور شور سے باتیں کر رہی تھیں۔

ماموں شرم سنگھ، گنیش اور میں سر کو جھکاتے ہوئے خوشی بانٹنے میں بیٹھے گئے تھے کہ اچانک میری ماں کی آواز میرے کان میں آئی۔ ایک ایسی چیخ جیسے کوئی چڑیا زخمی ہو کر چلا رہی ہو۔ اور پھر ان کے رونے اور زور زور سے احتجاج کرنے کی آواز آئی۔ سالا محرو دوسری عورتوں کی چاؤں چاؤں چاؤں چاؤں کی وجہ سے یہ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

میں نے تو شہرہ میں بھی اپنی اماں کو روتے دیکھا تھا جب ابا ان کو کوئی سخت بات کہہ دیتے، اور اپنی بیماری کے دوران، یا جب انھیں یہ خیال آجاتا کہ میرے سب سے بڑے بھائی ہرش کی شادی انھوں نے جلدی کر کے سخت غلطی کی ہے۔ لیکن میں نے ان کو اس طرح دھاڑیں مار کے روتے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔

میں ان کی طرف دوڑا، گنیش بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگا۔ لیکن ہم ان کے پاس نہ جا سکے اس لیے کہ عورتوں کے جمگھٹ سے ہم ٹکرا گئے جو ایک دوسرے کی

طرف دیکھ دیکھ کے اشارے کر رہی تھیں اور خوب زور زور سے ایک دوسرے کو کوسنے دے رہی تھیں۔

نانی آئیں اور انھوں نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ کھانا کھاؤ گے، اس پر اماں بڑے غصّے میں بولیں۔

"نہیں نہیں، میرے بچے اب تمھارے گھر پانی تک نہ پئیں گے۔ میں تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب تم کو کان ہو گئے ہوں گے اور تم یہ سمجھو گی کہ پچھلی بار کی طرح میں گالی گلوچ اور ذلت نہیں برداشت کر سکتی۔ مگر بات یہ ہے کہ میرے اچھے نصیب تم سے دیکھے ہی نہیں جاتے اور تم اس بات کو کبھی معاف نہیں کر سکتیں کہ میرے شوہر کے باپ کے پاس تمھارے دوسرے والوں سے زیادہ روپیہ ہے...."

"ہاں، تو اپنے خصم کا روپیہ اپنے پاس رکھ، ہمیں کیا اس کا طعنہ دیتی ہے؟" میری اماں کی بیوہ بہن امرت کور بیچ ہی میں بول پڑیں۔

اماں چلائیں، "خصماں نوں کھانی، تیری ہی یہ سب لگائی بجھائی ہے۔ اپنے خصم کو تو کھا گئی اب یہ دیکھا نہیں جاتا کہ میرا پتی زندہ سلامت ہے۔ جب شادی نہیں ہوئی تھی جب بھی تو مجھ سے جلتی تھی اس لیے کہ بابا نے گھر کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دے دی تھیں، اور اب بھی تو اسی سے جلتی ہے کہ میری کمر میں چھلّے سے بڑا کنجیوں کا گچھا لٹک رہا ہے۔ بہن کوئی کیا کرے تیرا شوہر تو تیرے ہی کرتوتوں مرا ہے۔ کوئی یوں تو اسے مارنے یا زہر کھلانے گئی نہیں تھی۔ ہر بار جب وہ بیمار پڑتا تو اسے چھوڑ کے یہاں بھاگ آتی تھی اور اب روتی ہے اپنے جنم کو، اپنے گھر سے بہن کے ماں کی چوکھٹ پہ ڈیرا ڈالنے کا شوق نہ کیا ہوتا...."

"نی، تو کون ہے مجھے سمجھانے والی؟" امرت کور چلائیں۔ "بابا تو جی کا
اتنا چاہتے تھے کہ نہ انھوں نے کبھی ہماری بات پوچھی، نہ جانے یہ پھول کونسی
رکھی۔۔۔۔ تو ہی سب سے بڑی تھی، اُٹھا کے سارے گہنے تیرے جہیز میں دے دیئے۔
اب اگر ان گہنوں کے بدلے میں تھوڑا سا روپیہ واپس آ جائے تو ہرج ہی کیا ہے؟"

اماں نے جواب دیا۔ "نی، یہ اندھیر دیکھو، ہائے اب تو میری ایک ایک
بات پر بھی مرتی ہے۔ کون سے گہنے ہیں؟ اپنے جہیز میں باندھ کے لے گئی؟ وہ سونے
بندے اور چاندی کے کڑے؟ ہیں بھی نہ؟ اماں موجود ہیں ان سے لے لو ای؟"

"نہیں منہ دیا، ہم نے تمھیں گلوبند بھی دیا تھا؟" نانی نے کہا۔

اماں بولیں۔ "میں جانتی ہوں، تم بھی میرے خلاف ہو۔ تمھیں یاد نہیں کہ
اس وقت گلوبند گروی پڑا ہوا تھا اور تم آنا ہی بھول گئے، کہلا بھیجا تمھیں رہی گلوبند
جانے تم شرم سے کی ہوئی ہیں نے دیا ہو۔۔۔ ہائے کیسے اتنا سا منہ جھوٹ بولتی ہو؟"
خالہ امرت کور سے جب کچھ نہ بن پڑا تو بولیں۔ "تو تو سمجھتی ہے کہ سارا زمانہ
تیرا دشمن ہے؟"

اماں چلائیں۔ "دشمن تو تو ہے، تو ہے، تو ہے۔ جب سے میں نے یہاں
پاؤں رکھا ہے پیچھے ڈال رہی ہے۔ ہائے کیسا جی جلتا ہے کہ اپنے باپ کے
گھر آؤں تو مجھے گالیاں سننی پڑیں اور ذلیل ہونا پڑے۔"

اور وہ اپنے حال پر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔

ان کے رنج سے ہم بھی متاثر ہوئے اور مجھے تو اماں کی ہمدردی میں اور کچھ
اس زور کی رلائی آئی کہ مارے ہم بھی رونے لگے۔

اماں نے کہا: "آؤ بیٹو، چلو ہم لوگ چلنے کی تیاری کریں۔ یہاں ہماری کوئی ضرورت نہیں تو ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ اس سے اچھا تو ہم آتے ہی نہ!"

امرت کور نے کہا: "جانا ہے تو جاؤ، مگر مجھے مت الزام دو۔"

"بی، چپ رہ۔" اماں نے امرت کور سے کہا۔

"ہاں ہاں امرت کور، یہ بڑی بہن سے بات کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہوا۔" ایک پڑوسن بول پڑیں۔ "اور ستدر، یا بہن تم کیوں اس کی بات کی پرواہ کرتی ہو۔ آخر کو بیچاری رانڈ ہے...."

"اچھا اچھا، تم اپنا ترس اپنے پاس رکھو۔" امرت کور نے اُسے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

اماں ویسے ہی پریشان تھیں، دوسری عورتوں کی ہمدردی پر تو دھاڑیں مارنے لگیں۔

اس وقت نانا نہا کر آ گئے اور اماں کو سسکیاں لیتے دیکھ کر اُن کے پاس گئے۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمجھانے لگے۔

"بیٹی، آ، رانی کی ان ہو، تو اس کو کیا پتہ کہ تو کتنی ہے۔ میری کسی بیٹی نے ماتیوں اور کتھیوں کی ایسی سیوا نہیں کی جیسی تو کرتی تھی۔ اور جب سے تو گئی ہے تب سے ان لوگوں نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب یہ گھر پہلے جیسا کہاں نہیں رہا۔ اور نہ وہ برکت ہی ہے جو تیرے دم سے تھی۔ یہ سب تو تجھ سے جلتے ہیں۔ امرت رانڈ ہے اور تو جاتی ہے...."

"بابا، تم ہمیشہ اس کی طرفداری کرتے ہو۔" امرت کور نے کہا اور رونے لگیں۔

نانا نے کہا۔ "بی بی، ہوش میں آ، اب تو بچہ نہیں ہے جو اس طرح رو رہی ہے۔"

"لیکن اب میں جانا چاہتی ہوں۔" اماں نے کہا۔

"بیٹی تو کیسے جا سکتی ہے؟ اپنے بھائی کی شادی میں شریک ہو کر اُسے آشیرواد نہ دے گی۔ پھر میرے یہ نواسے — میرا بھی تو جی چاہتا ہے کہ یہ کچھ دن میرے پاس رہیں۔"

ہم اپنی آنکھیں مل مل کے رونے جا رہے تھے۔ اس لڑائی کی وجہ تو ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آئی۔ لیکن اس تناتنی کی فضا ہمیں رلا دینے کے لیے کافی تھی۔ لیکن جب نانی نے تانبے کی دو رکابیوں میں لڈو لا کر ہمارے سامنے رکھ دئے تو ہم فوراً چپ ہو گئے۔

ہم کھا ہی رہے تھے کہ حویلی کے صحن میں اندھیرا ہونے لگا اور مٹی کے چراغ جلا دیے گئے۔ اور سوائے اماں کے، جو تھک کے ایک پلنگ پر لیٹ گئی تھیں اور امرت کور کے، جو اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ باقی ساری عورتیں اوپر کی چھت پر جمع ہوئیں اور ڈھولک بجا بجا کے لوک گیت گانے لگیں۔

میں نے بھی ضد کی کہ لڑکیوں کے ساتھ چھت پر جاؤں گا۔ اور میں اپنی خالہ کی بیٹی درگی کی گود میں بیٹھ گیا۔ عورتیں ڈھولک کو ٹھیک کر رہی تھیں۔

مجھے درگی کی گود کی ملائمت، گرمی اور اس کی سانسوں کی مہک آج تک یاد ہے اور جب وہ گیت اٹھاتی تو مجھے ایسا لگتا کہ اس کے گھٹنوں کی، ناف اور اس کی پسلیوں، آواز کی گمک کو محسوس کر سکتا ہوں۔ اور اس رات جب میں اس کی رانوں پر سر رکھ کر سویا تو شرارت آمیز لوک گیت "نچی" کے بول میرے ذہن پر

نقش ہو چکے تھے۔

اکا، ڈی، اک گاؤں میں تھیں دو بچھیاں
اور چھوٹی بچھی بڑی آفت کی پرکالہ تھی
اکا، ڈی، بچھی تیرے کڑے کبھی نہ پورے پڑے
لڑکے ان کا دام ہی بھرتے بھرتے مر گئے
اکا، ڈی، بچھی . . . . .

میرا بہت ہی چاہتا تھا کہ سرپٹ بھینس کر دوہوں، دونوں بیلوں تھیا اور ڈنڈوں سے کھیت جوتوں، اور مویشیوں کے لیے چارہ کتروں جیسے میرے ماموں شرم سنگھ، دیال سنگھ اور سردار سنگھ کرتے تھے۔ لیکن ان کے پاس میری ہر بات کا بس ایک ہی جواب تھا:

"اسے تو شہر جانا ہے اور بابو بننا!"

میں اپنی خالہ زاد بہن رجّی کی سنگت میں اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ رجّی مجھ سے تھوڑی ہی بڑی تھی اور اس کی یادیں آج میرے ذہن کا جالے کی خوشبوؤں اور اداسیوں کی ہم آہنگ فضا میں سے ایک عجیب و غریب تھے ست پھول کی طرح ابھرتی ہے جس کی مہک میں شانتی بھولی گی کی طرح بھینی اور خوشگوار تھی۔ اور جیسے پھول چھونے سے آدمی کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے اسی طرح وہ میری روح میں داخل ہو گئی، اپنی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے پورے وجود کے ساتھ۔ اس لیے کہ ایسے لگتا تھا جیسے اس کی آواز کا رس میرے کانوں میں ہو، جیسے میرے جسم میں اس کی جان ہو، جیسے وہ میری آنکھوں میں سموئی ہوئی تھی

جسم کی جھلک میرے دماغ میں بھری تھی اور اسے ادھر ادھر آتا جاتا دیکھ کر مجھے
جسم کی ہر حرکت میری ساری آرزوؤں کا مرکز ہوتی تھی۔ شاید اس لیے ایسا تھا کہ
اس کے انگ انگ سے جو حرارت پھوٹ رہی تھی اسے چھونے! چھونے کے لیے
میرے سارے حواس بیدار ہو چکے تھے۔ یا شاید اس کے پھرتیلے جسم کے ہر لوچ کے
ساتھ میری روح بھی ہچکولے کھاتی تھی۔ یا اس کی عمر میں اس کے بارے میں
میرے رنگا رنگ تاثرات کا میرے شعور میں اتفاقی جمگھٹ تھا؟

اس نے کپڑے کی کترنوں سے اور روئی بھر بھر کے جتنی گڑیاں بنائی تھیں وہ
سب مجھے دکھائیں۔ اور پھر ظاہر ہے کہ میں نے اس سے کہا کہ ایک میرے لیے بھی بنا دے۔
اتنی محبت اور خوش دلی سے جیسی کہ میں نے اپنے ہم جماعتوں میں کبھی نہ دیکھی
تھی، وہ فوراً میری فرمائش پوری کرنے میں لگ گئی۔ اس کی ماں کے چرخے کے پاس
جو روئی کی ٹوکری رکھی تھی اس میں سے اس نے کچھ روئی نکالی، لٹے ہوئے کپڑے
کے ایک غلاف میں بھرا اور دونوں سرے سی دیے۔ پھر اسے بیچ سے دوہرا کر کے اس میں
گانٹھ لگا لیے۔ خاص طرح سے موڑا اور دیکھتے دیکھتے اس کے ایک سر اور دو
ٹانگیں ہو گئیں۔ تھوڑے سے کالے دھاگے سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں بن گئیں
اور اس کے ناک کان۔ اور پھر جو درزی باہر شادی کے کپڑے سی رہا تھا اس کے
پاس جا کے ہم نے اس سے کہا کہ رنگین ریشم اور گوٹے کی کترنیں ہمیں دے دے۔
فوراً ہی درزی نے اپنی ماہرانہ انگلیوں سے چھوٹی سی کرتی اور چوڑی دار پاجامہ بنا دیا
اور اسے پیارا بنانے کے لیے اس کی کرتی گوٹے کی گوٹ لگا دی اور پھر
مجھے دے دیا۔

پھر وہ مجھے اپنے گڑیا گھر میں لے گئی اور میرو کو اپنی ایک گڑیا کے پاس بٹھا کے دونوں کی شادی کر دی۔

اور پھر اس نے اپنے دل سے دولھا اور دلہن کی بات چیت جوڑی:

"اے میری بچی، تم کہاں سے آئے ہو؟ نام تمھارا کیا ہے؟ اور میرے لیے کیا لائے ہو؟ چنبیلی کے پھول کہ مولسری کے؟"

"رانی میری! تیرے لیے تو میں خود آیا ہوں اور تیرے گلے میں ڈالنے کو موتیا کے پھولوں کا ہار لایا ہوں اور تیرے بدن پہ چھڑکنے کو گلاب"

"اور میرے لیے مٹھائی کون سی لائے ہو؟"

"تیرے لیے میں میٹھے پیڑے اور گرم لڈو لایا ہوں"

"نہرو حلوائی کے یہاں سے؟"

"نہیں مٹھائی سب مٹھائی اور تیرے لیے پیار کے میٹھے بول بھی لایا ہوں۔"

"اچھا، میں انھیں اپنی سانسوں سے مہکا دوں گی"

اور پھر اس لڑکی نے گڑیا گڈے کو ایک دوسرے سے گلے ملوایا اور پیار کروایا۔ اور اس نے کچھ پڑھا اور مجھ سے کہا کہ یہ جنتر ہیں۔ اس نے گڑیا گڈے کی باتوں کا سرا لیکر ہم دونوں کے لیے قابل یقین خود فریبی سے جوڑ دیا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ شروع میں مجھے شرم سی لگ رہی تھی ۔۔۔ وہ ۔۔۔ جو گئی اور میں اس کے کھیل میں ایسا کھو گیا کہ سارا دن اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

اس لیے کہ ہم ساتھ ساتھ گاؤں کے کہاروں کے یہاں گئے اور وہاں اپنے کھیل کھیلنے کی دعوت کے لیے برتن لیے اور مٹی کی ایک گاڑی۔ کہ جس میں مٹی بھی سکے

بُنتے ہوئے تھے، رسّی کا ایک جھولنا اور کسان گھرانے کی باقی ساری چیزیں۔ اور
گاؤں کے جولاہے سے ہم نے آدھا گز کپڑا لیا اور لوہار کے یہاں سے ہل کی
ایک چھوٹی سی پھار اور گوالے کے یہاں سے دودھ۔ اور اس سب کو پوتر بنانے
کے لیے ہم مندر میں گئے اور پیپل کے پیڑ کے ناگ دیوتا کے چرنوں میں دودھ
چڑھایا۔ اور اس سب میں ہم اس قدر کھو گئے کہ دوپہر کے کھانے کو بھی بھول گئے
اور ہماری اماں ہم لوگوں کو پریشان ہو کے ڈھونڈنے نکلیں اور اس بات پہ
ایک دوسرے سے اور نفرت کرنے لگیں کہ ہم اور رنگی ایک دوسرے سے اتنا مانوس
ہو گئے تھے۔

لیکن دوپہر کے کھانے سے بھی اس خواب کی دنیا میں کوئی خلل نہیں پڑا
جو ہم نے اپنے لیے بنائی تھی۔ اور جلد ہی ہم رنگی کے گھر کے برآمدے میں دھینوڑ پیا
پڑے جھولے پہ پینگیں بڑھانے لگے۔ رنگی ایک گدی پہ بیٹھی تھی اور میں اس کی گود
میں چڑھا بیٹھا تھا، اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے، کہ تو ڈر کے مارے کہیں گر
نہ جاؤں اور کچھ اس سے لپٹنے کی جسمانی خوشی کے لیے۔ اور جھولے کی ہر پینگ کے
ساتھ رنگی کی آواز بھی اونچی ہوتی:

سکھیو، بہار آئی
بہار آئی
اور شب کی کلیاں
پھولوں کا رس چوس رہی ہیں، سکھیو......؟

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں کب سو گیا، تب کی جاگی وقت، دوپہر کو خوب،

پیٹ بھر کے کھانے اور تیسرے پہر کی گرمی نے مجھ پہ نشہ کر دیا۔

تیسرے پہر کو کافی دیر سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرے بھائی گنیش نے ونگی کے ساتھ میری جگہ لے لی ہے اور اس کے ساتھ گٹیاں کھیل رہا ہے۔ پہلے تو دن میں سو جانے کی سستی کی وجہ سے میں پڑا پڑا ان کا کھیل دیکھتا رہا۔ ان میں ایک گٹیوں کو ہوا میں اچھالتا اور پھر انہیں الٹے ہاتھ پہ لے لیتا، پھر انہیں اچھال کر مٹھی میں پکڑتا اور انہیں جیت لیتا۔ پھر باقی گٹیوں میں سے ایک کو ہوا میں اچھالتا اور جب تک وہ نیچے آئے زمین سے ایک اور گٹی اٹھا کر گرنے والی گٹی کو مٹھی میں لے لیتا۔

گنیش اور ونگی اتنی پھرتی اور مہارت سے کھیل رہے تھے کہ میرا بھی کھیلنے کو جی چاہا۔ لیکن گنیش اس پہ راضی نہ ہوا۔

اور مجھے جس چیز کا صدمہ ہوا اور جس سے میری روح کو چوٹ لگی وہ یہ تھی کہ ونگی بھی مجھے کھلانے پہ تیار نہ تھی۔

میں نے آپے سے باہر ہو کر گٹیاں چھین لیں اور گنیش کا کھیل خراب کر دیا۔ گنیش کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور اس نے زور سے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔

جس پر ظاہر ہے کہ میرے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی اور میں چلانے لگا۔

گنیش اور میری ہونا بیوی۔ کمرے کے دوسرے کونے میں جا کر کھیلنے لگے اور میں زمین پہ لوٹنے اور زور سے رونے لگا کہ کوئی میری آواز سن لے اور میری خبر لے۔

جب کوئی ادھر آتا نہ دکھائی دیا تو میں خود اپنی آنکھیں ملتے ہوئے آنگن میں جا کے اماں سے شکایت کی کہ گنیش اور درگی نے مجھے مارا ہے۔

اماں جو شاید کسی کی لڑائی پر ویسے ہی بھری بیٹھی تھیں، درگی پر برس پڑیں،
"آخر یہ رانڈ کی چھوکری درگی چاہتی کیا ہے؟ اچھل جو میرے بیٹے پر ہاتھ اٹھائے!"
درگی کی ماں امرت کور نے الٹ کے جواب دیا۔ "خبردار، جو مجھے رانڈ کہا تو! میں تمھاری جگہ ہوتی تو اپنے بیٹوں کو سمجھاتی۔"

اماں نے پوچھا۔ "تجھے کس نے مارا ہے، اس حرافہ گنیش نے؟"
میں سراسر جھوٹ بول گیا۔ "نہیں، درگی نے مارا ہے۔"
"سن لیا؟" اماں نے امرت کور سے کہا۔ "تیری ہی رنڈیا ہے، ظاہر ہے تجھی پر پڑی ہے۔"

"بی جا، بی جا!" امرت کور چلانے لگیں۔ "میری بیٹی کو نام نہ دھر، تو تو جل مرتی ہے اس بات پہ کہ تیرے بیٹی ہے نہیں، تو نے سات لونڈے ہی جنے!"

اس بات پر اماں چڑ گئیں۔ انھوں نے کہا۔
"تو بچوں کی اس لڑائی کو بہانہ بنا کر کیوں میرے پیچھے پڑتی ہے۔ کل تو نے میرے گھر اور میرے پتی کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں کہہ کے میری جان کھائی! اب آج یہ جتانے کے لیے آئی ہے کہ میں نے بیٹے جنے ہیں۔ صرف اس لیے کہ تیرے تو بیٹا ہوا نہیں، تو تجھے ایسی جلن ہو جاتی ہے!"
"کون جلن ہے؟" امرت کور نے پوچھا۔ "جلن تو بے میں نہیں جس کے

پاس پیسہ نہ ہو وہ کیا فیشن کرے گا۔ فیشن تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس تیرے جتنا روپیہ ہوتا ہے۔

"بی بی، میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو ایسے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑی ہے!" اماں نے پوچھا۔

"مجھ سے کیا پوچھتی ہے، دوسروں سے پوچھ، لوگ کیا کہتے ہیں۔ اپنے بھائیوں کو تنگ کر رکھا۔ بیٹے جان نکلتی ہے۔ اپنے خصم کے پیچھے پڑی رہتی ہیں، وہ تین سو روپے سے زیادہ نہ دیتا؟"

اماں چلانے لگیں: "ہائے دنیا میں کیسا اندھیر ہے! ہائے بی بی، تم ان ٹکڑوں کو دیکھو! میں نے تو ہمیشہ اپنے شوہر کی محنت کی کمائی دی ہیں، اور ان کے کوڑی بھی نہ مانگی۔ مجھ پر نہ دینے کا الزام!"

امرت کور دھیمے سے بولیں: "اس چلانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہی بات تو یہ ہے کہ تم ہم لوگوں کی ہو ہی نہیں۔ تم گاؤں چھوڑ کے بن گئی ہو اب شہر والی اور اب تم اسی برادری سے نفرت کرتی ہو جس نے تم کو جنم دیا ہے۔ ہائے بڑے آپ کو پتہ ہی نہیں کہ تم ان کا سہارا نہیں ہو بلکہ اب تم نے لالاؤں اور بنیوں اور امیروں کی عادتیں سیکھ لی ہیں۔ جن کے ساتھ تم رہتی ہو۔"

اماں چلائیں: "ہائے ہائے، تو مجھے کیسی ایسی باتیں سناتی ہے؟"

"مگر جھوٹ تو نہیں کہتی۔" امرت کور نے جواب دیا۔

اماں نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "میں بھی کیا یاد کروں گی کہ میکے آئی تھی۔ جب بھی دکھ آتی ہوں تو ہمیشہ یہاں سے روتی ہوئی جان جلا کے

ہی جاتی ہوں۔"

نانی نے گجری سے کہا۔ "جو ہنستا کھیلتا آئے گا، وہ خوش خوش جائے گا۔"

پاس بیٹھی ہوئی ایک اور بوڑھی عورت نے کہا۔ "اگر برادری سے تمھیں اپنے گھرانے سے زیادہ پیار ہوتا تو تم خوش ہی رہتیں۔"

یہ چھینٹا، اماں کی برداشت سے باہر تھی۔ انھوں نے دوپٹے میں سر چھپا کے رونا شروع کر دیا۔

انھوں نے بسورتے ہوئے کہا۔ "اس سے اچھا تو ہم آئے ہی نہ ہوتے۔"

اب جو میں نے دیکھا کہ دنگے سے میری جو لڑائی تھی وہ بڑھ کے میری اماں اور گاؤں کے رشتہ داروں کی لڑائی بنتی جا رہی ہے تو مجھے بڑا رنج ہوا کہ اس سارے فساد کی جڑ میں ہی تھا۔ لیکن مجھے یہ بھی یاد آیا کہ کل ہی تو اماں اور خالہ امرت کور ایک دوسرے سے جو جھگڑ رہی تھیں اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ ان کی لڑائی کی ساری ذمہ داری مجھ ہی پر نہیں ہے۔

"وہ مرُوا کہاں ہے گنیش؟" اماں نے پوچھا۔ "اسے بلا کے لاؤ کہ تیار ہو جاؤ، ہم لوگ گھر چلے جائیں گے۔"

"تم ہمیں ایسی دھمکیاں نہ سناؤ۔" امرت کور نے چلّا کے کہا۔ "تم آئی ہی کیوں تھیں اگر اسی طرح جا کے یہ مرگ پھیلانی تھی؟"

خالہ امرت کور کا کالا منہ یہ کہتے وقت جس طرح اینٹھ گیا اس سے مجھے بڑا ڈر لگا۔ ان کی آنکھیں لال ہو گئیں اور ان کے ہونٹوں کے کونوں پر جھاگ آ گیا۔ میری اماں پہ گرجتی ہوئی غصے کی اس تصویر کو میں زندگی بھر نہیں

بھولا۔ اور مجھے یاد ہے کہ اس کم عمری میں بھی میں نے اس تلخی اور درشتی کو محسوس
کیا تھا جو میرے خاندان پر چوٹیں کرتے وقت ان میں تھی۔ بیچارگی ان سے اور
کاوش سے میری طبیعت گھٹی ہوئی ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے نانا نبا خزلی قدرتی گرفتگی
ان کی حویلی اور ان کے کھلے کھیتوں کا تصور کچھ پر اچانک ہی ہوا تھا۔ اور وہاں
کھڑے کھڑے میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ میں روؤں گا یا اچھا۔ بھلوں کہ اس نے
سچ کو مجھ سے دوستی کی تھی یا اس سے نفرت کروں کہ میرے پیر کو اس نے مجھ سے
مفارقت کی تھی۔

لیکن مجھے زندگی کی بے یقینی اور بے اعتباری کا ایک عجیب احساس ہونے لگا۔

میری اماں نے آنسو پونچھے اور سامان باندھنے کیلئے کمرے میں چلی گئیں۔

میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ سامان باندھتی جا رہی
ہیں اور روتی جا رہی ہیں۔ بعض وقت تو وہ پاگل سی لگتیں اس لیے کہ وہ خود ہی
خود چپکے چپکے باتیں کرتیں اور روتیں اور شاید وہ دکھ اپنے جی کی بھڑاس
نکالنا چاہتی تھیں جو انھوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ
کے رونے لگیں۔

پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور گنیش سے، جو جڑ گیا تھا، کہا کہ
وہ گٹھری اپنے سر پر اٹھائے اور خود انھوں نے ٹرنک اٹھایا اور ہم چل پڑے۔

برادری کی کچھ عورتوں نے اماں سے کہا: "سندریا مت جاؤ، اس طرح
سے جانا بڑا شگون ہے، بہنوں میں کہا سُنی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔"

لیکن بھیری مائی اور خالہ امرت کور چپ رہیں۔

امّاں نے اپنی ماں اور بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ لوگ چاہتی ہیں کہ میں چلی جاؤں۔ ان کو میرا آنا پھوٹی آنکھ نہیں بھایا تھا۔ تو میرے رُکنے سے کیا فائدہ؟"

اس وقت میرا بڑا جی چاہا کہ نانا یا میرے کوئی ماموں آ کے اماں کو جانے سے روک لیں۔ اس لیے کہ اندھیرا ہوتا جا رہا تھا اور مجھے دل ہی دل میں ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن کوئی نہ آیا۔ اور ہم حویلی سے باہر نکلے۔ اداس اور بے سہارا کسی یتیم، بے وارث خاندان کی طرح۔

اماں نے کہا: "اب اتنی دیر ہو گئی ہے کہ گھر فلاں کے یہاں تو مجھے لے جانا نہیں، ہم پیل کے مندر میں رہیں گے۔" اور گاؤں میں جو درزی کا کام کرتے تھے ان کے ایک بیٹے کو انھوں نے ساتھ لیا کہ ہمارا سامان اٹھا کے ہمیں وہاں پہنچائے۔

گاؤں کے مرد عورت جاتے ہوئے ہمارے جلوس کو حیران ہو کے دیکھتے تھے۔ اور بعض نے اماں سے پوچھا بھی: "بہن، اتنی جلدی کیوں چلی جا رہی ہو؟ اور ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی! ہوا کیا؟"

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس، رونے لگیں۔

لیکن ہم بس گلی کے موڑ ہی تک پہنچے تھے کہ ماموں شرم علی، رحیم اور مراد علی تینوں نے آ کے اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔

انھوں نے کہا: "ہمیں معاف کر دو۔ یہ عورتیں تو پاگل ہیں۔ تمھاری جان عذاب میں کر دی ان دونوں نے۔ اور تم بالکل ٹھیک خفا ہو۔ لیکن تم ابھی شادی سے پہلے چلی گئیں تو برادری میں ہم تو منھ دکھانے کے لائق

نہ رہیں گے؟"

"مگر اب میں کیسے رہوں جب دیکھ رہی ہوں کہ میری اپنی ماں میرے خلاف ہے اور نہیں چاہتی کہ میں رہوں؟" اماں نے پوچھا۔

ماموں سردار سنگھ بولے: "بالکل اسے وہ چاہے سنا دیں گے، ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس نے مجھے بھی تو گھر سے نکال دیا ہے، صرف اتنی سی بات پہ کہ میں دوستوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔ بڑی بی بی، تم چلی چلو میرے ساتھ میرے گھر میں رہو۔"

اماں نے کہا: "نہیں رات تو میں دھرم شالے میں کاٹوں گی، اور صبح کو تیرتھ کے گھر واپس چلی جاؤں گی۔"

وہ تینوں بولے: "جب تک تم رو رہی ہو نہیں تب تک ہم تمہارے پاؤں بھی نہ چھوڑیں گے۔"

اور چند منٹ تک اماں اپنی بات پہ اور ماموں لوگ اپنی بات پہ اڑے رہے پھر پاؤں کے پکڑنے پہ ہیچ ہو گئے، اور ماموں کے ساتھ انھوں نے بھی اماں سے زبردستی کہا، اور اماں کی آواز دب گئی۔

ہمارا چھوٹا سا جلوس پھر بڑے سے گھر میں واپس آ گیا۔

میں یہ چاہ کے سردار جی ماموں ہم سب کو اپنے کمرے میں لے گئے جو اوپر بنا ہوا تھا، نیچی چھت، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کی طرح کھڑکیاں تھیں، دیواریں پکی بنی تھیں اور دیوار پہ دسوں گروؤں کی بڑی خوبصورت پرانی تصویریں۔

میں اور گنیش ڈیکری سے لگ کے بیٹھ گئے، وہ گلی میں سے گزرتے ہوئے کماؤں والوں کو تکتا۔ وہ کرنے لگے اور جلد ہی ہم غضب کی لڑائی کو بھول بھی

گئے۔ اماں میرے پیر کی تکان اور کوفت سے شل ہو کر سو گئیں۔

اصل سردار سنگھ نے ہماری بڑی خاطر کی اور خوب مزے کی مٹھائیاں کھلا کے ہم دونوں بھائیوں کو تو اپنا غلام بنا لیا۔ اور ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود اماں تو کھانے پر راضی نہ ہوئیں مگر وہ جا کے گاؤں کے تنور پر سے باتے بے گوشت کا سالن لائے۔

اور جب کھانا پینا ختم ہو چکا تو ان کے کچھ نوجوان دوست آ گئے، اور ان کے کہنے پر انھوں نے خوب لہک لہک کے وارث شاہ کی ہیر گائی۔

ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی آواز جیسے شہابی سرخ آگ میں ڈوب کر نکل رہی ہے، اور ایک ایک ہچکولے کے ساتھ پنجابی کسانوں کی دونو رکی بولی چال میں خوبصورت گیت بنتی جا رہی ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد ایسا لگنے لگا جیسے اس نے کمرے کے تمام لوگوں کے دلوں میں آگ لگا دی اور سب چلا پڑے۔

"واہ! واہ!"

اور جب ہیر رانجھا سے ہیر کے بچھڑنے کا مقام آیا اور وارث شاہ کے درد بھرے بول گرنے لگے تو کمرے میں خاموش غمگین کا جادو چل گیا اور شام کا دھندلکا اور بھی خوبصورت خوش گوار لگنے لگا۔

وہ شام مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ اس لیے کہ میں ہیر رانجھا کی محبت کے بارے میں وارث شاہ کی طویل مثنوی کے معنی تو پوری طرح نہیں سمجھا لیکن سرداری دھنوں کی آواز نے مجھے دم بخود کر دیا۔ اور پنجابی زبان کا مجھے

ہمیشہ کے لیے گرویدہ بنا دیا۔ اس کے بول اتنے مترنم اور دل میں اتر جانے والے تھے کہ میرے بچوں جیسے دماغ کو، جو اب تک چھاؤنی کی انگریزی گٹ مٹ کے لیے احترام اور شہر کے پنجابیوں کی بھونڈی پنجابی کے لیے حقارت پر پلا تھا، یہ لگا کہ میں نے یہ بہت بڑا گناہ کیا ہے جو ماں کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی پوجا نہیں کی۔ میں نے اپنے اندر کہیں یہ محسوس کیا کہ اپنی ماں کا محتاج ہونے کے باوجود اب تک اصل میں اپنے باپ کے بیٹے تھے۔ اور ہوتے ہوئے اس شرم ناک کے اس مذاق کا مطلب بھی میری سمجھ میں آ گیا جو وہ ہمیں "شہری" اور "بابو لوگ" کہہ کر کیا کرتے تھے۔ اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ نانا اور خالہ امرت کور کو ماں سے اور ان کی سسرال والوں سے اصل میں کیا پرخاش ہے....

بہرحال میرا خیال یہ ہے کہ اس شام سے میں اپنی ماں سے نئی طرح سے محبت کرنے لگا اور انھیں باوجود اس کے کہ ان کے رشتے دار یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے گاؤں کے ساتھ دغا کی ہے، میں ٹھیٹ گاؤں کی اصل روح سمجھنے لگا۔ اور اس کے بعد سے انھوں نے مجھے جتنی کہانیاں سنائیں، یا گیت گائے وہ میرے دماغ میں ان کہانیوں اور نظموں سے زیادہ خوبصورت اور اہم بن گئیں جو میں نے اسکول کی کتابوں میں پڑھیں۔ دراصل پنجاب کے سیدھے سادے گیتوں نے، جو میری ماں نے اپنی دھیمی آواز میں گا کر سنائے، اس چھاؤنی والے کو اس زندگی و دنیا میں گرا دیا جس میں ہم رہتے تھے، لال کرتی کی بازاروں اور بنگلوں کو جو صاحب لوگوں کیلیے ندی نالوں کے کنارے بنے ہوئے تھے نکھار دیا اور مجھے بہت سے جگنوؤں اور پہاڑیوں اور پتھروں سے لگن کرا دی تک دوڑ پر سوتے ہوئے ایک ایسے ادیب

میں سے آئے جہاں اُفق نہ تھا، صرف وسطِ پنجاب کے وسیع اور بے اور چھور مناظر تھے جن کے اوپر کھلا آسمان تھا جو ان پہاڑیوں اور پہاڑوں کی طرف جھکتے چلے جاتے تھے جنھیں میں نہ جانتا تھا۔

میں گاؤں اور وہاں کی ساری خوشیوں کے بارے میں اتنا پرجوش تھا کہ جب سرداری ماموں، ہیر سُناتے سُناتے ذرا دیر کے لیے رُکے تو میں نے اماں سے پوچھا کہ رانجھا، سیال، جن کے کارناموں کی کہانی انھوں نے مجھے تو شہر ہی میں سنائی تھی، کبھی ڈسکا بھی آئے تھے، یہاں رہے تھے، اس لیے کہ یہ گاؤں تو سیالکوٹ سے بس دس میل کے فاصلے پر ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ بہت سے رانجھا اور ہیر سرما ڈسکا آئے ہیں۔

اور اپنے تخیل اور استعجاب کی حاشیہ آرائیوں پر غور کرتے ہوئے میں نے دھندے دھندے سایوں کو اپنے نور کی عظیم خلا میں تیرتے ہوئے سورج کے نیچے کھو جاتے یا ماضی کی گہری اندھیاری راتوں میں گم ہوتے دیکھا۔

سرداری ماموں اپنے دوستوں کی فرمائش پر پھر سُنانے لگے۔ اس بار انھوں نے بُلّھے شاہ کی نظم سنائی۔ چونکہ یہ بھی ہیر رانجھا کے متعلق تھی، اس لیے میرے دل میں گھر کرگئی۔ کچھ اس طرح انھوں نے شروع کیا:

میرا دل اپنے محبوب کے لیے تڑپ رہا ہے، تڑپ رہا ہے۔
کچھ عاشق بنتے ہیں اور ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہیں
لیکن کچھ کی قسمت میں، رونا اور بھری بہاروں میں مارے مارے پھرنا ہے
میرا دل میرے محبوب کے لیے......

معلوم نہیں ان مصرعوں میں تڑپ کا اظہار تھا اس لیے یا اس لیے کہ ہم جب ڈسکا پہنچے تھے تو بہار کے دن تھے۔ یہ مصرعے مجھے یاد رہ گئے جبکہ وارث شاہ کی نظم کسی نے یاد رہی اور نہیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ نظم اپنی سادگی کی وجہ سے یاد رہی۔ وارث شاہ کی نظم پیچیدہ اور مشکل ہے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ وارث شاہ کا ذکر کرتے ہوئے سردار ای ماموں نے بتایا تھا کہ شاعر نے گھوڑے کے سُم کو جس طرح سے پیش کیا ہے۔ لیکن کبھی آدمی کسی لڑکی کا دامن پکڑ کر حسن سے آشنا ہوتا ہے اور جیسے وارث کی شعر و نثر اتنی ہی جیا مشکل ہوتی ہے جتنی الیوں کے چھلکے اور چھلوں کے چھلکے میں ہوتی ہے۔ محبت کی ذرا سی گرمی اسے سورج کی طرح روشن بنا سکتی ہے!

اس رات جب سب لوگ چلے گئے اور ہم نے وہ کھانا کھا لیا جو سردار ای ماموں خاص طور سے بات ہی کہ لاڑن کے نانبائی کے یہاں سے لائے تھے تو ہم ان کے ساتھ ان کے کمرے کی چھت پر سونے چلے گئے۔ ہیر رانجھا کے بارے میں انھوں نے جو نظمیں سنائی تھیں انھوں نے میرے دل پر اتنا اثر کیا کہ میں نے سردار ای ماموں سے کہا کہ وہ مجھے ہیر رانجھا کے عشق کی داستان سنائیں تب میں سوؤں گا۔ حالانکہ اماں نے اس طرح کی ضد کرنے پر مجھے ڈانٹا اور کہا کہ ماموں کو سونے دو وہ تھکے ہیں، دن بھر ہم لوگوں کے لیے بھاگ دوڑ کی ہے، لیکن پھر بھی میں نہیں مانا اور ان کے پیچھے پڑا رہا۔

سردار ای ماموں نوجوان اور حسین اور بڑے دل والے تھے۔ انھوں نے مجھے اور گنیش کو یہ ہی کہانی سنائی جو میں پہلے خود سے سنتا رہا حالانکہ میری آنکھیں نیند

بادل ہو رہے بند ہوئی بارش ہو رہی تھی اور میری آنکھوں میں نیند بھری تھی اور قریب چار بار وہ میں اونگھ کے گرتے گرتے بچا۔ انھوں نے اس طرح کہانی سنانی شروع کی کہ بالکل تصویر کھنچ گئی اور مجھے ان کے الفاظ یاد ہیں، حالانکہ اس وقت ان کے معنی سمجھ میں نہ آئے تھے۔

کہتے ہیں کہ ہیر شمالی پنجاب کی ایک چھوٹی سی سلطنت کے سردار چوچک کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ نے بچپن ہی میں اس کی منگنی سیدا سے کر دی جو پاس کی ایک سلطنت کے سردار کھیڑا کا لڑکا تھا۔

ہیر بڑی ہوئی تو اس کی خوبصورتی کے چرچے ہونے لگے۔ پاس ہی کا ایک اور سردار تھا جس کے آٹھ بیٹے تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹا، رانجھا، بڑا خوبصورت تھا اور اس کا باپ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس بات سے وہ دوسرے بھائی جلتے تھے، چنانچہ رانجھے کا باپ جیسے ہی مرا اس کے بھائیوں نے رانجھے کو سلطنت کا کوئی حصہ نہ دیا اور اسے اپنے راج سے نکال دیا۔

مدتوں تک جنگلوں میں بھٹکنے کے بعد، رانجھا دریائے چناب کے کنارے پہنچا۔ اسے پار اترنے کے لیے کسی کشتی کی تلاش تھی۔ اسے ایک خوبصورت کشتی دکھائی دی تو اس نے ماجھی سے کہا کہ اسے پار پہنچا دے۔ ماجھی نے انکار کیا۔ رانجھے بہت تھکا ہوا تھا اور اس نے ماجھی سے پوچھا کہ کیا وہ ناؤ میں تھوڑی دیر آرام کر سکتا ہے۔ ماجھی کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے اجازت دے دی۔ رانجھے بجرے میں چلا گیا اور نرم آرام دہ بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

• رانجھے نے جو دیکھا تو ہیر بستر کے پاس کھڑی تھی۔

• ہیر پہلے تو ملاحی پر بہت خفا تھی کہ اس نے اجنبی کو حجرے میں آنے کی اجازت کیوں دی۔

• لیکن جب رانجھے نے اس سے بات کی اور اسے ٹوکا کہ تھکے ہارے مسافر سے ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہیے تو وہ مسکرانے لگی۔ ان کی نگاہیں چار ہوئیں اور وہ ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔

• خوبصورت ہیر نے رانجھے کو اپنے پاس مجھوں کے لیے اسے چرواہے کا کام دلا دیا اور وہ چھپ چھپ کے وہ اس سے ملا کرتی۔

• آخر اس چوری چھپے کی ملاقات کا پتہ چل گیا اور کھیڑا نے اپنی بیٹی کی شادی فوراً سیدا سے کر دی۔

• ہیر کو رانجھے سے جدا ہونے کا بڑا غم تھا اور اس نے اپنے شوہر سے بات بھی نہیں کی۔

• رانجھے کو کھیڑا کی سلطنت سے نکال دیا گیا اور وہ رنگ پور چلا گیا جہاں ہیر بیاہ کر گئی تھی اور اس نے سادھو کا بھیس پہن لیا۔

• اس نے ہیر تک پیام سلام پہنچایا اور سیدا کی بہن سہتی کی مدد سے وہ ہیر کو بھگا لے گیا۔ اسی رات کو سہتی بھی اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ گئی۔

• سیدا نے اپنے آدمیوں کو پیچھا کرنے کے لیے بھیجا۔ سہتی اور اس کا محبوب تو نکل گئے لیکن ہیر اور رانجھا پکڑے گئے اور انھیں واپس لایا گیا۔

• انھیں قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ رانجھا کو تو وہاں سے نکال دیا گیا۔

دیکھ کر ہیر سے رنگ لائے تھے۔

• ہیر اور رانجھے کو سزا دینے کے بعد ہی، جھنگ پور میں آگ لگ گئی اور کہتے ہیں کہ آگ لگنے کی وجہ یہ تھی کہ ہیر اور رانجھے کی آہوں نے اس کی بنیاد رکھ دی تھی۔

• رانجھا کو واپس بلایا گیا۔ ہیر کو طلاق دے دی گئی، اور اسے اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ چلی جائے۔

• عاشق و معشوق ہیر کے ماں باپ کے گھر آئے۔ اور اب وہاں اُن کا سواگت کیا گیا۔

• رانجھے اکیلے اپنے گھر چلا گیا تاکہ وہ اپنے بھائیوں کو لائے اور شادی رچائے۔

• ادھر ہیر کے بھائی اور چچا نے، جنہیں رانجھے سے نفرت تھی اور جنہوں نے اس کی خاطر مدارات اوپری دل سے کی تھی، ہیر سے کہا کہ رانجھے کو تو راستے میں مار ڈالا گیا۔

• ہیر یہ سن کر بے ہوش ہو گئی۔

• بے ہوشی ہی میں اس کے چچا اور بھائی نے اسے زہر پلا دیا اور وہ مر گئی۔

• رانجھے کے پاس یہ اطلاع دینے کو قاصد بھیجا گیا۔

• رانجھے فوراً واپس آیا۔

• لوگ اسے ہیر کی قبر پر لے گئے۔

• یہ صدمہ اس سے نہ اٹھایا گیا اور اس نے اپنی محبوبہ کی قبر پر لیٹے لیٹے جان دے دی۔"

اماں، خالہ اور نانی میں صلح صفائی بھی نہ ہوئی تھی کہ اگلی صبح کو پھر ایک نیا جھگڑا ہو گیا۔

نانا نہال ہو رہے، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اماں کو چاہتے اور ان کی عزت کرتے تھے اور کچھ گھر میں صلح صفائی کرانے کے خیال سے، یہ کہا کہ شرم سنگھ کی بارات میں گنجائش سٹہ بالا بنے گا اور وہ دولہا کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھے گا۔ چونکہ یہ بات انھوں نے کہی تھی اس لیے سبھی نے چپکے سے سُن اور بظاہر مان لی۔ اور جب تک نانا صحن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پیتے رہے اس وقت تک ہم پر سب لوگ بڑے مہربان بنے اور میں صفائی اور چپ چاپ ہو گئی۔ لیکن جیسے ہی وہ کھیتوں کے کنوئیں پر گئے ویسے ہی امرت کور نے اماں سے چھیڑ چھاڑ کرنی شروع کر دی۔

پہلے تو وہ خود ہی خود بڑبڑاتی رہی۔ پھر انھوں نے نانی سے کچھ کھسر پھسر کی اور بعد کو جب اماں گنجائش سے یہ کہہ رہی تھیں کہ جا کے کنوئیں پر ٹھیک سے نہا آئے تو خالہ امرت کور بڑی تُنک کے ساتھ زور سے بول پڑیں۔

"ہاں ہاں، اچھا شدھ ہو جائے، ذرا اپنا جسم اچھی طرح صاف کرے آخر کو تجھے سٹہ بالا بننا ہے۔ شرم سنگھ کی تو قسمت پھوٹ گئی جو تیرے جیسا لنگڑا اس کے پیچھے بیٹھے گا۔"

"اندھیر سا اندھیر ہے — کیا اندھیر ہو گیا زمانے میں! تو اس طرح کی باتیں میرے بیٹے سے کرتی ہے؟" اماں نے کہا۔

"نہیں اندھیر،" امرت کور نے جواب دیا۔ "کھلی بات ہے کہ آدمی کے پاس روپیہ ہو تو دنیا میں سب کچھ خرید سکتا ہے۔ اس ملک میں جیوں اور

پاؤں ہی کی تو چاندی ہے۔ اور کسان بے چارا تو مجبور ہے۔ چاہے بچے تو پیدا ہوں تب بھی ننگے اور کالے اور ساری عمر ویسے ہی ننگے اور کالے ہی رہیں۔

"جن کے دل میں نفرت بھری رہتی ہے وہ اپنے لیے خود ہی کٹھنائیاں پیدا کرتے ہیں۔" ماں نے کہا۔

امرت کور بچاری۔ "تو ہم کیا قیامت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟"

"بہن میں نے تو اسے کہا نہیں تھا کہ میرا بیٹا فرم سنگھ کو شہ دلا بنے؟"

ماں نے نرمی سے کہا۔

"تم جتنی بھولی بنتی ہو اتنی ہی تمہاری قلعی کھلتی ہے۔" امرت کور نے اور دبایا۔ "جب سے خبر گئی ہو تب سے بڑی بیٹھی بن گئی ہو۔ ایسی بیچاری بنی بھولی بھالی بنی رہتی ہیں!"

"ہائے رب۔" ماں نے آہ بھری۔ "اب میں کیا کروں؟ کتنا زہر اگلتی ہے تو!"

امرت کور نے منہ بنا کے کہا: "بہن ہم تو دل کے سچے ہیں اور کھری کھری کہتے ہیں۔ اور سانپ یہ کر نہ کریں کہ انھیں دبا لگ رہا ہے!"

"بیٹو، اب چلو یہاں سے۔" ماں نے عاجز آکر ہم لوگوں سے کہا۔ ہم لوگ نانا کی چارپائی پر سرہانے میں بیٹھے تھے۔ ماں نانا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور اپنی ہتھیلیوں کو رگڑ رگڑ کے میل چھڑا رہے تھے۔

کچھ دیر تک سب لوگ چپ رہے۔ اور میں، جو بیس خیالی کی آس لگائے
تھا اور جانتا تھا کہ زندگی والے باتیں کو دیں گے، ڈرا کہ یہیں تو خوابوں کی دنیا
ہی تباہ ہو جائے گی اگر اماں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

تائی جی نے کہا۔ "ایسی بدشگونی نہ پھیلاؤ! ہر وقت جانے کی دھمکی۔
جانا ہے تو جاؤ۔ تم کو تمھارے باپ نے سر چڑھا رکھا ہے اور تم اب بھی یہ سمجھتی ہو
کہ ان کی بیوی میں نہیں، تمھیں ہو۔۔۔"

"ہائے ہائے" اماں جھلا پڑیں۔ "میری ماں ہو کے تم ایسی باتیں کیسے
کرتی ہو! کیوں مجھ سے اتنی نفرت ہے تمھیں؟ کیسے اتنا زہر اگلتی ہو؟"

"اچھا اب زیادہ کلام نہ کرو۔" تائی نے جواب دیا۔ "تمھاری تو عقل
ڈاڑھ کے ساتھ ہی زہریلی ہو گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ...."

خالہ امرت کور نے لقمہ دیا۔ "اور جیجی ایسا ہیں جیسے بڑی معصوم ہیں۔"

اب اماں کی برداشت سے باہر ہو گیا اور وہ رونے لگیں۔

میں نے ان کے پاس کھسکتے ہوئے "اماں، مت رو، رو؛" اور گھٹنیں ٹیکے
ڈر اور رنج کے پیالے پیا جا رہا تھا۔

"چلو بیٹا، ہم لوگ چلیں۔" اماں نے سسکی لے کر کہا۔

اور میں سمجھ گیا کہ اس بار ان کا فیصلہ اٹل ہے۔

خالہ امرت کور نے سختی سے کہا۔ "بڑو، جانا ہے جتنا، قصور سارا تمھارا ہی ہے
یہ مت سمجھنا کہ تم میرے سر لاد دو گی۔"

"ہے ایشور، مجھے صبر دے۔" اماں چلائیں۔

میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان سے کہا کہ نہ روئیں۔

میری ہمدردی سے سہارا پاکر ایسا لگا جیسے میرے ہاتھ لگاتے ہی ان میں جانے کہاں کا بل آگیا ہے۔ انھوں نے نانی اماں اور خالہ امرت کور کو گھورتے ہوئے چلا کر کہا: "ہم تو جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔ لیکن اگر ایشور ہے تو تم کو اس کی بھرنی بھرنی پڑے گی!"

امرت کور نے تڑاخ سے جواب دیا۔ "جاؤ جاؤ، اس شبھ موقع پر بین کرنے نہ بیٹھو۔"

اماں نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ہم لوگوں کو اٹھایا اور خود بھی اٹھ گئیں۔

سرداری ماموں کے کمرے میں ہمارا سامان کل ہی سے بندھا پڑا تھا جب اماں نے جانے کی کوشش کی تھی۔

اماں جاکے پڑوس سے ایک جولاہے کے لڑکے کو بلا لائیں اور ہمارا جلوس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

صبح کو اس وقت نانا نہاکر کنویں پر تھے اور ہمارے ماموں برات کی تیاریوں کے دھندوں میں لگے تھے۔ چنانچہ ہمیں واپس لے جانے کے لیے کوئی نہ آیا۔

اب رونے کی باری ہماری تھی اس لیے کہ ہمیں اس کا رنج تھا کہ نانا جی یا سرداری ماموں سے مل کے نہیں آئے۔ اور اماں، نانی اور خالہ امرت کور کی لڑائی کے بارے میں سوچ سوچ کر ہم پریشان ہونے لگے کہ اب دیکھو ابا کیا کہتے ہیں اس لیے کہ ابا ہر لڑائی میں گھر والوں کے مقابلے میں دوسروں کی طرفداری کیا کرتے تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں بچے اس کا بھی احساس تھا کہ اماں اور خالہ امرت کور کی دشمنی اب ہمیں کل کی صبح کی طرح درگی کے ساتھ کھیلنے اور پیار کرنے کا

ہوتی پھر کبھی نہ ملے گی۔

ڈسکا کی بسیں چوک کے پاس والے اڈے پہ جب اماں مول تول کر چکیں تو ہم لوگ ایک یکے پہ سوار ہو گئے اور جب یکہ ڈھچر ڈھچر کرتا ہوا چلا تو ڈسکا والے کی میری آخری امید بھی زینہ کی تاریکیوں میں گم ہو گئی۔

۵

ڈسکا کے گاؤں میں جو شور و شرش اور جنسی خوشی کا جو وقتی تجربہ مجھے ہوا تھا اس شعلۂ مستعجل کے بعد زندگی نوشہرہ میں خوشیوں اور امیدوں سے بھرے دنوں کے معمول پہ آ گئی۔

جب میں اپنے بچپن کے اس زمانے پہ نظر ڈالتا ہوں تو قدرتی طور پہ ایسے ماضی کے پُر مسرت و معصوم دنوں کے لیے جذبۂ حسرت جاگ اٹھتا ہے اور "گرد آبادِ تمنا" ایک کتاب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ زیادہ تر لوگوں کے دلوں میں بچپن گزر جانے کے بعد ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ایک بچے کی زندگی "سبزہ زار" ہوتی ہے۔ ایک شاعرانہ والہانہ تجربہ، جو عمر میں رشتے داروں اور دوسرے بڑوں کے بڑھ جانے کے بعد جب یہ علم ڈھلتا ہے تربیت بے حد مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات ان لوگوں کے متعلق بھی ہو جنہوں نے بہت کچھ زیادہ رومانیات میں ہی حالانکہ یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی شہادت موجود ہے کہ کسی خود ہی کا یہ نظریہ مجھ تک ہے اور جن لوگوں نے کام کیا ہے وہ غیر مخلص اور بے تصنع بزرگ تھے۔ نہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر بچہ شدید ظلم و ستم ہوتا ہے۔ بچے کی مایوسیوں اور بے چینیوں کے احساس کا بڑا حصہ اس شوق میں مضمر ہوتا ہے

کہ وہ بڑا ہو کر صاحبِ وقار اور قابلِ اکرام بن جائے، جیسے کوئی پودا شاخوں کی پوری نشو و نما سے پہلے ہی درخت بن جانے کی کوشش کرے، پھر بچوں کی یہ جدوجہد بھی کہ ہر چیز کو، زندگی کے ایک ایک پہلو کو جان لیں، شدید ہوتی ہے۔

اس اندوہناک کرب کا خاصا بڑا حصہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جب ہو اپنے بچپن کو بھول چکے ہوتے ہیں، یا اپنے بالغانہ مخصوص تجربوں سے اخذ کیے ہوئے معیاروں سے نو عمروں کو پرکھتے یا ان کو نظر انداز کرتے ہیں، اس ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بڑے بند یا مبہم نظریات اور قطعی رائیں رکھتے ہیں کہ اُبھرتی ہوئی نسل کے لیے کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ بچوں کو سرے سے سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ لیکن ان دونوں کے بند دستان کے لیے چوڑے قید خانے میں، خصوصاً "زرد پھانکوں کے قید خانے میں" جیسا کہ میرے ابا کنفیوشس کو کہا کرتے تھے، بچپن کی عقل سرخوشی اور سارا کرب ایک خاص قسم کی بیتی کے ساتھ تھا۔ جو شعاعی احساسِ برتری اور تنگ چڑھے پن سے پیدا ہوتی تھی، اور جس کی بہت افزائی اس گھٹے پن سے ہوتی تھی جو اکثر شاہی ہیوں کے درمیان اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے حاصل کرنی ہوتی تھی، اس لیے کہ اس دنیا میں تو ہر ایک کو رشک و آتش سے اپنی جان اور عزت آبرو بچانے۔ گھٹے کی جدوجہد کرتا اور جو میں گھٹنے بے روح، کمزور، ریل اور مصائب سے پاک، بلند و برتر گوشہ صاحبوں کی بارگاہ میں رسوخ کی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا۔

بچے ہونے کے ناطے پہلے اپنے باپ کی پوزیشن کا احساس تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب کو دوسروں سے وقار یا تخصیص کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اور مجھ میں

اپنے آبا کو ہیرو بنا کر ان کی پرستش سی کرنے سے جو فخر پیدا ہوتا تھا اس کی وجہ سے میں یہ سمجھتا تھا کہ ہمارا گھرانا امرتسر کے کُنباروں اور مشہوروں کی برادری میں سب سے ممتاز تھا اور یہ کہ میرے آبا بہت ہی باعزت اور اثر و رسوخ رکھنے والے اونچے طبقے کے آدمی تھے۔ لیکن ہر چیز کو دیکھنے والے بچے کی بھولی اور غیر جانبدار آنکھوں سے میں نے فوراً ہی اپنے دادا کا گھر کھلا پن بھی دیکھ لیا۔ میں نے اس فضا کو محسوس کیا کہ ہمارے گھرانے کا معیار زندگی بہت پست تھا اور اس سے زیادہ عیش آرام کی زندگی تو بنئے بھی بسر کرتے تھے۔ اور باوجود اس کے کہ مجھے بہت سخت تاکید کر دی گئی تھی کہ اپنے گھر کی مالی حالت یا گھر میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی باتیں کسی سے نہ کروں۔ میں اکثر وہ سب کچھ جو میرے ماں باپ چھپایا کرتے تھے، ہر اس شخص کو بتا دیا کرتا تھا جو ذرا سا بھی ہنس کر بول لے۔

مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ ہمارے گھرانے کو کسی قدر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس لیے کہ ہم لوگ اصل میں دستکار تھے، سپاہی پیشہ نہ تھے اور ہمارے گھر کے آغا خان پر ایمان رکھتے تھے۔ اور میں نے یوں ہی آتے جاتے بابو بچتر سنگھ کے گھر میں یا پنڈت بے رام کے مندر میں یہ کھسر پھسر بھی سنی تھی کہ کیسے فلاں فلاں صاحب نے کان بھر کر ایجی کو ریٹائر کروا دیا جائے۔ لیکن ان سب باتوں سے میرا اتنا تعلق نہ تھا جتنا اس بات سے کہ ہمارے گھر میں بہت ہی کم اچھی چیزیں پائی جاتی تھیں، انگریزیت پیدا کرنے میں میری ساری اشتہا اور سرمائی خواہشوں پر پانی پھر جاتا تھا۔ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ممانعت کی جاتی تھی اور ایک امتحان ختم ہوتے ہی دوسرے کے لیے محنت کرنا

تاکید کی جاتی تھی اس لیے کہ میٹرک پاس کرکے خاندان کے لیے عزت حاصل کرنے میں ایک دن، ایک گھنٹہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کرنل الگزنڈن نے بڑے دن کے موقع پر جو رنگوں کا ڈبہ اور برش بھیجا ہے اُن سے کھیلوں لیکن بیکار، وقت ضائع کرنے پر مجھے ڈانٹا ڈپٹا جاتا تھا۔ میں کھیلنے کے لیے نہ باہر جا سکتا تھا اور نہ گھر میں بیکار بیٹھا رہ سکتا تھا۔ مجھے حساب کے سوال کرنے چاہییں۔

میرے سارے سہانے سپنوں اور خیالوں کی پرواز، وہ تمام بے چارہ جذبات کو جو میرے سفر پہ پکڑ کر چلا نہ بیٹھنے دیتے تھے، دب کے رہ گئے اور گھنٹوں نے اتنا طول کھینچا کہ دن بن گئے، ایک دن کے بعد اور دن آئے لمبے لمبے اور کاٹے نہ کٹنے والے، اور ایسا لگنے لگا کہ جانے کب وہ دن آئے گا جب میں بڑا اور آزاد ہو جاؤں گا۔۔۔۔ خیر، اس کا خطرہ ہونے کے باوجود کہ اچھی طرح خبر لی جائے گی، میں سارے احکامات اور تاکیدوں پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ اب میں جیب خرچ تو پاتا نہیں تھا اس لیے اگر مجھے کوئی پیسہ دیتا تو میں اپنے گھر کے اصولوں کو توڑ کر فوراً ہاتھ پھیلا دیتا یا کسی سپاہی کے ساتھ بجٹ بازار چلا جاتا اور وہاں مٹھائی یا وڑا کا تحفہ قبول کر لیتا باوجود اس کے کہ اماں نے مجھے سختی سے جتا دیا تھا کہ پہاڑی لوگ اس لائق نہیں ہوتے کہ ان پر بھروسہ کیا جائے اور یہ لوگ مجھے خراب کر دیں گے۔ انھوں نے سختی؛ سوبیا اگر دم کا حقہ کے ادل سے کچھ نہ لیے کہ خاص طور سے منع کیا تھا اس لیے کہ اس نے ایک بار مجھے پیار کر کے اور میرے گالوں پر دانت کاٹ کر خراب

کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری ان بچپن کی سیر تفریحوں کے تاثرات میری زندگی کے سب سے گہرے اور بھرپور تاثرات میں سے ہیں۔ لیکن ایک اندرونی خوف ان سب کا مزا کرکرا کر دیتا تھا، اس گھر کے ڈسپلن کا خوف جس کی سختی اور تندی بڑی حد تک برطانوی فوج کے ان اصولوں کا نتیجہ تھی جو میرے باپ کے ذہن پر نقش تھے۔

ہمارے گھر میں ہمیشہ ہی بہت سادہ اور موٹا جھوٹا کھانا پکتا تھا۔ میرے باپ کو ایک سی او کا عہدہ ہونے کی وجہ سے اتنا روپیہ جیسے کا الاؤنس اور آٹا، دال، نمک، گھی اور شکر کا روزانہ راشن جیٹ کی طرف سے ان بنیوں کے یہاں سے ملتا تھا جو ہر کیمپ میں لگے ہوئے تھے۔ اور جو کچھ ملتا تھا اس کے علاوہ وہ کبھی کھانے پینے کی کوئی چیز نہ خریدتے تھے اس لیے کہ اس سے خرچ بڑھتا۔ تو گھر بھر کو اسی راشن پر گزر اوقات کرنی پڑتی۔ اس سے زیادہ وہ جس دن کی کھانڈ کا ہوتا یا دوسری چیزیں جو بنئے لائسنس یا دوسری مراعات حاصل کرنے کے لیے رشوت کے طور پر خوشی سے دیا کرتے تھے؛ اماں بڑی اچھی گرہستن تھیں اور گھر میں کھانے کی بنیادی چیزوں کی کمی نہ ہوتی تھی۔ لیکن کھانے کی اچھی چیزوں کا تو ذکر ہی کیا، اس میں تبدیلی بھی کبھار ہی ہوتی تھی، روز دال روٹی اور کبھی کبھی ترکاری۔ ہم بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے کہ کب کوئی ہمارے یہاں پھلوں کی ڈالی بھجوائے۔ حالانکہ اس میں سے ہمیں بہت تھوڑا تھوڑا کر کے دیا جاتا اور مجھے وہ مار کبھی نہیں بھولی جو ام

چُرانے پر باجی کے ہاتھوں پڑی تھی۔

اگر گھر میں کبھی راشن کے ساتھ یا بقر عید کے موقع پر کسی پٹھان یا بنیئے ہی کے یہاں سے گوشت آجاتا تو اس کا سب سے بڑا حصّہ تو باجی کو ملتا، اس لیے کہ ایک تو وہ بڑے تھے اور پھر دفتر میں میز پر بیٹھ کر اپنی جان کھپاتے تھے اور ہم گٹھلیوں اور پُتّوں کو چوسنے کھیلنے اور ماٹے ماٹے چیرنے کے اور کچھ ڈھکتے تھے۔ بس ایک ایک بوٹی اور ذرا سا شوربہ مل جاتا تھا۔ نوشہرہ یا پشاور سے اگر کبھی کوئی بھلا آدمی یا غرض مند ایک ٹوکری انڈے بھیج دیتا تو اس پر صرف باجی کا حق ہوتا۔ ٹوکری اٹھا کر وہ دالان میں ایک الماری کے اوپر ہماری پہنچ سے باہر رکھ دیتے۔ اور روز صبح کو اس میں سے دو انڈے نکال کر تلنے کے لیے دیتے اور خود ہی کھاتے اور ہم منہ میں پانی بھرے ان کی پلیٹ پر نگاہیں جمائے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھی باجی کے دفتر چلے جانے کے بعد اماں دو انڈوں کا آملیٹ بناتیں اور ہم لوگوں کو ایک ایک نوالہ دیتیں۔ لیکن وہ ڈرتی بھی تھیں اس لیے کہ ممکن ہے کہ باجی نے انڈوں کا حساب رکھا ہو اور کہیں خود اُن پر انڈے کھا لینے کا الزام نہ لگ جائے، جبکہ وہ گوشت انڈا کھاتی ہی نہ تھیں۔ باجی سیر بھر دودھ لیتے تھے، اس میں سے البتہ ہمیں رات کو ایک ایک پیالی مل جاتا تھا۔

کوئی تعجب نہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی وہ جینٹل مین سپینڈ نہ بن سکا جس کی تصویر ہم نے باجی کی ایک کتاب میں دیکھی تھی اور جس طرح کے ہم خود بننا چاہتے تھے۔ البتہ شیر جب بڑا ہوا تو وہ گھر سے پیسے چُرائے جاتا۔ خوب

کھاتا! اور وہ ضرور، اتنا لمبا تڑنگا ہو گیا کہ ہمارا بڑا بھائی لگنے لگا۔

کھانے ہی کی طرح کپڑوں کا بھی حال تھا۔ بابی کا رویہ سادگی پسندی کا تھا کہ اپنی کفایت شعاری کو وہ اسی نام سے یاد کرتے تھے اور ہر وقت روپیہ بچانے کی فکر رہتی تھی۔ ہرنیش کی شادی پر تو انھوں نے ہم لوگوں کے لیے کپڑے خریدے تھے۔ اس کے علاوہ جو سردار سرجن سنگھ لٹھے یا خاکی ڈریس کے جو کپڑے کوارٹر ماسٹر کے اسٹور سے "لا پتہ" دکھانے میں کامیاب ہو جاتے ان سے اماں جانے کیسے اس نئی سنگر مشین پر، جو سو بیاگز کا سنگھ ان کے لیے ولایت سے لائے تھے، جہاں وہ جارج پنجم کے ایڈی کانگ ہو کر گئے تھے، قمیص شلوار سی دیتیں۔ ہمارے کپڑے جان بوجھ کر خوب ڈھیلے ڈھالے بنائے جاتے۔ لیکن ہم بڑھ رہے تھے اور یہ کپڑے یا تو چھوٹے ہو جاتے تھے یا پھر جگہ جگہ سے دھوبی پھاڑ لاتے تھے جن کی دھلائی کا فن یہ تھا کہ پتھر پر پٹک پٹک کر دھوتے تھے۔ جب ہم نئے کپڑوں کی ضد کرتے تو بابی اس وقت تک "ٹالتے" رہتے جب تک انھیں کوارٹر ماسٹر سے جو سردار سرجن کا کوئی کام نکال دینے کا موقع نہ مل جاتا، اور اس کے بدلے میں ان کے دوست اسٹور سے انھیں کچھ کپڑا نہ لا دیتے۔ عام طور سے بابی اور سرجن سنگھ، کوارٹر ماسٹر کلارک چتر سنگھ کے خلاف مشترکہ محاذ بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ مگر اب بابی کو موقع نکالنے میں مہینوں لگ جاتے اور ہم روتے اور اماں کی جان کھاتے۔ وہ کچھ منت ملامت کرنے کے بعد اپنے بکس سے کوئی رنگین کپڑا نکال لاتیں اور ہمارے لیے کچھ نئی قمیصیں اور شلواریں

بنا دیتیں۔ گھر میں پہننے کے لیے تو خیر یہ ٹھیک تھا مگر ہم یہ چاہتے تھے کہ باہر کے لیے درزی کے سلے ہوئے فیشن ایبل کپڑے ہوں۔ اور ظاہر ہے اماں کی کیا قوت ڈالی سو بھلا وہ اس بزازی سے کوسوں دور تھی جو گرم کوٹ کو اپنی مشین پر سی کر اس کی شکل و صورت نکال سکے۔

تو ہم بچتے اور انتظار کرتے اور ضد کرتے یہاں تک کہ ابا جی کو موقع مل جاتا اور وہ سرحدی بستی کا کوئی کام نکال دیتے اور اس کے بدلے میں کوارٹر ماسٹر کے حوالدار ہم لوگوں کو کچھ سوتی زین یا سرج دے دیتے۔ اب ہم کو انتظار کرنا پڑتا کہ رجمنٹ کے ٹیلر ماسٹر رمضان بھائی یا جی کو خوش کرنے اور ان سے اپنا کام نکلوانے کی ضرورت محسوس کریں اور ہم لوگوں کے لیے ایک ایک جوڑی کپڑے مفت سی دیں۔ رمضان ہم لوگوں کی ناپ تو خوب اچھی طرح لے لیتے۔ اس لیے کہ ابا جی کیا ہم لوگوں کو جانتے تھے۔ بڑے ابا کی شرط ضروری اتنا تو کرنا ہی ہوتا تھا۔ لیکن ایسے ملک میں ہی جہاں مراعات کر کے عوض میں چکائی جاتی ہے۔ کسی کاریگر کے پاس اتنا وقت کہاں سے فالتو ہو سکتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کپڑے بے جگہ مروا دے اسے سپاہیوں کی وردی سینے کی تو عادت تھی اور جگہ وہ سپاہیوں کے خیمہ وغیرہ کے کپڑے سی کر اوپر سے پیسے بنا سکتا تھا اور جگہ ویسے ہی اس کے پاس اتنا کام پڑا تھا کہ اسے نمٹاتے نمٹاتے ٹیلر ماسٹر کی بے دنیاں بجھ گئی تھیں۔

جنتوں گلیشیئر اور میں جا کے رمضان چاچا سے تقاضے کرتے بہانہ ہم لوگوں کو اپنی محبت اور جی کا یقین دلانے کے لیے ہم سے اپنی سوئی میں دھاگا ڈلواتے لیکن ہمارے سوالات اور ہماری منت سماجت ان کی اور

کہا تھا اور وہ ضرور، اتنا لمبا تڑنگا ہوگیا کہ ہمارا بڑا بھائی لگنے لگا۔

کھانے ہی کی طرح کپڑوں کا بھی حال تھا۔ باجی کا رویہ سادگی پسندگی کا تھا کہ اپنی کفایت شعاری کو وہ اسی نام سے یاد کرتے تھے اور ہر وقت روپیہ بچانے کی فکر رہتی تھی۔ ہرپرش کی شادی پر تو انھوں نے ہم لوگوں کے لیے کپڑے خریدے تھے۔ اس کے علاوہ جو لدا، سرجین سنگھ لئے یا خاکی ڈریس کے جو ٹکڑے کوارٹر ماسٹر کے اسٹور سے "لاپتہ" دکھانے میں کامیاب ہوجاتے ان سے اماں ہمارے لیے اس نئی سنگر مشین پر، جو سو بیاد آگرہ کا شگن ان کے لیے ولایت سے لائے تھے، جہاں وہ جا، رنج بیچ کے ایڈی کانگ ہوکر گئے تھے انھیں شمار کرتیں۔ ہمارے کپڑے جان بوجھ کر خوب ڈھیلے ڈھالے بنائے جاتے۔ لیکن ہم بڑھ رہے تھے اور یہ کپڑے یا تو چھوٹے ہوجاتے تھے یا پھر بجنٹ کے دھوبی پھاڑ لاتے تھے جن کی دھلائی کا فن یہ تھا کہ پتھر پر پٹک پٹک کر دھوتے تھے۔ جب ہم نئے کپڑوں کی ضد کرتے تو باجی اس وقت تک "ٹالتے رہتے جب تک انھیں کوارٹر ماسٹر سے جو لدا سرجین کا کوئی کام نکال دینے کا موقع نہ مل جاتا، اور اس کے بدلے میں ان کے دوست اسٹور سے انھیں کچھ کپڑا نہ لا دیتے۔ عام طور سے باجی اور سرجین سنگھ، کوارٹر ماسٹر کے کلرک چتر سنگھ کے خلاف مشترکہ محاذ بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ مگر اب باجی کو موقع نکالنے میں جتنی دیر لگ جاتے اور ہم روتے اور اماں کی جان کھاتے۔ وہ کچھ دن ملامت کرنے کے بعد اپنے بکس سے کوئی رنگا، کرتا یا کپڑا نکال لاتیں اور ہمارے لیے کچھ نئی قمیصیں اور شلواریں

بنا دیتیں۔ گھر میں پہننے کے لیے تو خیر یہ ٹھیک تھا مگر ہم یہ چاہتے تھے کہ باہر پہنے
جانے کے لیے سلے ہوئے فیشن ایبل کپڑے ہوں۔ اور ظاہر ہے اماں کی کیا فرنٹ ڈالی
سمجھ بوجھ اس بات سے کوسوں دور تھی جو گرم کوٹ کو اپنی مشین پر سی کر اس
کی شکل و صورت نکال سکے۔

تو ہم بلکتے، اور اصرار کرتے اور ضد کرتے یہاں تک کہ ابا جی کو موقع مل جاتا اور
وہ ہمارے مسئلے کا کوئی کام نکال دیتے اور اس کے بدلے میں کوئی درزی ماسٹر کے حوالے۔ ہم
لوگوں کو کچھ سوتی نہیں یا سرج دے دیتے۔ اب ہم کو انتظار کرنا پڑتا تاکہ جنٹس کے
ٹیلر ماسٹر رمضان جائے یا جی کو خوش کرنے اور ان سے اپنا کام نکلوانے کی ضرورت
محسوس کریں اور ہم لوگوں کے لیے ایک ایک جوڑی کپڑے مفت سی دیں۔ رمضان
ہم لوگوں کی ناپ تو خوب اچھی طرح لے لیتے۔ اس لیے کہ ابا جی ہم لوگوں کو جلتے
تھے۔ بڑے بابو کی خوشامد ضروری اتنا تو کرنا ہی ہوتا تھا۔ لیکن ایسے ملک میں بھی
جہاں مراعات کر کے مزدوری چکائی جاتی ہے۔ کسی کاریگر کے پاس اتنا وقت
کہاں سے فالتو ہو سکتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کپڑے سیے جبکہ سرکار سے اسے
سپاہیوں کی وردی سینے کی تنخواہ ملتی تھی اور جبکہ وہ سپاہیوں کے غیر فوجی کپڑے
سی کر اوپر سے پیسے بنا سکتا تھا اور جبکہ ویسے بھی اس کے پاس اتنا کام پڑا
تھا کہ اسے نمٹاتے نمٹاتے ٹیلر ماسٹر کی بھویں بگڑ گئی تھیں۔

ہفتوں گنتیں اور بیچ جا کے رمضان چاچا سے تقاضے کرتے۔ ٹیلر ماسٹر
ہم لوگوں کو اپنی محبت اور نیکی کا یقین دلانے کے لیے ہم سے اپنی سوئی میں
دھاگا ڈلواتے۔ لیکن ہمارے سوالات اور ہماری منت سماجت ان کی اور

ان کے کارخانوں کی مشینوں کے شور میں گم ہو جاتے۔ البتہ جب رمضان کا چاند دفتر میں رک جاتا اور اس کی ضرورت پڑتی کہ جلدی ہی کرانے کے لیے ، بی ایم جی صاحب سے سفارش کر دیں ، تب ٹیلر ماسٹر ہم لوگوں کے کپڑوں کو ہاتھ لگاتے۔ ایسی جلدی میں جب کپڑے کاٹے جاتے تو ان میں وہ تراش اور چھین کہیں بھی نہ ہوتی جس کی ہم آس لگائے رہتے تھے۔ انگریزی اور ہندوستانی وضع کا ملا جلا میل ہوتا۔ کوٹ کی لمبائی تو تا۔ نورفوک جیکٹ کی سی ہوتی لیکن گلا ہندوستانی کوٹ کی طرح بند ہوتا۔ میں چڑ کے رہ جاتا، اس لیے کہ انگریزیت کی ساری آرزو مٹی میں مل جاتی اور بے ڈھنگے ڈیزائن کے یہ کپڑے پہنائے جاتے۔

یہی قصہ جوتوں کا بھی تھا۔ حالانکہ اس میں ایک اور خرابی بھی پیدا ہو جاتی۔ بابا جی کو ظاہر ہے کہ اپنے نمبر یا سرجن سنگھ سے فوجی بوٹ، یا معمولی ہندوستانی جوتے ہم لوگوں کو تو دلا نہ سکتے تھے جیسے کہ وہ خود لیتے تھے، اس لیے کہ فوجی ہوتے۔ بگل بجانے والے رنگروں کے بھی جاتے پاؤں سے بہت بڑے ہوتے تھے۔ رجمنٹ کا بڈھا موچی سوداگر اپنا وعدہ کبھی وقت پر نہ پورا کرتا۔ سال بھر پہلے اس نے انگریزی وضع کے جوتوں کے لیے ہم لوگوں سے پاؤں کی ناپ لی تھی۔

گیش تو پہلے ہی بجھ گیا تھا کہ کوشش بیکار ہے، لیکن میں روز سوداگر کے پاس جاکر تقاضا کرتا۔ وہ انگریز افسروں کے گیش اور فل بوٹوں سے جوجھتے ہوتے، وہ اپنی عینک چڑھاکے اور اپنے ڈاڑھی دار جہاندیدہ چہرے پر فکر کے آثار طاری کرکے ناپ کی تلاش کرتے اور کچھ دیر بعد کہتے کہ ناپ

ڈھکوگی۔ پھر سے میری ناپ لیتے اور کہتے کل آکے دیکھ جانا۔ تمہارا ہی
کام کروں گا۔ اور دوسرے دن جب میں جاتا تو پھر یہی یا ایسا ہی کوئی
بہانہ کرتے اور مجھے بہلانے کے لیے چھوٹا سا جوتا بنا دیتے۔ اور اگلے دن
وہ اپنا کام نمٹانے میں جٹے ہوتے تو مجھے ان پہاڑی جانوروں کی باتیں
بتاتے جن کی کھال کو کما کر اس سے ایسے حیرت انگیز جوتے بنائے جاسکتے
تھے کہ انھیں پہننے والا امر ہو جائے۔ وہ بتاتے کہ انھوں نے سانپ اور
مینڈکوں کا اچار ڈالا ہے اور اسی طرح کی عجیب وغریب باتیں سنا کر
مجھے اگلے دن پر ٹال دیتے۔

ہمیشہ ہم پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں پھرا کرتے اس لیے کہ پرا-
نے جوتے چھوٹے ہو چکے ہوتے اور گنیش کہتا کہ اگر ہم لوگ کچھ دن اور اسی طرح
پھرتے رہے تو جلد ہی ہمارے پاؤں اتنے بڑے ہو جائیں گے کہ ہم لوگ فوجی
بوٹ پہن سکیں گے۔ لیکن سورج دوپہر تک میں زمین کو ایسا بنا دیتا تھا کہ
جلتے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے اور بوائی پھٹتی۔

لیکن اتنے میں پاس کے ایک گاؤں سے ایک موچی آگیا جس نے
رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر سے بارکوں کے باہر چبوترے پر بیٹھنے کی اجازت
لے لی تھی اور ابا نے اس کو اجازت دلانے میں مدد دی تھی۔ اس احسان
کے بدلے میں اس موچی نے گنیش کی اور میری ناپ پشاوری وضع کے زری
کے جوتوں کی لی۔ مگر اس بیچارے کو لائسنس بھی خریدنا تھا اور اپنا پیٹ
بھی پالنا تھا اور کام بس سڑک پر آنے جانے والوں کا ہی ملتا تھا۔ چنانچہ

بالٹ جوتے کافی دنوں میں تیار ہوئے۔

اسکول سے لوٹتے وقت روز ہم اس سے پوچھتے کہ وہ بالٹ جوتے کب شروع کرے گا اور ایک سست خوام دنیا کے دوسرے کاہل کاریگروں کی طرح وہ کل کا وعدہ کرتا۔ لیکن غریب دیہاتی موچی اتنے پیسے بھی نہ بچا پاتا کہ ضروری اوزار خرید لاتا۔ اس لیے کہ سستے داموں جوتوں کی مرمت کرکے وہ کم ہی کما پاتا تھا پھر بھی روز سہ پہر کو ہم اس کی دکان پر پہنچ جاتے نہ صرف اس وعدے کے بدلے جو اس نے اپنی ضرورت کے وقت ابی سے کیا تھا بلکہ ہمیں یہ دل خوش کن امید بھی ہوتی کہ وہ ہمیں اچھے انگریزی جوتے بنائے گا، اس لیے کہ جب یہ ہوتا تو اس نے ہمیں بہلانے اور بالٹ تقاضوں سے بچنے کیلیے یہی کہنا شروع کر دیا تھا۔

آخرکار جب وہ ہمیشہ وعدے کرتے کرتے اکتا گیا اور اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہونے کہ وہ نئے جوتے بنانے کے لیے سارے ساز و سامان خرید سکتا تو وہ ساری جھنجھٹ ہی چھوڑ کر شہر چلا گیا اور وہیں وضع کے دو جوڑی سستے جوتے خرید لایا اور اس طرح اس بابو کے بیٹوں کی مانگ پوری کر دی جس کے کہنے سے اسے چبوترے پر بیٹھنے اور اپنی روزی کمانے کی اجازت ملی تھی اور جس کے کہنے پر اسے نکالا بھی جا سکتا تھا۔ لیکن جب جوتے ہمارے گھر لائے گئے اور ہم نے وہ جوڑی بھدے دیسی جوتے دیکھے تو ہم رونے لگے اور ہم نے انہیں پہننے سے بھی انکار کر دیا۔ بابوجی کو بہرحال یہ احساس تھا کہ اب وہ دونوں باتیں تو نہیں کر سکتے کہ رشوت بھی لیں اور پھر اپنے بچوں کی پسند کو بھی سامنے رکھیں، جیسا کہ زیادہ تر رشوت لینے والے کرتے، انہوں نے ڈانٹ کر ہمیں اپنے غصے سے سہما دیا۔

جو کہ ان کی شیر جیسی گرج سے ظاہر ہو رہا تھا اور ہم کو بھگتنا پڑا۔ جوتے ذرا اچھے نکلے اور ہم کئی دن تک گھر ہی رہے۔ روتے سنسناتے پھرے یہاں تک کہ مجھے ایک چانٹے اور گنیش کو ایک خاصی کھنچائی نے چپ کرا دیا۔

ہم چھالوں کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ ہمارے پاؤں سوجنے لگے۔ تب جاکے جوتوں کو شہر لے جاکے بڑا کروایا گیا اور اس کے دام بابی کو اپنی گرہ سے دینے پڑے۔ واپس کے جب آئے تو پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔ اور پھر ان میں تیل بھی بھرا گیا۔ انہیں نرم کرنے کے لئے گو ہم اپنے پاؤں کے چھالوں اور دل کے پھپھولوں کو بھول گئے اور پھر کچھ دنوں میں عادت پڑ گئی تو تلخی اور جھنجلاہٹ بالکل ہی جاتی رہی۔

لیکن ہمارے گھر کی زندگی کا چین سکون ہمیشہ ہی خطرے میں رہتا جب ہمارے ماں باپ اور باہر کی دنیا میں، یا والدین اور ہم بچوں میں کوئی جھگڑا نہ ہوتا تو ہمارے اپنے جھگڑوں سے سارا گھر گونجتا رہتا۔ سارے گھر میں ہماری چیخ پکار اور گالم گلوچ سے آگ لگی رہتی۔ اس لئے گنیش کی اور میری چپقلش بڑھ کر اب کھلم کھلا دشمنی تک پہنچ گئی تھی۔

گنیش اور میں دو مختلف [illegible] تھے۔ میں مانتا ہوں کہ قصور زیادہ تر میرا ہی ہوتا تھا۔ اپنے اندر کے پیار، بچاؤ کو چھپانے اور دبانے کے لئے میں بڑا خود رائے اور خود سر ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں ضدی اور آزاد

ضرور، جھگڑالو اور منہ پھٹ بنتا جا رہا تھا، جیسے وہ دوسروں کو نیچا دکھانے اور اترانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔

اماں کے لاڈ پیار نے اسے اور بڑھاوا دیا تھا۔ وہ میری بچکانہ خیال آرائیوں اور چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر اتنا فخر محسوس کرتیں کہ انہیں میری زیادہ تر حرکتوں میں پہنچے ہوئے لوگوں کی سی روحانیت نظر آنے لگی۔ قدرتی بات ہے کہ گنگیش میں حسد بچپن ہی سے بہت بڑھ گیا تھا۔

مثلاً جب میں نے ایک پیڑ کی دو شاخوں میں ڈال سے چڑیوں کو رکھنے کے لیے نیسٹ بنائی تو اماں نے کہا کہ گنگو ان سے مجھ سے زیادہ جھگڑا کرتا ہے جس سے گنگشو صاحب نے مجھے زخمی کیا تھا تاکہ میں اس سے بدلہ لے سکوں۔

میں گرمیوں کی دوپہر کے سناٹے میں چپکے سے بیٹھک سے نکل آتا اور اپنے لیے برآمدے کے ایک کونے میں صاحب لوگوں کے بنگلوں کی طرح کا ایک بنگلہ بنانے لگا۔ بیچ میں ایک ٹوٹی کرسی رکھ کر اور ادھر ادھر ڈانٹ دے کر لیڈ لائٹ اور کمپنی کے کیلنڈر لگا کر میں ماحول بھی ویسا ہی بنا لیتا۔ اور بات کھلتی تو پھر مجھے کوئی وجہ اس کی نہ نظر آتی کہ برآمدے میں جو کوٹھی کا پرانا بکس رکھا ہے اسے پاخانہ کیوں نہ بنا لیا جائے حالانکہ اس میں کموڈ نہ تھا۔ میں اس انگریزی طرز کے گھر بنانے میں لگ جاتا اور یہ سوچتا کہ اگر دو چار دن محنت کرکے اور ذرا سوچ کے کام کیا جائے تو اچھا خاصا خوبصورت تیار ہو جائے۔

اپنے جی سے سوچے ہوئے انوکھے گھروندے تیار کرنے کی خوشی کو گرمی اور پسینہ بھی کم نہ کر سکتے تھے، حالانکہ اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ گنگیش

تک اپنی ٹانگیں اڑانے لگے گا اور سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

مجھے چھپ کے کھیلنے میں مزا آتا تھا خاص طور سے اس لیے کہ میں کھیلتے میں ایک ساتھی سے بات بھی کرتا جاتا۔ یعنی اپنے ساتھ کھیلنے والی ایک لڑکی کا تصور کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک بار میں نے اپنی ماں کو کسی سے بات کرتے سنا تھا کہ میں بڑا ہو کر ضرور کسی میم سے شادی کروں گا، اور اتنی سی بات پر میں نے اتنی خوبصورت خیالی دنیا بنا لی تھی جس کی صاحب لوگوں کی زندگی کے علاوہ اور کی بنیاد پر بنائی ہوئی تھی۔ "ہیلو" میں بولتا۔ اس وقت تک مجھے انگریزی کا بس یہی ایک لفظ آتا تھا، اور اس کے بعد اپنے ساتھی سے بات کرنے لگتا۔ "شش شش، شش شش، شش....." کہ میرے خیال میں انگریزی بول چال ایسی ہی تھی۔ میں دالان بھر میں اسے ڈانٹتا، اور جب وہ رونے لگتی تو اس کے سنہرے بالوں کو پیار کرتا اور اس کے گالوں کو خوب چومتا..... ایک دن ماں نے مجھے یہیں کھیلتے پکڑ لیا اور غیب کے اعتقادات میں ان پڑھ لوگوں کے اعتقاد کے ساتھ وہ سوچنے لگیں کہ میں صرف خیال چلا رہا ہوں یا میں نے واقعی کچھ دیکھا تھا جس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس لیے کہ اگر واقعی مجھ میں ایسی چیزوں کو دیکھنے کی شکتی تھی جو دوسروں کو نظر نہ آتی تھی تو میں ضرور کوئی پہنچی ہوئی آتما ہوں جس نے ان کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ممکن ہے میں کرشن بھگوان ہی ہوں اور اپنی گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہوں! لیکن گنیش نے میرے دیوتا بننے میں کھنڈت ڈال دی اور اس نے دعویٰ کیا کہ ایسی کچھ خصوصیات تو اس میں بھی ہیں اور جب ماں نے میری شرارتی حرکتوں کا ذکر باپو سے کیا تو وہ حقارت کے ساتھ مسکرا دیے۔

مجھ میں چھپے ہوئے نسبی سوء مزاج سے قطع نظر، جس کے موڈ کو وہ روحانی کرشمے بتایا کرتی تھیں، میری اماں اپنے لاڈ پیار میں اولاد کی طرف سے وہ قدرتی رویہ رکھتیں جو انھوں نے اپنے کسان پرکھوں سے ورثے میں پایا تھا۔ وہ خود بھی قدرت کا ایک مظہر تھیں۔ "عزت" سے شادی کرکے انھوں نے اور بھی رکھ رکھاؤ کچھ یوں ہی سا اپنایا تھا، چنانچہ انھوں نے ہمیں دھول مٹی میں اولین مخلوقات کی طرح بغیر کسی خاص مدد کے پلنے بڑھنے دیا۔ بس کبھی کبھی اس پر ٹوکتیں کہ اچھوت اور نیچ بچوں کے ساتھ نہ کھیلو۔ تو جب وہ مجھے بہت ہی شیطانی، تباہ کن اور باغیانہ موڈ میں دیکھتیں تو وہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کرتیں اس لیے کہ انھیں میری ہٹ دھرمی میں کردار کی پختگی اور مضبوطی کے آثار نظر آتے میرے بچپنے ہی میں آئندہ کی خوش مزاجی اور آسانی سے زندگی کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور میری بے انتہا خوش مزاجی میں جیا ماتاؤں کا وردان نظر آتا جس نے ان کی اپنی زندگی کی اداسی کا بدلہ چکا دیا تھا۔

جب سے میں توتے کی طرح رٹ کے صاف صاف چیزیں بتا دیا کرتا تھا جس سے گنیش نے میری برتری کو اس حد تک تسلیم کر لیا تھا کہ میرا حافظہ اچھا ہے۔ اب جو اماں میری اہمیت کو اس طرح بڑھاتیں تو میں جھڑپ میں آ کے اس کو طرح طرح سے دق کرتا اور اس سے جھگڑا کرتا۔ میں یہ جانتا تھا کہ اگر اماں اور باپو کی عدالت عالیہ میں جھگڑا پیش کرنے کی نوبت آئی تو اپنی خراب صحت کی وجہ سے میں سستا ہی چھوٹ جاؤں گا۔

میں نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ اپنے بھائی کو غصہ دلانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اس کی کسی چیز کو ہتھیا لیا جائے۔

گنیش چیزیں حاصل کرنے کی فکر میں رہتا اور اپنی چیزوں کو بہت سنبھال کر استعمال کرتا۔ چنانچہ اس کے پاس ڈھیر کی ڈھیر کاپیاں، لال نیلی پنسلیں، فائل باندھنے والا فیتہ، کارک کے قلم، نبیں وغیرہ جمع ہو گئی تھیں۔ یہ سب چیزیں اپا جی سے ملی تھیں۔ وہ اپنے دفتر میں اسٹیشنری کے انچارج تھے۔ اپنے حصے کی چیزیں تو میں رکھتے رکھتے گنوا دیتا، گویا صرف اس لیے کہ بعد کو اپنے بھائی کے خزانے پر دانت لگاؤں۔

ایک دن جب گنیش دوپہر کو کہیں چلا گیا تو میں نے بیٹھک میں ایک بکس کے پیچھے اس کا خزانہ کھوج نکالا۔ میں نے اس کو اتھل پتھل کرنے کے بعد دو بہترین لال پنسلیں اور دو نیلی پنسلیں، ایک کاپی اور کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں نکالیں۔

اور پھر اس کاپی میں انھیں پنسلوں سے میں نے لکھنا شروع کیا۔ میں اپنی لمبی چوڑی بچگانہ تحریر میں ایک ایک حرف اتنا بڑا لکھتا کہ پورا صفحہ بھر جائے اور پھر آمنے سامنے کے دو صفحوں پر عجیب غریب ڈیزائن بناتا۔

میں ہتھیلی پر اپنا سر ٹکائے اپنے کارنامے کو بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی کہنہ مشق فنکار اپنی تصویر کو مکمل کرنے کے بعد اس سے ذرا دور ہٹ کر اس کو جانچتا پرکھتا ہے، کہ اچانک گنیش آ دھمکا۔ اپنی پنسلوں اور کاپی کو پہچان کر وہ اپنے اس مخصوص غصے کے

حالانکہ مجھ پر ٹوٹ پڑا جس سے وہ اپنی چھپی اور صابر و شاکر طبیعت کو یکبارگی ایک طرف رکھ دیا کرتا تھا۔

"آخر بات کیا ہے؟ تم لوگ کیوں لڑ مر رہے ہو؟" اماں رسوئی سے چلائیں۔

"دیکھو اماں، اس نے کیا کر دیا ہے!" گنیش نے چلا کے کہا۔ میری نازیبا حرکت پر اس کا خون کھول رہا تھا۔

شیو نے جو مجھے پٹتے دیکھا تو رونے لگا، حالانکہ پٹ میں ہی رہا تھا۔ اس لیے کہ گنیش تو پاؤں اور کہنیاں چلا رہا تھا، لیکن میں جٹ کے بھی بھڑ رہا تھا، نوچ کھسوٹ بھی رہا تھا اور کاٹ بھی رہا تھا۔

آخر اماں دوڑتی ہوئی ہم لوگوں کو چھڑانے آئیں۔

"دیکھو اماں!" گنیش نے اماں کو آتے دیکھ کر ایک طرف کو ہٹ کے کہا، اپنے بے قصور ہونے کی وجہ سے اور رنج و غصے سے اس کا چہرہ اینٹھ کے رہ گیا تھا۔

اماں نے اسے کوسا۔ "حرام خور! کیا کر دیا اس نے جو تو ایسی آفت مچا رہا ہے؟"

"اس نے میری پنسل چرائی ہے اور میری کاپی ساری خراب کر کے رکھ دی۔" گنیش نے جواب دیا۔

"میں اس بھوندو کی تصویر بنا رہا تھا، دیکھو اس کے لمبے لمبے کان!" میں نے کہا۔

میری اماں نے تصویروں کو دیکھا اور بس اتنا ہی کہا:

"بیٹے، اپنے بھائی کا مذاق نہیں کرتے اور ویسے اس حوا عورت کی پنسلیں میں تیرے لیے اور منگوا دوں گی۔"

"دیکھو اماں، یہ تمھاری تصویر ہے اور یہ ہیں باجی۔" میں نے بڑے بڑے کارٹونوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھوں تو۔" اماں نے کہا، اور تصویر تو کوئی ان کی سمجھ میں آئی نہیں مگر انھوں نے میرا دل بڑھانے کے لیے کہا۔

"بہت اچھی ہیں۔ تیرے باجی شام کو آئیں تو انھیں دکھانا۔"

اماں نے جو پنسلیں منگوا دینے کو کہا تو میں نے اپنا آرٹ کا سامان ٹھیک کر دیا۔ مگر اب کاپی تو غارت ہو چکی تھی۔

شاید کمبخت کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ قصور میرا ہو جب بھی قہر خداوندی اس پر نازل ہو۔ جبھی تو شام کو اس نے باجی سے شکایت کی کہ میں نے اس کی کاپی خراب کر دی ہے۔ باجی نے ہم دونوں کو برابر کی ڈانٹ بتائی۔

"سور کے بچو، اگر تم نے لڑنا جھگڑنا نہ چھوڑا تو دونوں کی زبان توڑ کے رکھ دوں گا۔ بیٹے دفتر میں میرے بے حسیتی کم ہے جو گھر آتے ہی سر پہ سوار ہو کر کھانے لگتے ہیں؟ جان ضیق میں ڈال رکھی ہے کمبختوں نے۔ ان سب کا پیٹ پالنے کے لیے تو میں مرا جا رہا ہوں، اور انعام اس کا مجھے یہ ملتا ہے! مادر.....!"

اماں نے احتجاج کیا: "ماں نے کیا بگاڑا ہے جو اس کی درگت بنا رہے ہو؟"

پیدا ہوا اور خود اپنے کو کیوں منحوس کہہ رہے ہو!"

باجی برس پڑے۔ "کمبختوں کو جو چیزیں دی جاتی ہیں وہ بانٹ کے
کیوں نہیں پہنتے۔ مرنے کے بعد میری جائداد پر بھی ایسے ہی لڑیں گے۔ سب کا پتہ
کاٹ کے سارا روپیہ کسی دھرم شالے کو دے جاؤں گا۔ اگر یہ اسی طرح ایک دوسرے
سے جوجھتے رہے اور دل جل کے نہ رہے تو......" پھر ان کا لہجہ دھیما ہو جاتا اور
اپنے آپ پر رحم کرنے کے سے انداز میں کہتے: "ایسی اولاد کے لیے اس کمینی
سرکار کی چاکری کرنے سے کیا فائدہ ہے! اس سب سے بڑے منحوس، پرشو کو
دیکھو! اس کی ناشکری دیکھو!"

اس موضوع پر اماں اور باجی میں مکمل اتفاق رائے تھا اور یہ ذکر
چھڑتے ہی لازمی طور پر ساری کشمکش دور ہو جاتی اور وہ جلد ہی ہماری احمقانہ
لڑائی کو بھول جاتے۔

١٠

شاید ہی کبھی میں کسی بچے کو دیکھتا ہوں اور مجھے یہ خیال نہ ہوتا ہو کہ اس کا
ذہن جانے کن پراسرار راہوں پر یا نہ معلوم کن انتہائی شدید اقدامات کی طرف
بھٹک رہا ہوگا، پتہ نہیں کون سی حیرت انگیز اور انجانی مہم کے بارے میں سوچ
رہا ہوگا، کون بتائے کہ اس کی روح کا رنگ کس انداز سے بدل رہا ہوگا۔ اسی لیے
کہ جب میں اپنے نیم لاشعوری اور نیم شعوری بچپن کے اولین سات برسوں پر نظر
ڈالتا ہوں، تو میں اپنے آپ کو بڑوں کی تنگ اور محدود دنیا کی تمام مصنوعات

کے باوجود، ایک چشمے کی طرح رواں دیکھتا ہوں جو کبھی تو سطح پر پڑنے والی کرنوں سے جگمگا اور متحرک دکھتا ہے۔ کبھی اپنے دکھوں کے مارے اداس اداس نظر آتا ہے؛ لیکن میں اپنے آپ کو ہمیشہ رواں دواں پاتا ہوں، راہ میں بند سے بچتے بندوں اور فصیلوں پر سے اُبلتا ہوا اور کبھی کبھی ان کو توڑ کر گزرتا ہوا، اپنی رو میں بہتا ہوا، سورج کے جلال کا مارا ہوا، سوکھا ہوا، یا بھرا پُرا اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا، لیکن ہمیشہ رواں دواں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے معلوم نہ تھا میں کس راستے پر جا رہا ہوں اور اکثر میں اپنا رخ بدل دیا کرتا تھا، لیکن مجھے خود سے میں اپنے ساتھ کے دوسرے دھاروں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ گویا میں اور میرے اندر کی تخلیقی امنگیں کسی اندرونی مقناطیسی کشش سے ایک دوسرے کی طرف کھنچتی تھیں اور پھر اس بڑے وسیع دریا کی طرف اُمنڈ جاتی تھیں جو پاس ہی بہہ رہا تھا۔

انھیں تخلیقی امنگوں کی اُٹھان میرے لیے ان بے کیف اور گھٹے بندھے دنوں کی تمام محرومیوں کی تلافی بن گئی، جب انسان گزشتہ کے تجربے سے بڑھ کر جینے کی حدوں میں قدم رکھتا ہے۔ چنانچہ جب مجھے میاں میر اور نوشہرہ کی فوجی چھاؤنی کا خیال آتا ہے، تو مجھے نہ صرف اپنے دلی خوابوں اور آرزوؤں کی جلوہ گری دنیا کی بھی بہت سی چیزوں کی دلفریبی یاد آتی ہے۔ اور جن سے جسے جاہل عمر کہا جاتا ہے، ان دنوں کو جگمگا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بچپن کے اولین کھیلوں کا میدان میری زندگی کا سب سے مسرت بھرا حصہ معلوم ہوتا ہے، شاید اس لیے کہ یہی سب سے معصوم اور حساس ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ سرحد کے مناظر کا جلال و جمال میرے حواس اور میرے دل پر کب آئینہ ہوا، لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جب میں سات برس کا ہونے ہی والا تھا، تبھی بعض مناظر اور آوازیں میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئیں اور بعد کے برسوں کی یادوں کی مضبوط بنیاد بن گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی یہ تاثرات اتنے واضح اور روشن ہیں کہ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور آج بھی نوشہرہ چھاؤنی کی دوپہر کی فضا کے اصل خد و خال میرے سامنے آ جاتے ہیں اور میری نگاہوں میں روشنی کے چھوٹے چھوٹے دھنک رنگ ذرات اس طرح گھوم جاتے ہیں جیسے کسی جادو کی لالٹین میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان مناظر کے بٹے بٹے اجزا میرے نزدیک میرے تصور کے اولین خاکوں کی طرح ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوتے۔

دنیا ان دنوں یقیناً بھری پُری اور بہت بڑی تھی، لیکن بچوں کی جانی پہچانی چیزوں کے اس جمِ غفیر میں کچھ چیزیں خاصے کی اور سب سے ممتاز ہیں۔ مثلاً آسمان کے نیچے، وہ تانبے کے رنگ کے اور سرخی مائل بھورے چٹیل پہاڑ جو علاقہ بارکوں کے پرے ندی کے سوکھے پیٹے کے اس پار پھیلے ہوئے تھے، جڑیں تو پاس ہی سے شروع ہو جاتے تھے لیکن جو چکرا دینے والے پیڑ چوٹیوں تک بلند ہوتے تھے جن پر راستے بڑے ڈھلوان تھے اور جو اور جاڑ، جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، کوہستان ہندوکش پر چھائے ہوئے گہرے نیلے گم ہو جاتے تھے۔ ان سرمئی گھاٹیوں کے چھوٹے چھوٹے کھنڈر

میں پتھر کے جھونپڑے تھے جو بھوری پہاڑیوں ہی کا ایک حصہ لگتے تھے، پٹھانوں کے کپڑے، سیاہ رنگ کے، جن کے نیچے دروازوں میں سے کالا کالا دھواں نکلتا رہتا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور دامن کے بیچ میں ہموار زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعوں پر گیہوں یا مکئی کی معمولی فصل ہوتی تھی اور بیچ میں بانس کی گردن اور بھوسی بھری ہیٹ کا بنا ہوا کوا دھکار بچے ڈرایا کرتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ پٹھان ان کو دھکاروں میں ان انگریزوں کی روحوں کو قید کر دیتے تھے جو پچھلی لڑائیوں میں مارے گئے تھے۔

لنڈا ندی کے کنارے کنارے سڑک پر ہر وقت آدمیوں، گدھوں اور اونٹوں کے قافلے گزرا کرتے، جن پر لکڑیاں اور چمڑے، اناج کے بورے، کپڑے کی گانٹھیں لدی ہوتیں۔ ڈھیلی قمیصوں والے ساربان جانوروں کو بڑی بڑی لاٹھیوں سے ہنکاتے جاتے اور اپنے پیچھے دھول کے بادل چھوڑتے جاتے اور پٹھانوں کی جفاکش عورتیں لال شلوار اور سیاہ قمیص پہنے، مردوں پر کڑی نگاہ رکھتیں یا پانی کے گھڑے رکھے، اپنی تیز آنکھوں اور نوکیلی ناکوں کی وجہ سے اپنے مردوں ہی کی سی غضبناک دکھائی دینے والی۔ لیکن اپنے بچوں اور ہم جیسے غیروں پر بھی بڑا پیار کرنے والی۔ مجھے یاد ہے کہ جانے کتنی بار اپنی آوارہ گردی کے دوران میں ان عورتوں نے مجھے روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے اور اچار کھانے کو دیا تھا۔ بوڑھے جو عمر اور محنت کی وجہ سے دوہرے ہو گئے تھے اور بکریاں اور بھیڑیں چرایا کرتے تھے، میرے جگری تھے اس لیے کہ ان سے ڈر لگتا تھا حالانکہ گھر میں مجھے ہمیشہ تاکید کی جاتی تھی

نحو میں چرواہوں کے پاس نہ جایا کروں، اس لیے کہ اگر میں نے ان سے خلاط زیادہ بڑھائی تو کسی نہ کسی دن ضرور مجھے اغوا کر لے جائیں گے۔

ان پہاڑیوں اور پہاڑوں کے اس پار، پشاور سے آگے جہاں میں پیدا ہوا تھا، درۂ خیبر کے ادھر جہاں باجی جا چکے تھے، میرے ان دنوں کے تصور میں کابل کا بادشاہ راج کرتا تھا، جس کی سلطنت افغانستان اور ہمارے درمیان گرانڈ ٹرنک روڈ تھی۔ اس کی سڑک کے ایک سرے پر، ریلوے کے پُل کے سامنے لنڈا ندی کے پار، حوض کی ڈال کے پاس شہری علاقوں کی کیڑوں مکوڑوں کی سی غربت اور بدحالی دوسری ہی دنیا کی غمازی کرتی تھی، جو میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے داغ چھوڑ جانے والی تھی۔

وہیں ایک خالی روندے ہوئے کونے میں، جہاں سے صدر بازار کو ایک پتلی سڑک جاتی تھی، اور دس بیس تانگے کھڑے رہتے تھے۔ اس جگہ گھوڑوں کی لید اور بھوسے کی بو پھیلی رہتی تھی۔ لیکن تانگے والوں اور سواریوں کے قہقہوں، ہنسی مذاق اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور نعلبند کی دکان پر نعلوں کے ٹھُکنے کے شور سے بڑی رونق رہتی تھی۔ نعلبند کی چھوٹی سی دکان کے آگے پار، بیوپاری کی جگہ اقسام کے جانور آتے جاتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے اگر جانے پہچانے چہروں پر تھکن کے ذرا بھی آثار نظر آتے تو تانگے والے بڑھ بڑھ کے باجی کو اپنی طرف کھینچنے لگتے کہ سواری انھیں کو مل جائے، حالانکہ معمول تو یہی کرتے جاتے۔ لیکن باجی مجھے بچا بچاتے ہی ان کی طرف مخاطب ہوتے اور ہم یا تو چہل قدمی کی ورزش کے نام پر پیادہ، امی کچھ خرید و فروخت کے بہانے پیدل

ہی گھر تک آتے حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ ملاقات بازار تک کے کرائے کا خرچ اس سوال کو طے کرنے میں زیادہ دخل رکھتا تھا۔

تو ہم لوگ بازار جاتے اور وہاں پھلوں کی ڈھیریاں لگی دیکھتا، ایک کے اوپر ایک ڈھیریاں لگی ہوئی۔ لال لال سیب، اودے اودے انگوروں کے بیچ گچھے اور چمن کے ہرے انگور، کابل کے سنہری بکھرے ہیں، دلی میں پہلے نظر آتے۔ تازہ ناریل اور سوکھی خوبانیاں، آلو بخارے، انجیر، اخروٹ اور بادام پر نظر پڑتے ہی میرا دل خوشی سے پھولا نہ سماتا! اور میرے دھڑکتے دل کا ساتھ میری گھبراتی زبان بھی دیتی۔ "مجھے یہ چاہیے، میں لوں گا!" اور اگر ابا جی کبھی کوئی چیز میرے کہنے پر لے دیتے تو میں خوشی سے کیسا چلا اٹھتا اور پھر کیسے اسے سارے راستے خود ہی اٹھا کر گھر لے جاتا۔

مجھے بوچڑ خانہ کبھی نہ بھولے گا جہاں کھال اتری ہوئی بھیڑوں کے ڈھیر رسے کے ہک سے لٹکے ہوتے اور ان کے آس پاس مسلمانوں کی بھیڑ لگی ہوتی۔ جانا گھر والا حالانکہ بند تھا مگر اب بھی آغا خانی اسمٰعیلی فرقے کا اس حد تک فائدہ تھا کہ ہم لوگ مسلمان قصاب کا حلال کیا ہوا گوشت ہی لیتے تھے۔ اور چونکہ ہم اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے اس لیے جب گوشت لانا ہوتا تو دفتر کے اردلی کمیشن یا کسی مسلمان جینٹلمین کے ساتھ مجھے ہی بوچڑ خانے بھیجا جاتا اس لیے کہ گوشت میرا اس جانا لگتا تھا۔

اور اسی سلسلے میں مجھے بازار میں کھانوں کی دکانوں، تنوروں کا بھی پتہ چل گیا جہاں گیہوں کے آٹے کی بڑی بڑی نانیں، پلاؤ اور مٹھائیوں کے ڈھیر

لگے ہوتے اور ان سب پر مکھیوں اور تنور کی اڑتی ہوئی راکھ کی تہہ جمی ہوتی مگر پھر بھی کھانوں کی مہک اتنی تیز اور لذیذ ہوتی تھی کہ اب بھی ہندوستان میں کہیں بھی جب کبھی میں اس طرح کی دکانوں کے سامنے سے گزرتا ہوں تو میرے منہ میں پانی آجاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور میری یہ آنکھیں کبھی بند نہ ہوتی تھیں اس لیے کہ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں، ہر چیز — چھوٹی چھوٹی دکانوں میں بیٹھے ہوئے حجام جو پٹھانوں کا سر مونڈتے تھے، ان کا خط بناتے، لب تراشتے یا ناخن کاٹتے تھے، ان کی ڈراؤنی نہنیاں، اس لیے کہ مجھے سڑک کے کنارے کی رنڈیوں کے چہرے بھی اچھی طرح یاد ہیں، گھنگھریالے، رنگے لال کیے ہوئے گال، اور کانوں اور گلے سے لٹکتے ہوئے چاندی کے گہنے، اس لیے کہ مجھے اس وقت بھی خستہ حال کوڑھیوں اور مادرزاد ننگے گندے فقیروں کی کثرت کا احساس تھا جن کے ڈھیلے ڈھالے جسم پیسے پیسے کے لیے جھکتے تھے اور وہ اپنے ہاتھوں اور چہروں کے زخموں پر سے مکھیوں کو اڑاتے جاتے۔

ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور گلیاروں کی غربت اور مفلوک الحالی میں، اور ٹھاٹھ باٹھ والی ان بڑی بڑی پارسی دکانوں میں، جہاں یورپین صاحب لوگ جاتے تھے اور صدر بازار کی ہندو دکانوں میں جہاں سپاہی اور دوسرے صاف ستھرے کھاتے پیتے لوگ خرید و فروخت کرتے تھے، جو تضاد تھا اس نے اپنے امتیازی وجود کی شان و شوکت کا احساس دلایا کہ ہم اعلیٰ نسل کے لوگ ہیں جو اپنی اونچی ذات اور پیسے والے ہونے کی وجہ سے مراعات رکھتے ہیں۔

اور اچھے کام کرنے اور زیادہ اونچی جماعت میں جنم لینے کی خواہش کے تحت ڈنسپ ٹائر اور سنگر سوئنگ مشین اور پیرس سوپ کے اشتہاروں اور جلیٹ بلیڈ کی اور صاحب لوگوں اور بابوؤں کی ساری زندگی کے لوازمات کی پرستش کرتا تھا....

بچپن ہر چیز کو قبول کر لینے کی عمر ہوتی ہے اور میں بھی اس خوشی کو جو سپاہیوں کو دکانیں لوٹ کر ہوتی تھی، چھوٹے سے شہر میں اس طرح چلنے کی خواہش کو جیسے میں اس کا مالک ہوں، مقامی دکانداروں اور اپنے باپ کی علیک سلیک اور پرستش مزاج کے خلوص اور تابناکی کو اور ہم پر چھاؤنی کے صوبائی کے بچوں کی حیثیت سے جو عنایتیں اور تحفے نچھاور کیے جاتے تھے ان کو قبول کر لینے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

لیکن یہ پرمسرت، رنگارنگ، ہنگامہ خیز اور اداس دن زیادہ چلنے والے نہ تھے۔

اس لیے کہ ایک دن بابجی ہم لوگوں کو نٹاندی کے کنارے کشتیوں کے پل کے پاس ایک پکنک میں لے گئے جس کا انتظام ان کے دوستوں نے کیا تھا اور جہاں اماں، گنیش اور شیرو، میں اور بابجی دوپہر کے وقت طرح طرح کی چیزیں کھا رہے تھے اور تازہ و ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو نٹاندی کی سطح کو چھیڑتی ہوئی ہم تک آ رہی تھی۔ اسی وقت جنگل سے ایک چپراسی آگیا، ہانپتا ہوا اور پسینے میں شرابور، اور اس نے بابجی سے کہا

کرنل صاحب نے خان کو اپنے بنگلے پر ابھی بلایا ہے۔

باجی بڑبڑائے۔ "اُف یہ کمبخت سرکار، یہ مجھے اس گرمی میں بھی ایک منٹ چین نہ لینے دے گی! اب اس وقت میری کیا ضرورت آ پڑی ہے؟"

اردلی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "کہتے ہیں باہر جی کو ولایت میں لڑائی چھڑ گئی ہے!"

"کیسی لڑائی؟" باجی نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

"جنگ! جنگ! لڑائی!" سپاہی نے جواب دیا۔

باجی عجیب رنگ کے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے معذرت کی اور اماں سے بولے:

"ہرش کی ماں، تم بچوں کو لے کر گھر چلی جاؤ!" اور خود جلدی جلدی سپاہی کے ساتھ چل دیے۔

اماں ہم سب کو بٹورتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے رخصت ہوتے ہوئے گھر کو چلیں اور بولیں۔ "ہم لوگ تو لُٹ گئے!"

اور ہم لوگ گرد بھری سڑک کے سفید کنارے پر چلتے ہوئے گدھوں کی ریل پیل، اور تانگوں میں سجے ہوئے جھنجھناتے ہوئے گھوڑوں سے بچتے بچاتے بیل گاڑیوں کے چرخ چوں چرخ چوں کرتے ہوئے پہیوں کو دیکھتے ہوئے اور پٹھان قافلے والوں اور ان کی لال لال گالوں والی بیویوں کے جلائے گئے الاؤں سے کتراتے ہوئے، جو یہ لوگ حقے بھرنے کے لیے سلگائے رکھتے تھے، چلے جا رہے تھے کہ ہم نے ڈگی پٹتی سنی: "جنگ! جنگ! جنگ چھڑ گیا۔"

جنگ لڑائی:

اس نے مغرب کے اُفق پر سورج کو ڈوبتے دیکھا اور کہا:

"بالآخر ختم ہونے کا سمے آگیا۔"

اور ول نے اس وقت جو خبر دی، وہی تھی، جب ہم ٹنڈا مری کے کنارے ہوا کھا رہے تھے۔ اس کی تصدیق کرنل صاحب سے کر دی اور دوسرے دن آرمی ہیڈ کوارٹرز سے آرڈر بھی آ گئے۔ ۲۸ ویں ڈوگرا رجمنٹ کے آدھے حصے کو ۱۳ ویں ڈوگرا رجمنٹ سے ملا دیا جائے گا اور وہ لاہور ڈویژن کا حصہ بن کر لام پر جائے گا۔ دوسرا آدھا چترال میں لاقند کے مقام پر تعینات ہوگا، جو صوبہ سرحد میں اور اندر کو ایک فوجی چوکی ہے، تاکہ افغانستان کی طرف سے حملے کے خطرے کی صورت میں سرحد محفوظ رہے۔

ان احکامات کے آتے ہی پوری رجمنٹ پر اداسی چھا گئی اور ہر شخص بے چینی سے اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا کہ معلوم ہو کہ کون کہاں بھیجا جائے گا۔ ان کمپنیوں کو جنہیں محاذ پر جانا تھا ان کمپنیوں سے الگ کرنے میں، جو سرحد کی چوکی پر تعینات ہونے والی تھیں، کافی وقت لگ گیا۔

رجمنٹ کے تقریباً آدھے آدمیوں کو، قدرتی طور پر، پا جال گوٹہ اور دوسری دوائیں کھا کر بخش ہو گئی اور لوگ پڑ گئے تاکہ طبی معائنے میں انہیں لام پر جانے سے معذور قرار دے دیا جائے اور کچھ لوگوں نے تو اپنی تھوڑی بہت زمین جو تھی وہ بھی بیچ دی تاکہ رشوت وغیرہ دے کر لام پر جانے سے بچ جائیں۔

باجی بھی گھبرائے ہوئے تھے اس لیے کہ انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ بابو جیرت سنگھ کو بخار آنے لگا اور دیکھا دیکھی جاٹ گھرانوں کا میل جول بہت بڑھ گیا، جاٹ والدین گردیوں کے گھروں میں دوڑ دوڑ جانے لگے۔ اور ہم بچوں کو دونوں گھروں کے بچوں سے ڈھیر ساری چیزیں ملنے لگیں۔

ایک دن باجی نے اماں کو بتایا کہ "کرنل صاحب ڈپو کے ساتھ تنگ آگئے ہیں: وہ دوسروں میں بیٹھے کھانا کھاتے تھے اور اپنے بارے میں سوچتے تھے اور مجھے وہ بہت مانتے ہیں، تو امید یہ ہے کہ مجھ سے بھی وہ، کچھ کام کہیں گے دوسری طرف میجر کاؤ، اچھین صاحب ڈالی پر جانے کو تیار ہیں اور ہو سکتا ہے وہ کرنل صاحب سے مجھے مانگ لیں....."

لارڈ ارونگ کی شان میں جب گستاخی کی گئی تھی تب تو وہ خفا ہو گئے تھے کہ صاحب لوگ ان سے ناراض نہ ہوں اور اب وہ سنا تھا کہ صاحب لوگ ان کو رضامند کر دیں یا پنشن لے لینے کو کہیں۔

گروش سے نہ کہ "بچارے مرائے ڈاکٹر نہیں مرتے": باجی کی بات تک پریشانی اور خلفشار میں رہے اور جب کہ آرمی ہیڈکوارٹر سے بچتے نکالتے ادھر سے آ گئے تھے وہ سب پہلے انہیں کے ہاتھ آتے تھے، وہ بہت بوکھلائے رہتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک طرف تو وہ خود اور سارے سپاہی اس قدر خوفزدہ ہیں اور دوسری طرف غیر فوجی لوگ بڑے مگن ہیں۔

انھوں نے اماں کو بتایا: "سارے راجے مہاراجے ایک دوسرے

بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات اور دولت سرکار کے حوالے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ آغا خاں نے کہا ہے کہ وہ سب سے پہلے فوج میں بھرتی ہوں گے اور ایک ستر سال کے راجہ نے کہا ہے کہ وہ محاذ پر جا کر لڑنے کو تیار ہے۔ عجیب بات ہے!"

"باجی۔ یہ لڑائی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں یہ بیت تک خبریں بڑی سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

"بیٹا، ولایت میں۔" باجی نے جواب دیا۔

میں نے ایک اور سوال کیا۔ "لڑائی کیوں ہوتی ہے؟"

"بیٹا جرمنی کا قیصر، ترکی کا سلطان اور آسٹریا کا بادشاہ ایک طرف ہیں اور انگریز بادشاہ اور ساری دنیا دوسری طرف۔"

"پھر وہی مہا بھارت کی طرح کورو پانڈو کی لڑائی ہے۔" اماں نے چولھے میں لکڑی سے کوئلے جھاڑتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحے کو رکیں، دھواں لگنے سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے انہیں پونچھا۔ ٹھنڈی سانس لی اور سر ہلا کر کہا، "کیا غضب ہے جو نہیں تباہی ہے! لیکن اگر جیسا کہ لوگ کہتے ہیں وہ آغا خاں صاحب بھی انگریز کے ساتھ ہیں تو انگریز لوگ ضرور جیت جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ تو شری کرشن جی مہاراج کے اوتار ہیں۔"

"ہیں، آغا خاں، گویا خدا ہیں! ...." باجی نے احتجاج کیا۔

اماں نے کہا: "مت کفر کی باتیں کرو۔ کسی کو کیا معلوم کہ آغا خاں کے ہاتھ میں کیسی چمتکار دکھانے والی شکتی ہے۔ اور کون جانے کہ اس لڑائی

کون کون سی ان دیکھی انجانی طاقتیں شامل ہیں......"

میں نے اپنی منطق کے مطابق بحث شروع کی۔ "لیکن اماں پانڈو تو صرف پانچ تھے اور کورو سو تھے۔ اب اگر آغا خاں واقعی کرشن جی کے اوتار ہیں تو پھر انہیں قیصر جرمنی کے ساتھ ہونا چاہیے نہ کہ انگریز بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ۔"

باجی اس دلیل پر مسکرانے لگے۔

"مولانا محمد علی کہتے ہیں۔" گنیش نے بات چیت میں حصہ لینے کی کوشش میں کہنا شروع کیا کہ "ترکوں کا سلطان تیمور لنگ کی طرح ہے اور اس نے دنیا میں اسلام پھیلانے کے لئے جہاد کا اعلان کر دیا ہے......"

باجی نے اس کو ڈانٹا: "رجمنٹ بھر میں افواہیں مت سنتا پھرا کر — صاحب لوگ لڑائی کے زمانے میں افواہوں کے معاملے میں بڑے سخت ہو جاتے ہیں......"

اماں نے فوراً احتجاج کیا۔ "اچھا اچھا، ہر بار جب وہ منہ کھولے تو اسے ڈانٹا کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ سچ ہی بتا رہا ہو۔"

"مت بے وقوفی کی باتیں کرو۔" باجی نے جھنجلا کر کہا۔

"تم جو چاہے کہو۔" اماں نے اپنے مافوق الفطری اعتقاد کی بنیاد پر اپنی بات جاری رکھی۔ "گائے کے سینگ پر دھرتی ڈول رہی ہے۔ سری کرشن جی بہت دنوں تک اپنا نہیں ہاتھ دکھائیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی بھونچال آ جائے، اس لیے کہ پاپ اب شکتی کو دبائے دے رہا ہے۔ یہ سب ان فرنگیوں کا کیا دھرا ہے جنہوں نے یہ اتنی ایجادیں کر لی ہیں۔ اور بھگوان کی برابری کرنے چلے ہیں......"

"تم سڑی ہو" باجی نے کہا۔ "بھگوان سے اس کا کیا مطلب واسطہ؟"

"تم تو کہہ رہے ہی کہ میں سڑی ہوں" اماں نے جواب دیا۔ "لیکن لوگ جب بد نہیں ہوتے تب تک لڑتے نہیں۔ پرقصوں میں پہلے ہی سے لکھا ہے کہ لڑائی ہوگی کلجگ میں کہ جھوٹ کا زور ہوگا اور ایک آگ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور پھر ایک نیا چکر چلے گا اور پھر دنیا میں اچھائی کا بول بالا ہوگا۔"

میں نے باجی سے پوچھا۔ "اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں؟"

"نہیں کاہے، بک رہی ہیں" انھوں نے جواب دیا۔

اماں بولیں۔ "تم تو جب مانو گے جب آگ ہر طرف سے تمھیں گھیر لے گی۔"

ظاہر ہے کہ ان کی پیشین گوئیاں کچھ ٹھیک نہ تھیں، اس لیے کہ باجی کو یہ پروانہ مل گیا کہ وہ سرحد میں ملاکنڈ کے ڈپو پر رہیں گے۔ چونکہ باجی یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ ملازم ہو جاتے، سندھ سے واپس آتے تو ان کی بڑی ترقی ہو جاتی، اس لیے ان کو ذرا مایوسی بھی ہوئی۔ لیکن بظاہر انھیں کسی چیز کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس لیے کہ ان کو اصلی بات معلوم ہو گئی تھی اور اب وہ ہم کی جان پہچان ختم ہو گئی تھی اور وہ ان تیاریوں اور افراتفری میں لگ گئے جو اس واقعے کے نتیجے میں ضروری ہو گئی تھیں۔

مجھے ان بڑے بڑے واقعات کا کچھ اندازہ تو تھا جو دنیا میں رونما ہو رہے تھے لیکن یہ اندازہ ان مختصر کہانیوں کے ذریعے ہوتا تھا جن میں ان واقعات کو اماں پیش کیا کرتی تھیں۔ ورنہ تو ہم آنکھیں پھاڑے بچے ٹرین کی نقل و حرکت، اپنے گھر میں سامان کی بندھائی وغیرہ اور پھیلاتی ہوئی دھوپ

دیکھا کرتے ہوا ایسے وقت میں ہر شخص پر پستی ہوئی دکھائی دیتی تھی جب ہر شخص
دہانا تک رہا تھا اور ہماری بے شعور خوفزدہ روحیں اداس تھیں اور چہرے
مرجھائے ہوئے تھے۔ اس ساری کوفت میں خوشی کی ایک امید بھی تھی، ہم خوش
تھے کہ امرتسر میں اپنا گھر دیکھیں گے جہاں ہم لوگ اپنی ماں کے ساتھ رہیں گے،
اور اسکول جایا کریں گے۔ مجھے اپنی عمر کے ساتھیوں کے لیے بڑی تڑپ تھی۔
اور میں سوچا کرتا کہ میں ایک رنگ برنگی نئی دنیا میں جاؤں گا جہاں دیدی کو بھی
بھیجیں گی اور بے تاب چاچا، جنہوں نے مجھے گوشت کھانے کی عادت ڈالی تھی
اور جہاں ہمارا گھر تھا۔ اور دل ہی دل میں میں امرتسر کے عجیب و غریب شہر
کے شاندار نقوش کو ترتیب دیا کرتا۔ امید کی خوشی اور اپنے آگے آنے والے
نئے عظیم و وسیع اور شاندار وقتوں اور چیزوں کے شوق میں سرشار رہتا۔

938